بانو

سالنامہ

نئی دہلی

www.taemeernews.com

انتظار

تنہائی

(تصویر: ٹی۔ نریندر پال سنگھ)

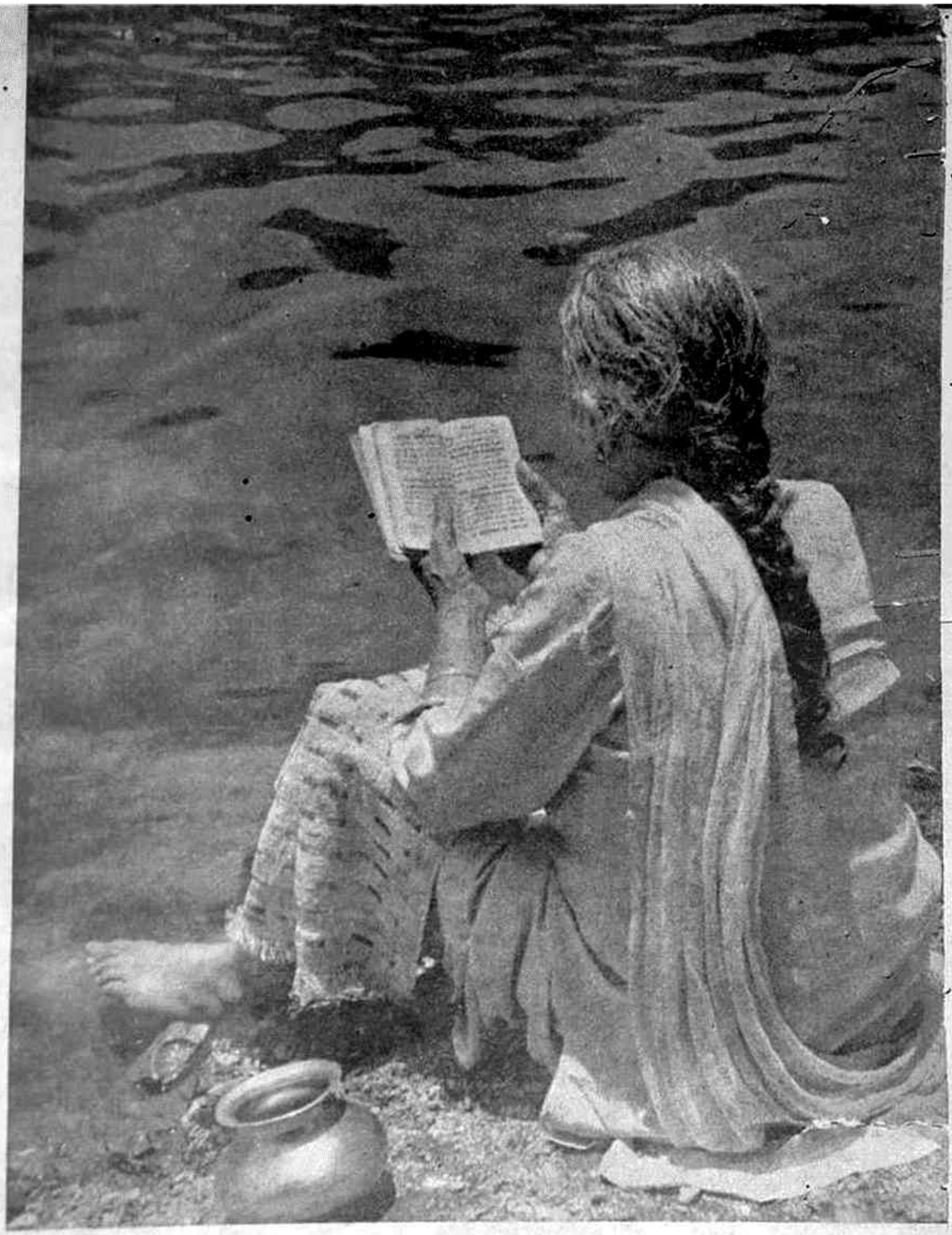

تصاویر: بھاشن ورما

بڑھاپے کی عبادت

www.taemeernews.com

(تصویر بائی زیندر پال سنگھ)

www.taemeernews.com

اشاعت کا چودھواں (۱۴) سال

پہلا شمارہ

سال نامہ

شمع

نئی دہلی

نگراں : یوسف دہلوی

مدیرہ : زینت کوثر دہلوی

حسن کار : ایس، اے، صدیقی

عام شمارے کی قیمت : ۶۲ نئے پیسے

سالانہ قیمت : (جس میں سال نامہ بھی ملتا ہے) سات روپے

اس سال نامہ کی قیمت :

دو روپے پچاس نئے پیسے

شمع کے ادارے سے

صدر دفاتر : آصف علی روڈ، نئی دہلی۔ ٹیلی فون: ۲۶۰۶۶، ۲۶۰۶۷، ۲۶۰۶۸، ۲۶۰۶۹ (۲۰ اضافتیں) تار کا پتہ : شمع نئی دہلی ایجنسی : اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ ٹیلی فون: ۲۳۲۷۰

شاخ : پھاٹک حبش خاں، دہلی۔ ٹیلی فون: ۲۴۸۸۷ دیگر دفاتر : بمبئی، کلکتہ، مدراس اور لندن

طابع و ناشر : یوسف دہلوی مطبوعہ : امپرین پرنٹنگ ورکس نئی دہلی ٹائیٹل مطبوعہ : لیبل آرٹ پریس، دہلی

بلا اجازت نقل یا ترجمہ کی اجازت نہیں ہے۔ کاپی رائٹ محفوظ۔

www.taemeernews.com

"بانو" کے سال نامہ

کرشن چندر	ایک خط ایک گیت	۱۵
منور مادیوان	فرح دیبا۔ ایک سندر یلا کی شادی	۱۸
حامد اللہ افسر	سفید بال	۲۷
علی عباس حسینی	خزاں میں بہار	۲۸
عصمت چغتائی	بہترین دوست	۳۵
نریش کمار شاد	ہفت رنگ	۳۹
م، م، راجندر	آدابِ حسن، آدابِ محفل	۴۰
پرکاش چندر جین	اندرا گاندھی	۴۲
ظفر پیامی	سولہ سنگار	۴۵
سراج انور	اللہ نے ملائی جوڑی	۵۰
سلام مچھلی شہری	چار سنزلیں	۵۳
بلونت سنگھ	ایک بھیگی شام	۵۴
شاہدہ سعید	عورتیں بناؤ سنگار کیوں کرتی ہیں	۶۳
غلام احمد فرقت	شاہی دور کے باورچی خانے	۶۷
شفیق فاطمہ شعریٰ	واپسی	۷۰
صالحہ عابد حسین	سماج کی اصلاح خود کیجئے	۷۳
جہاں آرا	ہم نے بھی نوکر رکھا	۷۹
عادل رشید	دو کہانیاں	۸۳
عشرت رحمانی	جنگ آزادی کی پراسرار سبز پوش مجاہدہ	۸۷
اقبال فرحت اعجازی	بڑی بی کی ڈائری	۹۱
راجہ مہدی علی خاں	دستکِ نیم شب	۱۰۰
طاہرہ سلطانہ	دستکِ نیم شب	۱۰۱
نینا کاشف	مہابے اور کیل	۱۰۲

میں کیا کیا ہے؟

ظفر واسطی	ہر دل عزیز بننے کے اصول	۱۰۴
گربچن سنگھ	ابو کی تصویر	۱۰۹
مظہر امام	نئی دلہن	۱۱۵
رویتی سرن شرما	آدمی کو نہ کھاؤ	۱۱۶
بنتِ سقراط	گھریلو بچت کے چند اچھے ڈھنگ	۱۲۱
سدرشن بالی	تاش کی بیگم	۱۲۵
نیائے شرما	فریبِ تصوّر	۱۲۹
اثر زیدپوری	اَولاد	۱۳۱
لطیف فاروقی	نشہ	۱۳۵
رضیہ احمد	رنگوں کا انتخاب	۱۳۹
جیلانی بانو	زکام کا علاج	۱۴۳
ہاجرہ ناز لی	قہقہہ	۱۴۹
ساوتری دیوی ورما	بچّوں کے ساتھ بڑوں کا تعاون	۱۵۳
عابد سہیل	چھوٹے لوگ	۱۵۵
ادریس	کیا آپ کو اپنا نام پسند ہے؟	۱۵۹
رتن سنگھ	تیرا دکھ بھی میرا	۱۶۲
یونس احمر	پیتم گئے پردیس	۱۶۴
	بنائی پر کاڑھیے: مفید ہدایات	۱۷۴
	میری اور مارگریٹ: ایک عشق کا انجام	۱۷۶
دُوربین آپا	دیس بدیس	۱۷۸

ان کے علاوہ: میرا پسندیدہ شعر ★ باورچی خانہ ★ انعامی مقابلے
کام کی باتیں ★ آپ کی بزم ★ کشیدہ کاری کے نمونے
لباس کے ڈیزائن ★ اور بہت سی دل چسپیاں

اداریہ

خدا خدا کر کے "بانو" کا یہ سال نامہ مکمل ہوا، اور اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اِس کی ترتیب اِس کے حُسن اور اِس کی طباعت پر ہم نے تین مہینے خرچ کئے پھر بھی کام اتنا وسیع تھا کہ وقت کی کمی کا شدّت سے احساس ہوا، اور نتیجہ میں، سال نامہ ایک ہفتہ دیر سے شائع ہو رہا تھا۔ اس تاخیر کی وجہ سے فروری کا بانو بھی ایک ہفتہ دیر سے شائع ہوگا، لیکن اس کے بعد اشاعت معمول پر آجائے گی۔

سال نامہ ترتیب دینے کا میرے لئے یہ پہلا موقع تھا، اور اپنی "نو آموزی" کا واسطہ دے کر ہی میں آپ سے درخواست کر سکتی ہوں کہ سال نامہ میں جو خامیاں آپ کو نظر آئیں، ان کے لئے مجھے معاف کر دیجئے گا یہی نہیں، بلکہ ایک خط لکھ کر مجھے بتا بھی دیجئے گا، تاکہ اگلا سال نامہ، یا اگلے مہینے کا "بانو" ترتیب دیتے وقت میں آپ کی پسند یا ناپسند کا بھی خیال رکھوں۔

سال نامہ کے لئے بہت سے بہن بھائیوں کے افسانے اور مضامین دیر سے موصول ہوئے۔ کچھ خصوصی مضامین جو ہم نے سال نامہ کے لئے ہی لکھوائے تھے، جگہ نہ ہونے کے باعث روکنے پڑے۔ اب یہ سب چیزیں آہستہ آہستہ اگلے شماروں میں پیش کی جائیں گی۔

۲۰۰ سے زائد صفحات اور ڈھائی روپے قیمت کا یہ سال نامہ خریدار بہنوں کی خدمت میں **مفت** پیش کیا جا رہا ہے۔ اگر آپ کی کوئی سہیلی، رشتہ دار، استانی یا شاگرد ابھی تک بانو کی خریدار نہیں بنی ہے تو اب بھی سال نامہ مفت حاصل کرنے کا وقت ہے، وہ صرف ایک پوسٹ کارڈ ہمیں لکھ دیں، ہم انہیں سال نامہ وی پی سے بھیج کر سالانہ قیمت سات روپے اور ڈاک خرچ ساٹھ نئے پیسے منگوا لیں گے اور سال نامہ کے بعد بھی گیارہ ماہ تک "بانو" انہیں گھر بیٹھے ملتا رہے گا۔

اگر آپ کی کوئی سہیلی سالانہ خریدار ہے اور یہ سال نامہ ابھی تک اسے نہیں ملا ہے تو شاید اس نے ابھی تک سال نامہ کا رجسٹری خرچ پچاس نئے پیسے اپنے خریداری نمبر کے حوالے سے ہمیں منی آرڈر سے نہیں بھجوائے۔ ان سے کہئے آج ہی منی آرڈر بھجوا دیں تاکہ سال نامہ انہیں رجسٹری سے بھیجا جا سکے۔

ایک بار پھر، میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ سال نامہ پر اپنی رائے مجھے ضرور لکھئے، تاکہ میں "بانو" کو آپ کی رائے کے مطابق بہتر بنا سکوں۔

آپ کی مخلص

زینت کوثر حلیم

——— خریدار بن کر سال نامہ مفت حاصل کرنے کے لئے اپنی سہیلیوں، رشتہ داروں، استانیوں اور شاگردوں کی فرمائش آج ہی بھجوا دیجئے ——— شکریہ!

کرشن چندر

ایک خط، ایک گیت

میں نے لفافہ چاک کر کے خط کیا نکالا، گویا شمشیر بے مہر کو بے نیام کیا۔ صاف انکار۔ بالکل صاف انکار۔۔۔۔ کہیں پر شبہے کی کوئی گنجائش نہ تھی آج کل کی لڑکیاں بالکل اسی طرح انکار کرتی ہیں، جس طرح آج سے دو ہزار برس پہلے کی لڑکیاں انکار کیا کرتی تھیں، غریبی اور محنت کبھی ساتھ چلے ہیں جو آج چلیں گے؟ میں نے خط کو بار بار پڑھا اور جب پڑھنے سے بھی تسلی نہ ہوئی تو خط کو سونگھا۔ ظالم نے آج خوشبو بھی نہ لگائی تھی۔ اس سے پہلے کا ہر خط خوشبو میں بسا ہوتا تھا۔ آج تو ڈاکیہ بھی خط کا حلیہ دیکھ کر حیران تھا۔ شاید اسی لئے وہ جلدی سے مجھے خط دے کر بھاگ گیا تھا۔ ممکن ہے اسے کچھ شبہ ہو گیا ہو!

دراصل حماقت میری تھی۔ مجھے بتانا ہی نہ چاہئے تھا کہ میں اس قدر غریب ہوں، میں اس کی دبی دبی سسکیوں، ملتجی نگاہوں اور میٹھی میٹھی باتوں سے دھوکا کھا گیا۔ مجھے معلوم ہونا چاہئے تھا کہ عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے، مرد کی بدصورتی، اس کا بڑھاپا، اس کی بدتمیزی، جہالت، کور نگاہی تک اُسے گوارا ہے، مگر وہ اس کی غریبی برداشت نہیں کر سکتی! شادی سے پہلے تو کسی حالت میں برداشت نہیں کر سکتی۔

اب میں اس خط کو کیا کروں؟ یہ میز اس قدر گندی کیوں ہے۔ یہ گلاس ابھی تک اس پر کیوں پڑا ہے؟ کیلنڈر کا ورق کس نے الٹ دیا ہے؟ سیاہی چوس پر یہ کالے کالے دھبے کیسے ہیں؟ آسمان گدلا کیوں ہے؟ فضا میں یہ گھٹن سی کیا ہے؟

میں نے خط کو اپنی مٹھی میں مسل کر کچل ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا کیلنڈر کو اُلٹا کر کے زمین پر دے مارا۔ گلاس کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا سیاہی چوس کو پھاڑ دیا، اور کتابوں کو دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر فرش پر پٹخ دیا، اور خود کھڑکی میں کھڑا ہو کر فوری خودکشی کے طریقوں پر غور کرنے لگا۔

سامنے بے کنار سمندر پھیلا ہوا تھا۔

یکایک میں نے سوچا۔ بڑی خطرناک بات ہے۔ مجھے اپنی ذہنی کیفیت کو بدلنا چاہیئے۔ میرے مرنے سے تو وہ اور بھی خوش ہوگی۔ اترا اترا کر اپنی سہیلیوں میں میرا ذکر کرے گی۔ اور شادی کے بعد اپنے غریب، مجبور اور دبّو خاوند پر رعب گانٹھے گی۔

نہیں، میں اسے اس کا موقع نہ دوں گا، ہرگز نہ دوں گا۔

لہٰذا میں کھڑکی سے پلٹ کر اس کونے میں گیا جہاں گراموفون رکھا تھا۔ جلدی سے جو ریکارڈ بھی سب سے پہلے میرے ہاتھ میں آیا میں نے اسے گراموفون پر چڑھا دیا۔ ریکارڈ پر سوئی رکھ دی اور خود واپس کھڑکی میں کھڑا ہو کر سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔

دھیرے دھیرے ریکارڈ بجنے لگا، دھیرے دھیرے گیت میرے پاس آیا۔

"ہیلو؟" گیت نے اک ادائے خاص سے مجھے مخاطب کیا۔

"ہیلو؟" میں نے ذرا ترشروئی سے اسے جواب دیا۔

"تم کون ہو؟" گیت نے پوچھا۔

"میں ایک غریب ادیب ہوں" میں نے جواب دیا، اور اس سے پوچھا "تم کون ہو؟"

"تم جانتے نہیں ہو مجھے؟" گیت نے بڑی حیرت سے کہا "میں لتا کیسکر کا مشہور گیت ہوں۔"

"آجا رے بلموا" یہ کہتے ہوئے گیت کی لَے میں ذرا غرور آگیا۔

"ہو تو پھر کیا ہوا؟" میں نے اس کے غرور سے چڑ کر کہا۔

گیت نے فخر سے سینہ تان کے کہا "جانتے نہیں ہو؟ میں دنیا کا سب سے بڑا گیت ہوں۔ میرے دس لاکھ ریکارڈ فروخت ہو چکے ہیں، پچھلے چھ ماہ میں! تمہاری کتنی کتابیں بکی ہیں، پچھلے چھ ماہ میں؟"

"صرف تین۔"

گیت بڑی حقارت سے ہنسا اور اس کا نغمہ بلند ہوتا گیا، جیسے وہ آسمان کو چھو رہا ہو، اور سمندر کی طرح پھیل رہا ہو، پھر بڑی ادا سے اٹھلاتے ہوئے بولا "مجھ سے خوب صورت گیت اس دنیا میں کہیں نہیں ہوگا۔ میرے حسن کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ میں اتنا بکا ہوں، اتنا بکا ہوں کہ میری رائیلٹی سے گیت گانے والی ایک کوٹھی کھڑی کر رہی ہے، گیت لکھنے والے نے ایک گاڑی خرید لی ہے، سنگیت بنانے والے نے اپنی تیسری بیوی کو طلاق دے دی ہے۔۔۔۔"

میں نے سوئی ریکارڈ پر سے ہٹا دی۔

یکایک کمرے میں خاموشی چھا گئی۔۔۔۔

اب وہاں پر کوئی نہ تھا۔

کوئی آواز نہ تھی، کوئی گیت نہ تھا، کوئی نغمہ نہ تھا۔

چند لمحوں کے سکوت کے بعد میں نے پھر سوئی ریکارڈ پر رکھ دی۔

دھیرے دھیرے پھر ریکارڈ بجنے لگا۔ دھیرے دھیرے پھر گیت میرے پاس آیا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ لنگڑا کے چل رہا ہے۔

"ہیلو۔۔۔۔" اس نے دھیمے سروں میں کہا۔

"ہیلو!" میں نے جواب دیا اور مونہہ موڑ کر کھڑکی میں کھڑا ہو گیا، اور سمندر کی لہروں کو دیکھنے لگا۔

"تم نے مجھے بند کیوں کر دیا تھا؟" گیت نے محزوں لہجے میں دریافت کیا۔

میں نے کہا "یہ سمندر کا نغمہ تم سنتے ہو؟ کیا تم اس کی طرح لازوال ہو؟"

"نہیں! میں تو صرف تین منٹ تک بج سکتا ہوں!" گیت نے تاسف سے کہا۔

میں نے گیت سے کہا "جب پہلے دن کائنات نے آنکھ کھولی، تو یہ نغمہ یہاں موجود تھا آگ میں اور پانی میں اور گردش میں۔۔۔۔ تین منٹ کے بعد جب تم آنکھ بند کر لوگے تو یہ نغمہ پھر اسی طرح یہاں موجود ہوگا۔۔۔۔ مگر تم نہ ہوگے اور چند برسوں میں وہ کوٹھی بھی نہ ہوگی، وہ گاڑی بھی نہ ہوگی، صرف محبت کی آہیں باقی رہ جائیں گی۔۔۔۔ ذرا سوچو تم کس بات پر اس قدر فخر کرتے ہو؟"

"تو کیا سمندر کی بیکراں ہستی کے سامنے ایک ذرے کو چمکنے کا کوئی حق نہیں ہے؟" گیت نے برافروختہ ہو کے پوچھا اور یکایک اس کی آواز میں بادلوں کی سی گھن گرج۔۔۔۔ اور رعد کی چمک شامل ہو گئی!

"کیوں نہیں ہے! میرے دوست! مگر اس قدر اترانے سے بھی کیا فائدہ؟ — تم دس لاکھ بار بکے ہو، مگر کبھی کبھی ایک گیت ایسا بھی آتا ہے جو ایک بار بھی نہیں بکتا مگر تم سے زیادہ خوب صورت ہوتا ہے!"

"یہ جھوٹ ہے! — کیا تم نے کبھی ایسا گیت دیکھا ہے یا سنا ہے؟"

"ہاں! ایک بار میں نے ایک عورت کے ہونٹوں پر اس گیت کو دیکھا تھا۔ وہ ایک ماں تھی اور بھکارن تھی، اور سڑک کے کنارے بیٹھی تھی۔ وہ بھوکی تھی اور اس کا بچہ بھوکا تھا۔ اور رات گہری ہو چکی تھی اور روٹی کا ایک ٹکڑا اسے میسر نہیں تھا۔ اور وہ اپنے بھوکے بچے کو لوری سے تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کر رہی تھی، اس لوری میں کیا نہیں تھا؟ کائنات کا سارا درد۔ ماں کی ساری مامتا اور انسانی زندگی کی ساری چاہت گھل گھل کر آواز میں تبدیل ہو رہی تھی۔ جیسے ماں اپنے گلے سے نہیں اپنی بے دودھ چھاتیوں سے گا رہی ہو۔ کیا تم نے کبھی کسی گیت کو بچے کے دودھ میں تبدیل ہوتے دیکھا ہے؟"

"نہیں!"

"میں نے اُس رات دیکھا تھا، اور سمندر کے کنارے دیکھا تھا۔ اور یکایک ہوا کا طوفان تھم گیا تھا۔ اور سمندر شرم سے خاموش ہو گیا تھا۔ اور ناریل کے لہلہاتے ہوئے شور مچاتے ہوئے مور پنکھ ندامت سے سرنگوں ہو گئے تھے ساری کائنات چپ چاپ سر جھکائے اس بے کس بھوکی ماں کے قدموں میں کھڑی تھی، جس نے اپنے بھوکے بچے کو دودھ کی ایک بوند پلائے بغیر ایک

لوری سے سُلا دیا تھا، میں نے وہ معجزہ اپنی آنکھ سے دیکھا ہے! اس لوری کی کرب انگیز لَے اب تک میرے کانوں میں گونجتی ہے.... اور تم مجھ سے کار کی گوٹھی کی اور تیسری بیوی کے طلاق کی باتیں کرتے ہو!"

یکایک میں کھڑکی سے مڑا۔ مگر گیت خاموش ہو چکا تھا۔ ریکارڈ بج کر چپ ہو گیا تھا۔ تین منٹ ختم ہو چکے تھے۔

میں نے پھر ریکارڈ پر سوئی رکھ دی....

دھیرے دھیرے ریکارڈ بجنے لگا۔ دھیرے دھیرے وہی گیت میرے پاس آیا، مگر اب اس میں فخر اور غرور نام کو نہ تھا۔ اب وہ ایک چھوٹا سا میٹھا سا گیت تھا، دل کا ایک چھوٹا سا درد لئے ہوئے، ارمان کی ایک ہلکی سی کسک لئے ہوئے، محبت کے جگنو کی اک ننھی سی روشنی لئے ہوئے۔ اور وہ دھیرے دھیرے میرے دل میں اترنے لگا۔ جیسے زلف رخسار پر اترتی ہے جیسے چاندنی ساحل پر اترتی ہے، جیسے سیپی سمندر کی تہہ میں اتر جاتی ہے اور مونہہ کھول کر محبت کے پہلے موتی کا انتظار کرتی ہے!

میں سر جھکائے اپنی میز کے پاس چلا گیا۔ ہاتھ بڑھا کر میں نے ردّی کی ٹوکری سے اس کے خط کو نکال لیا، اور اس کی تہیں صاف کرتے ہوئے اسے اپنے کلیجے سے لگا لیا۔

رضیہ کا شاہی دسترخوان

ہر ملک کے کھانوں کی تیاری اور مصالحوں کے وزن آسان زبان میں پیش کئے گئے ہیں۔ شاہان مغلیہ سے شاہانِ انگلشیہ تک کے لذیذ کھانوں کی تیاری کے طریقے صرفِ کثیر کے بعد مخصوص لوگوں سے حاصل کر کے قلم بند کئے گئے ہیں۔ ہزاروں قسم کے نمکین اور میٹھے کھانے اور پکانے کی ترکیبیں پوری طرح لکھی گئی ہیں۔ ہر عورت کے پاس کم از کم ایک نسخہ ضرور ہونا چاہئے۔ قیمت ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے

بانو بک ڈپو، آصف علی روڈ۔ نئی دہلی

دوشیزہ پاکستان۔ جناب ایم اسلم کا سہیلیوں کے واقعات محبت پر نیا ناول پہلے ۵۰ نئے پیسے

ایک بیوی ہزار عورتیں۔ عابد جعفری کا ایک عجیب و غریب ناول۔ ۵ روپے

پاسبان حرم۔ ایم اسلم کا تاریخی ناول، حرم مقدس پر دشمنوں کی نگاہ۔ ۵ روپے

شمع۔ محترمہ اے آر خاتون کا بے حد مقبول ایک معاشرتی ناول۔ ۵ روپے

افشاں۔ محترمہ اے آر خاتون کا دوسرا تہلکہ مچا دینے والا ناول۔ ۷ روپے ۵۰ نئے پیسے

چشمہ۔ محترمہ اے آر خاتون کا بالکل نیا اور اچھوتے انداز سے لکھا ہوا ناول۔ ۱۰ روپے ۷۵ نئے پیسے

جوار بھاٹا۔ جناب اے اختر کا ایک نیا رومانی ناول۔ ۴ روپے ۵۰ نئے پیسے

ناظمہ کی آپ بیتی۔ جناب ایم اسلم کا ایک ازدواجی زندگی سے متعلق مجموعہ۔ ۳ روپے

کرنیں۔ کیپٹن شفیق الرحمن نے اس مجموعہ میں نئی پھلجھڑیاں چھوڑی ہیں۔ ۳ روپے

خوفناک محبت۔ مولانا عبدالحلیم شرر کا ایک اسلامی معاشرتی ناول۔ ۲ روپے

سیدہ کا لال۔ علامہ راشد الخیری مرحوم کا سچا شہادت نامہ جس کو شہرت دوام حاصل ہے۔ ۲ روپے

آمنہ کا لال۔ مصورِ غم علامہ راشد الخیری مرحوم کا سچا میلاد نامہ۔ ۱ روپیہ ۵۰ نئے پیسے

نیلم۔ قیسی رام پوری کا بالکل نیا ناول حسین رخساروں پر آنسوؤں کی کہانی۔ ۴ روپے ۵۰ نئے پیسے

حسن بانو۔ دو دھڑکتے دلوں کی دردانگیز داستان، جس کو آپ نہ بھول سکیں گے۔ ۳ روپے

الزام۔ طوائف ــــ جس کو چند سکوں کی خاطر کھلونا بنایا جا سکتا ہے۔ ۴ روپے ۵۰ نئے پیسے

آرزو۔ جب اس نے غدر کی محبت سے انکار کیا تو انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ ۳ روپے

چنگیاں۔ ایم رضا کا وہ ناول جو ایک طنز ہے، ترش بھی ہے اور تلخ بھی۔ ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے

لوفر۔ ایک ایسا ناول جو اندھیری رات کی طرح پُراسرار اور دلچسپ بھی۔ ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے

درندہ۔ وہ انسان تھا لیکن ایک خونی درندے سے بدتر ایک قاتل کی کہانی۔ ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے

بھروسہ۔ کیا عورت بغیر بھروسہ کے زندہ رہ سکتی ہے۔ ناول بھروسہ پڑھئے۔ ۴ روپے

طلاق۔ ایک نیک فرشتہ سیرت عورت کی دل ہلا دینے والی داستان۔ ۳ روپے

شاہدہ۔ انتصار حسین کا ناول خوبصورت دنوں کی یاد ہے۔ ۳ روپے

ترا آستاں سلامت۔ ساری عمر وہ بھٹکتا رہا، آگے اس ناول میں پڑھئے۔ ۲ روپے

آنکھوں آنکھوں میں۔ ضیا عظیم آبادی کا ایک جذباتی ناول۔ ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے

ڈوبتی نظریں۔ کرپا شنکر بھارد واج کا ناول جس میں حسین خوابوں کی تعبیر ہے۔ ۵ روپے

دوزخ۔ ابن حیات کا رومانی ناول، پڑھئے اور چٹخارے لیجئے۔ ۵۰ روپے

نگاہِ ناز۔ ضیا عظیم آبادی کا نیا ناول جو نئے انداز سے لکھا ہے۔ ۴ روپے ۲۵ نئے پیسے

زلفِ یار۔ "مہک رہی ہے فضا زلفِ یار کی صورت" حسین علوی کا ناول۔ ۴ روپے

لبنیٰ۔ محترمہ نادرہ خاتون کا وہ ناول جو اے آر خاتون کے ناولوں کی ٹکر کا ہے۔ ۶ روپے

شمع بک ڈپو ــــ آصف علی روڈ ــــ نئی دہلی

منور مادیوان

فرح دیبا

ایک سنڈریلا کی شادی

بات فخر کی نہیں تو حیرت کی ضرور ہے۔ آج سے ڈیڑھ برس پہلے ہمارے دور کی تاریخ کے ایک بہت بڑے رومانی ڈرامے کے آخری سین پر پردہ پڑا۔ دُنیا کی "حسین ترین" خاتون سے، اُسی سے بے پناہ محبت کرنے والے شوہر نے "طلاق، طلاق، طلاق" تین بار کہا اور اس کو ملکہ سے "معمولی" شہزادی بنا دیا شاہ ایران اور ملکہ ثریا کی محبت کے اس خاتمے کی داستان بیان کرتے ہوئے "بانو" نے لکھا تھا "..... شاہ کی اپنی بیٹی (مصر کے شاہ فاروق کی بھانجی شاہزادی شہناز) بھی اپنی سوتیلی ماں کی سرگرمی سے تلاش کر رہی ہیں۔ شاہزادی کی نظروں میں کئی ایرانی حسینائیں ہیں ..... اگر یہ گفتگو سرے چڑھ گئی تو اُمید ہے اگلے مہینے تک شادی کا اعلان ہو جائے گا۔ خدا کرے اپنی سوتیلی ماں کے لئے شہناز کا انتخاب کامیاب ہو" (بانو، اکتوبر ۱۹۵۸) کسے خبر تھی کہ جب اس ڈرامے کے دوسرے حصے کا آغاز ہوگا تو یہی الفاظ درمیانی کڑی بن جائیں گے، اور شاہ کی نئی دلہن واقعی ان کی لڑکی شہناز کی ہی پسند سے منتخب ہوگی۔

۲۱ دسمبر ۱۹۵۹ کو شام کے چار بجے سفید ریش مجتہد مولانا حسن امامی نے قصر مرمریں کے ایک خاص کمرے میں سنہرے بالوں اور سیاہ آنکھوں والی ۲۱ سالہ ایرانی دوشیزہ سے پوچھا "تمہیں منظور ہے؟ تمہیں منظور ہے؟ تمہیں منظور ہے؟" اور دو مرتبہ خاموش رہنے کے بعد تیسری بار اس نے آنکھیں بدستور نیچے کئے ہوئے کہہ دیا "بلے" (ہاں) اور اس طرح

آکیس توپوں کی شاہانہ سلامی اور ایرانی عوام کے والہانہ اور عظیم الشان جشن کے درمیان شہزادی شہناز کا یہ عدیم المثال فرض بھی پورا ہو گیا۔ جہاں جوان بیٹیاں بھی رموز سلطنت کی مصلحتوں کی بدولت اپنے لئے سوتیلی مائیں ڈھونڈنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

لوگ اس سارے قصے کو اس بن ماں کی بیٹی سنڈریلا کی داستان سے تشبیہہ دے دیتے ہیں جو محض ایک مہربان پری کی بدولت ایک شہنشاہ کے دل کی مالک بن بیٹھی تھی۔ لیکن میرے خیال میں یہ کہانی سنڈریلا سے بھی کہیں زیادہ پُرپیچ اور پُرسوز ہے۔ سنڈریلا کی تو بس اتنی ہی مجبوری تھی کہ اس کی چڑیل نما سوتیلی بہنیں اسے کہیں اپنے ساتھ نہ لے جاتی تھیں اور وہ محض اپنی مہربان پری کے رحم و کرم پر زندگی کے جشن تماشوں میں جھانک پاتی تھی۔ لیکن فرح کی زندگی میں ایسا کبھی نہیں ہوا وہ شیشے کے ایسے خوشنما جوتے پہن کر کبھی بادشاہ کے محل میں نہیں گئی اور نہ ہی اس کے لئے کسی گھڑی نے کبھی بارہ بجائے کہ وہ بھاگتے میں اپنے جوتے بھول گئی ہو۔ اس لحاظ سے ایرانی فرح دیبا یورپین سنڈریلا سے کہیں زیادہ خوش نصیب ہے لیکن دوسرے ہی لمحے خیال آتا ہے کہ پریوں کی پیاری سنڈریلا اس بے چاری فرح کے مقابلے میں کہیں اچھی رہی ہوگی۔ اس لئے کہ جو مسائل فرح کے سامنے ہیں۔ ان کا سامنا اگر سنڈریلا کو کرنا ہوتا تو وہ نہ جانے اپنی مہربان پری سمیت کہاں بھاگ گئی ہوتی۔ اس لئے کہ اس کے خوش بختی کے تاج میں رنج و ملال اور شک و

شاہِ ایران فوزیہ سے شادی کے فوراً بعد۔ شاہ کی بیٹی شہناز (جس کے ہاں حال ہی میں لڑکا پیدا ہوا ہے) اسی شادی سے پیدا ہوئی تھی

ثریا اور شاہِ ایران کی شادی کی تصویر۔ ثریا شاہ کی زندگی کا وہ رنگین باب ہے جسے شاہ آسانی سے کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

تیسری (اور آخری؟) شادی۔ فرح اور اس کا بادشاہ۔ شاہ نے جب فرح سے شادی کی تجویز کی تو فرح نے کہا "میں سوچ کر جواب دوں گی"
—— اور سوچنے کے بعد اس نے ایران کے تخت کا وارث پیدا کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

شبہے کے بے شمار کانٹے بھی آ کر چبھ گئے ہیں جو آنے والے کئی برسوں تک فرح کی فتح کن اور مسحور کن مسکراہٹوں کی روح زخمی کرتے رہیں گے۔

مسرت و ملال، خوف اور یقین اور محبت اور حسد کی اس داستان کا آغاز آج سے چھ ماہ پیشتر ہوا۔ ثریا سے الم ناک جدائی کے بعد تختِ طاؤس کے والی نے دنیا کا کونہ کونہ چھان مارا تھا کہ زخمی دل کا مرہم کہیں مل جائے۔ لیکن ہر جگہ اسے مایوسی ہوئی۔ کبھی پاکستان کے سابق گورنر جنرل اسکندر مرزا کی سوتیلی صاحبزادی کا نام آیا تو کبھی یورپ کے اعلیٰ خاندانوں میں قسمت کے قرعے پڑے لیکن تقدیر کا فیصلہ ہر بار نفی ہی میں نکلا۔

پیرس کے ایک سٹور میں فرح دیبا اپنی شادی کے لئے سامان خرید کرتے کرتے تھک جانے کے بعد آرام کر رہی ہے۔

چند ماہ پہلے تو قریب قریب یہ طے ہی ہو چکا تھا کہ اٹلی کے شاہی خاندان کی چشم و چراغ اور یورپ کی حسین ترین دوشیزہ میریا گبریلا حافظ و سعدی کے شعروں بھرے دیش کی ملکہ بنے گی۔

لیکن مذہب کے اختلاف، یورپ کے دل پھینک نوجوانوں کے احتجاج اور گبریلا کے اپنے من کے شبہات نے اس خواب کو کبھی حقیقت کے سانچے میں ڈھلنے نہ دیا۔ اس کے بعد کہتے ہیں کہ شاہ مایوس ہو گئے۔ انہوں نے تقریباً طے کر لیا کہ وہ اب کہیں کوئی تلاش نہیں کریں گے۔ جس کو آنا ہوگا خود آجائے گا ورنہ ——— وہی ہوگا جو منظور خدا ہوگا ——— بلکہ شاہ کے قریبی حلقوں کا کہنا تو یہ تھا کہ انہوں نے ثریا ہی کو رجوع کا پیغام بھیجا لیکن ثریا نے پہلی دل شکنی کے باعث اسے نامنظور کر دیا۔ شاید قسمت پر اسی طرح قادر ہونے کا یہ نتیجہ تھا کہ انہیں گوہر مراد خود اپنے ہی وطن میں مل گیا۔

یہ سب کچھ یوں ہوا کہ شاہ کے داماد جناب اردشیر زاہدی ایران کی وزارت خزانہ کے اس شعبے کے انچارج بنا دیئے گئے جس کا تعلق غیر ملکی زرمبادلہ کی تقسیم ہے۔ یعنی ایرانی شہریوں کو غیر ملکوں میں خرچ کرنے کے لئے غیر ملکی سکہ حاصل کرنے کے پرمٹ دینا جناب زاہدی کے دائرہ اختیار میں تھا۔ ایک روز وہ دفتر میں بیٹھے تھے کہ ایک الھڑ سی لڑکی جس کے بال لڑکوں ایسے (پیرس فیشن کے) کٹے ہوئے تھے اور جو کمال بے پروائی سے ایک سادہ سا غبارہ نما کوٹ اور ٹوٹے سے جوتے پہنی ہوئی تھی۔ ان کے دفتر میں داخل ہوئی۔

لڑکی نے اپنا تعارف فرح دیبا کہہ کر کروایا۔ پتہ چلا کہ وہ ایک پرانے ایرانی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ باپ ایک فوجی کیپٹن تھا جو مر چکا ہے اور اب ماموں کی نگرانی میں پیرس میں فن تعمیر کی طالبہ ہے۔ فرح کی شکایت تھی کہ اسے پیرس میں خرچ کرنے کے لئے جتنا روپیہ ایران سے لے جانے کی اجازت ہے، وہ قطعاً ناکافی ہے، اس لئے کہ منظور شدہ ساڑھے تین سو روپوں میں اسّی روپے ماہوار کی "بڑی" رقم تو وہ کمرے کا کرایہ ہی دے دیتی ہے۔ اس کے بعد فیس وغیرہ ادا کرنے پر اس کے پاس اتنا بھی نہیں بچتا کہ دو ایک فلمیں دیکھ سکے یا اِدھر اُدھر کہیں تفریح کے لئے جا سکے ——— بڑے التجا بھرے لہجے میں فرح نے کہا "دیکھئے نا، میری امّی کہتی ہیں کہ حلق میں کافی انڈیلتے انڈیلتے میں نے اپنی صحت خراب کر لی ہے۔ لیکن میں کیا خاک کر سکتی ہوں؟ جب اور کچھ کرنے کے لئے پیسے ہی نہ ہوں تو کافی پینے کے سوا چارہ ہی کیا ہے؟" لہٰذا اس کا اصرار تھا کہ اسے کم از کم پانچ سو روپے ماہانہ خرچ کرنے کی اجازت دے دی جائے اس لئے کہ اس سے زیادہ صرف کرنے کی تو اس کی ہمت ہی نہیں۔

عمر کا فرق

"لوگ کہتے ہیں کہ شہنشاہ اور میرے درمیان عمر کا فرق کافی زیادہ ہے۔ پچھلے ماہ ان کی چالیسویں سال گرہ منائی گئی ہے میری عمر اکیس برس ہے لیکن میرے خیال میں یہ فرق بہت معمولی ہے ——— دس ہی برس سے میرے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا اور مجھ میں دنیا کا زیادہ سنجیدگی سے سامنا کرنے کا مادہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس لحاظ سے میں اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑی ہوں۔ اس کے مقابلے میں شہنشاہ کی شخصیت اپنی عمر کے مقابلے میں کہیں زیادہ جوان ہے مجھے یقین ہے کہ عمر کا فرق ہماری خوشیوں کے درمیان حائل نہیں ہوگا۔"

——— فرح دیبا کی ڈائری میں سے

▲ سابق ملکہ ثریا

لوگ کہتے ہیں کہ شاہ نے شادی کے لئے فرح دیبا کو پسند کیا، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ فرح کی شکل ثریا سے ملتی جلتی ہے، اور وہ ہمیشہ ان کے دل میں ثریا کی یاد تازہ رکھے گی آپ خود ہی دیکھئے دونوں میں کتنی مشابہت ہے۔

نئی ملکہ فرح دیبا ◀

زاہدی مجبور تھے، سرکاری قاعدے اور قانون کے مطابق دیبا کو چار سو روپے ماہوار سے زائد کا پرمٹ نہ مل سکتا تھا۔ لیکن انہیں فرح پر رحم آیا اور انہوں نے اس کی درخواست پر سنجیدگی سے غور کرنے کا وعدہ کر کے اسے چند روز بعد دوبارہ آنے کا حکم دے دیا۔ فرح واپس تو آ گئی۔ لیکن اسے پھر خیال آیا کہ چند برس پہلے وہ اور زاہدی کی بیگم یعنی شہزادی شہناز گرل گائیڈ کیمپ میں اکٹھی تھیں اور ہو سکتا ہے کہ اگر وہ اب شہزادی کے پاس جائے تو وہ اسے پہچان لے اور اپنے شوہر سے اس کی سفارش بھی کر دے یہی سوچ کر وہ ایک روز شہناز کے ہاں پہنچ گئی اور یہیں سے اس "سنڈریلا نما" قصے کا آغاز ہو گیا۔ شہناز اپنے والد کی دل شکنی کے باعث پہلے ہی اُداس تھی اس لئے زیادہ باتیں وہ فرح سے تو نہ کر سکی (فرح سے پُرانی واقفیت اسے اچھی طرح یاد تھی) لیکن نہ جانے کیسے فرح کی شخصیت اس کے دل پر گھر کر گئی اس نے اسے اگلے روز چائے پر آنے کے لئے کہہ دیا۔ فرح خوش تھی کہ اس طرح اسے زاہدی کے روبرو ہو کر اپنی درخواست منظور کروانے کا موقعہ مل جائے گا۔

اگلے روز جب وہ ان کے ہاں گئی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ شہزادی شہناز کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی اور اپنی بیٹی کو دیکھنے کیلئے خود اعلیٰ حضرت شہنشاہ کجکلاہ بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ شہناز کی یہ مہربانی تھی کہ اس نے فرح کی چائے ملتوی نہیں کی تھی اور وہ بھی گھر کی پارٹی" میں شہناز کی سہیلی کے طور پر شریک ہو گئی۔

یہاں پر تو خیر کوئی زیادہ بات چیت نہیں ہوئی لیکن شہزادی شہناز اور ان کے شوہر کے دل میں نہ جانے یہ بات کیسے گھر کر گئی کہ انہوں نے اپنی ہونے والی ملکہ ڈھونڈھ لی ہے۔

شہزادی شہناز سے بہت پوچھا جا چکا ہے کہ انہوں نے اور ان کے شوہر نے یہ انتخاب فرح میں کن خصوصیات کو دیکھ کر کیا۔ لیکن ان کا کہنا یہی ہے کہ وہ اب تک نہیں بتا سکتیں کہ فرح کی کیا چیز انہیں سب سے زیادہ بھائی۔ اتنا ضرور ہے کہ اپنے ابا سے واقف ہوتے ہوئے انہیں یقین تھا کہ یہ لڑکی ان کے زخمی دل پر محبت کا پھاہا رکھ دے گی۔

ایسا ہی ہوا۔ شہناز نے یہی بات اپنی دادی مادر ملکہ تاج الملوک سے کی اور انہوں نے اپنے بیٹے سے۔ شاہ نے چند لمحے سوچ کر ہاں کر دی اور بات چل پڑی۔ بات چلانے ہی کے لئے مادر ملکہ نے خود اپنے محل میں ایک پارٹی کی جس میں اور کئی لوگوں کے علاوہ فرح بھی موجود تھی۔ اب فرح کا کہنا ہے کہ پہلی بار میرا ماتھا اسی وقت ٹھنکا جب مادر ملکہ نے مجھ میں اتنی گہری دلچسپی لینی شروع کر دی لیکن دوسرے ہی لمحے اپنے اس خیال پر مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا "چل ری فرح تو تو بچپن ہی سے خوابوں کی دُنیا میں بسنے کی عادی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایران

فرح دیبا ـــــ کل اور آج۔ کل کی فرح دیبا، ایک سیدھی سادی، معمولی سی چوٹی گوندھنے والی طالب علم لڑکی تھی، اور آج لاکھوں روپے اس کا حُسن سنوارنے کے بعد دیکھیے وہ کتنی نکھر آئی ہے۔

کی ہر دوشیزہ کی طرح جو خواب تو نے کبھی بچپن میں گڈے گڑیا کا کھیل رچاتے ہوئے دیکھے ہوں، وہ پورے ہی ہو کر رہیں۔" فرح نے اسی انٹرویو میں کہا ہے کہ یوں تو ثریا کی طلاق کے بعد بھی میری چند سہیلیوں نے ایک روز معصومیت بھرے مذاق میں مجھے چھیڑتے ہوئے کہا تھا کہ اگر تجھے کوئی اور ہم جماعت نوجوان پسند نہیں آتا تو کیا تو شاہ کی دُلہن بنے گی؟ لیکن اس مذاق پر بھلا کون دھیان دے سکتا ہے، اس لئے اس روز پارٹی میں بھی میں نے شاہ اور مادر ملکہ کی خصوصی نوازشوں کو محض ان کے مہربان مزاج سے تعبیر کیا جو یہ سوچ کر مجھ میں اور گہری دلچسپی لے رہے ہیں کہ میں ایک عام گھرانے کی نوجوان سی لڑکی اتنی بڑی سوسائٹی میں کچھ اجنبیت سی محسوس کر رہی ہوں گی۔

لیکن چند ہی روز بعد وہ سرگوشی کچھ درست ہی ثابت ہوئی جو فرح سے اس کے خالص نسوانی جذبے نے کی تھی کیوں کہ فرانس کے مشہور ادیب بالزک نے کہا ہے کہ اگر مرد کی پیار بھری نگاہیں عورت کی پیٹھ پر بھی پڑیں تو بھی عورت کے دل تک ان کی ناقابل برداشت گرمی پہنچ ہی جاتی ہے۔ چنانچہ چند ہی روز بعد فرح جب پیرس جانے کی تیاریاں کر رہی تھی (اس کی یہ درخواست "منظور" ہو گئی تھی کہ پیرس میں اسے پانچ سو تولے ماہوار خرچ کرنے کی اجازت دے دی جائے) تو اس کے ماموں کو جناب اردشیر زاہدی کا فون آیا کہ شہنشاہ ایران فرح سے ملنا چاہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ تیاریاں ملتوی کر دی گئیں۔ جہاز کی سیٹ کینسل کرا دی گئی اور فرح ہوائی اڈے کی بجائے شاہی محل کو روانہ ہو گئی۔ فرح کا بیان ہے کہ جب وہ شاہی محل پر پہنچی تو پتہ چلا کہ شاہ محل کے عقبی باغیچے میں اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہاں پر کیا بات چیت ہوئی یہ تو کوئی نہیں جانتا لیکن فرح کا کہنا ہے کہ شاہ نے محض اتنا ہی کہا کہ "فرح تمہارے ملک اور تمہارے بادشاہ کو تمہاری محبت کی ضرورت ہے۔ کیا تم اسے قبول کرو گی؟" مرد خواہ بادشاہ ہو یا فقیر پھر بھی مرد رہے گا اور عورت خواہ رانی ہو یا بھکارن پھر بھی عورت ہی رہے گی۔ اس لئے ایک مرد کی استدعا پر ایک عورت کو جو کہنا چاہئے تھا، اس نے وہی کہا۔ یعنی "سوچ کر" جواب دینے کا وعدہ کیا، حالانکہ اب فرح کہتی ہے کہ اس میں سوچنے کی بات ہی کیا تھی۔ خیر نہ جانے وہ رات اس نے کس طرح گزاری۔ اسے لگتا تھا کہ آسمان کے تمام تارے زمین پر اُتر آئے ہیں اور وہ کہیں ان کے اوپر اڑی جا رہی ہے۔ اسے یقین نہ آتا تھا کہ اس کے شہنشاہ نے یہ سب کچھ خود اس سے کہا ہے۔ لیکن اگلے ہی روز اس نے مجسم انتظار شہنشاہ سے "ہاں" کہہ دی۔

چند روز بعد فرح پیرس میں تھی۔ فن تعمیر کی کافی پینے اور ٹانی چوسنے

فرح دیبا ـــــ کل اور آج۔ کل فرح پیرس میں اپنے تنگ و تاریک کمرے میں تنہا اپنا وقت گذارتی تھی ـــــ اور آج وہ تہران کی شاہی سوسائٹی کی ہی نہیں، شاہ ایران کی پوری توجہ کی بھی مرکز ہے۔

والی طالبہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ دُنیا کی ایک بہت بڑی بادشاہت کی ہونے والی ملکہ کے طور پر (بادشاہ تو دنیا میں کئی ہیں لیکن شاہ ایران جتنے بااختیار بادشاہ اب مشکل ہی سے ملیں گے۔) اب اسے مہینے بھر میں پانچ سو روپے صرف کرنے کے لئے درخواستیں گزارنے کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ جس ہوٹل ہی میں وہ ٹھہری ہوئی تھی اس میں فرح کے کمروں کا روزانہ کرایہ تقریباً تیرہ سو روپے ہے۔ اب پیرس کے بہترین فیشن گھر اس کا لباس عروسی تیار کرنے میں مصروف تھے۔ محض بالوں ہی کا ڈیزائن تیار کرنے والی مادام لافار کی فیس پانچ سو پونڈ یعنی تقریباً ساڑھے سات ہزار روپے تھی۔ اس کے بال اب پیرس کے لاابالی ڈھنگ سے کھلے نہیں رہے تھے، بلکہ ان پر اب اصلی بالوں کی ایک ایسی "وگ" آگئی تھی جس کی نقل کے لئے تہران ہی کی نہیں، پیرس کی اعلیٰ سوسائٹی کی بھی سینکڑوں خواتین بے قرار تھیں اور تہران میں تو آرائش گیسو کی دو دکانوں نے اس ڈیزائن کو فیشن پرست خواتین میں آناً فاناً مقبول کروا تے ہی ہزاروں کیا لاکھوں کما لئے ہوں گے۔

پیرس کا "فیشن گھر" ڈائرا اس کا لباس عروسی تیار کر رہا تھا، جس کا پہلا بیمہ محض اس بات کا ہوا کہ وہ پہننے کے وقت تک صیغۂ راز میں رہے گا اور اگر راز افشا ہو گیا تو بیمہ کمپنی ڈائر کے فیشن گھر کو سوا تین لاکھ روپے حرجانہ دے گی۔ جب یہی لباس پیرس سے تہران بھیجا گیا تو اس نے فیشن کی تاریخ میں سنسنی پیدا کر دی کیوں کہ اس کا "چوری، آگ اور دوسرے تمام خطرات" کا بیمہ ہی پونے تین لاکھ روپے کا ہوا تھا۔

اب پیرس میں فرح کے ساتھی فن تعمیر کے طالب علم نہیں بلکہ اعلیٰ سوسائٹی کے لوگ تھے جو فرح کے لئے غیر تو نہیں لیکن اجنبی ضرور تھے۔ یہی نہیں بلکہ اسے ملکہ بنانے کے ڈھنگ سکھانے والے اتالیق ہی کی تنخواہ چھبیس ہزار روپے ماہانہ کے قریب تھی۔

فرح کا کہنا تھا کہ وہ بہت سادگی پسند ہے۔ لیکن بادشاہوں کی "سادگی" کا حساب بھی لاکھوں ہی میں ہوتا ہے۔ اس لئے نہ جانے کتنے لاکھ شادی سے پہلے ہی خرچ کر دئے گئے۔ ایک اندازے کے مطابق اکیس لاکھ کے کپڑے اور زیورات چند ہی روز میں خرید لئے گئے۔

لیکن پیرس میں لکھی گئی فرح کی ڈائری سے پتہ چلتا ہے کہ خواب و خیال کی اس دنیا میں آنے کے باوجود زندگی کی چند تلخ حقیقتیں ایسی تھیں جو سنڈریلا کے روائتی گھنٹے کی طرح ہر گھڑی ہی بارہ بجا کر اس سے کہہ رہی تھیں کہ "اب بھی سوچ لو۔ بھاگ سکتی ہو تو بھاگ جاؤ۔ کیونکہ راہ بڑی پُرخطر ہے!"

انہی تلخ حقائق نے ایک شام تو اس پر بُری طرح حملہ کر دیا۔ وہ دن بھر کی مصروفیت آمیز خرید کے بعد جب واپس اپنے ہوٹل لوٹی تو مسرخ پھولوں

کا ایک بہت ہی بڑا اور بہت ہی خوب صورت گلدستہ اس کے کمرے میں اس کا منتظر تھا۔ ساتھ ہی ایک سادہ سا کارڈ تھا جس پر محض اتنا لکھا "ملکہ بننا تمہیں مبارک ہو، اللہ تم دونوں کو ہمیشہ خوش رکھے۔ دُعا گو ثریا"۔

فرح کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اسے حسد کے بجائے ثریا پر رحم ہی نہیں بلکہ بقول اس کے "پیار" آگیا اور ثریا کا احترام اس کی نگاہ میں دوبالا ہوگیا۔

وہ اپنی ڈائری میں لکھتی ہے "ثریا میری بلکہ تھیں۔ اس لئے برسوں سے مجھے ان کی ہر بات میں دلچسپی رہی تھی۔ میں نے ان کے دکھ درد کو گویا بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ان کی طلاق پر میری آنکھیں بھر آئی تھیں، اور آج میں یہ سوچتی ہوں کہ کبھی اسی ہوٹل میں ثریا نے بھی اسی طرح اپنی شادی کی تیاریاں کی ہوں گی۔ ان کے بھی میری ہی طرح ارمان اور جذبات ہوں گے، وہ بھی سوچتی ہوں گی کہ جو بات فوزیہ (سابق شاہ مصر فاروق کی بہن) سے نہ ہوسکی وہ اس سے ہوجائے گی۔ لیکن قسمت نے اگر ان کا ساتھ نہیں دیا تو وہ کیا میرا ساتھ دے گی۔ اگر قسمت نے میرا بھی ساتھ نہ دیا تو میرا کیا ہوگا؟ اس لئے کہ تہران میں تو شاہ نے مجھے اپنی محبت کی پرانی ناکامیوں کے متعلق صاف صاف بتادیا ہے۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ وہ ثریا سے اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ محبت کرتے تھے جتنی کہ وہ ابھی مجھ سے کرتے ہیں ـــــ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس دلہن کی حالت کیا ہوگی کہ جسے پتہ ہو کہ اس کا ہونے والا شوہر پہلے بھی محبت کرچکا ہے، اور بے انتہا محبت کرچکا ہے۔ میرے ذہن میں شاہ سے دو برس پرانی وہ ملاقات بھی تازہ ہے جب وہ پیرس آئے تھے اور ایرانی طلبا کے ایک مشتاق گروہ سے (جس میں میں بھی شامل تھی) انہوں نے کہا تھا کہ اگر اُن کا بس چلتا تو وہ ثریا سے دوبارہ شادی کرلیتے۔ میرے پاس ابھی تک اخبار کا وہ تراشہ بھی موجود ہے جس میں انہوں نے طلاق کے بعد ثریا کو ایک خط میں لکھا تھا کہ اگر وہ نئی شادی کریں گے بھی تو وہ صرف تخت کا وارث پیدا کرنے کے لئے ہوگی جس کے بعد وہ نئی بیوی کو طلاق دے کر دوبارہ ثریا سے شادی کریں گے ـــــ یہ تمام باتیں کوئی ڈھکی چھپی نہیں۔ سارے زمانے کی زبان پر ہیں۔ لیکن میں پھر بھی ان کی محبت قبول کررہی ہوں۔ کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ اتنے بڑے انسان کا خلوص بھی بہت بڑا ہے۔ وہ میرے ہونے والے شوہر ہی نہیں میرے بادشاہ بھی ہیں اور بادشاہ اور ملک کی خدمت ہر ایرانی کا اولین فرض ہے"۔

فرح اسی ڈائری میں آگے چل کر لکھتی ہے "لیکن میرا دل کہتا ہے کہ قسمت میرا ساتھ دے گی۔ میرے تین بچے ہوں گے، کیوں کہ یہی بہترین تعداد ہے۔ پرشکوہ محل میں میرا دل شاید نہ لگے، لیکن، شاہ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اپنا رہائشی محل میں خود اپنے ذوق کے مطابق سجاسکوں گی۔ اللہ مجھے ہمت دے کہ اس موقعہ پر جب میری کوئی سہیلی اور کوئی ہمراز میرے قریب نہیں ہوگی، میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرکے قسمت کا چیلنج قبول کرسکوں"۔

میں خود سوچتی ہوں کہ وہ غریب کیا سوچتی ہوگی جب دُنیا کے بڑے بڑے اخباروں نے ثریا اور فرح دونوں کی قدآدم تصویریں شائع کرکے یہ کہا کہ ثریا اور فرح دیبا کی صورت میں بے انتہا مشابہت موجود ہے اور شاہ کی پسند کی ایک بڑی وجہ شاید یہی ہے۔ اس نے بھی وہ تصویریں دیکھی ہوں گی جس میں شاہ اور فوزیہ (۴۸-۱۹۳۹) اکٹھے موجود ہیں۔ اس کے بعد اس نے ثریا کی آٹھ سالہ شادی شدہ زندگی کے قصے سُنے ہوں گے اور پھر چند ہی روز پہلے اسی شادی کے متعلق شاہ کا یہ بیان بھی پڑھا ہوگا کہ "میرا خیال ہے کہ اب تخت طاؤس کو اس کا وارث مل جائے گا" گویا اب بھی شاہ کے لئے فرح کی اہمیت محض اتنی ہی ہے کہ وہ ولی عہد کی ماں بن جائے گی، اگر نہ بن پائی تو؟

کہنے کو تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اب بھی قسمت نے ساتھ نہ دیا تو شاہ قسمت پر قانع ہوکر اسی کے ساتھ زندگی گزار دیں گے۔ لیکن بقول فردوسی "بادشاہوں کے قول کا کیا اعتبار ـــــ" اگر ایسا نہ ہوا تو؟

امید و بیم کے ان ہی جذبات کو لئے فرح واپس تہران لوٹی۔ یہاں پر شادی سے پہلے پندرہ روز اس نے اپنے منگیتر کے پاس مادر ملکہ کی ذاتی جاگیر اور شاہی تفریح گاہ "شاہ دشت" میں گزارے جو تہران سے پچاس میل پر ہے اور جہاں پر اسے شاہ اپنے ذاتی جیٹ ہوائی جہاز میں بٹھا کر خود اُڑا لے گئے تھے۔ وہیں پر شادی کی تاریخ طے پائی۔ لیکن خوف اور امید کا سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ ایرانی عقیدے کے مطابق جمادی الثانی اچھا مہینہ نہیں اور اس میں عموماً شادیاں نہیں رکھی جاتیں، لیکن شاہ کا اصرار تھا کہ اس مرتبہ وہ قسمت کا مونہہ چڑا کر ہی رہیں گے۔ فرح نے اس میں ان کا ساتھ دیا اور اس طرح تہران کے فیشن گھروں میں بہار لگ گئی۔ شادی کی تیاریاں زور شور سے شروع ہوگئیں اور آخر ۲۱ دسمبر کو اس ڈرامے کا پہلا ایکٹ بخیر و خوبی لیکن بصد شان اختتام تک جا پہنچا۔

میری ایک سہیلی نے تہران سے شادی کا آنکھوں دیکھا حال لکھ کر بھیجا ہے اسے میں جوں کا توں پیش کررہی ہوں:

آج کئی برسوں بعد تہران کی زندگی میں پھر چہل پہل اور رونق آگئی اس کی ابتدا، اس وقت ہوئی جب ایران کی موجودہ ملکہ اپنے لامثال عروسی

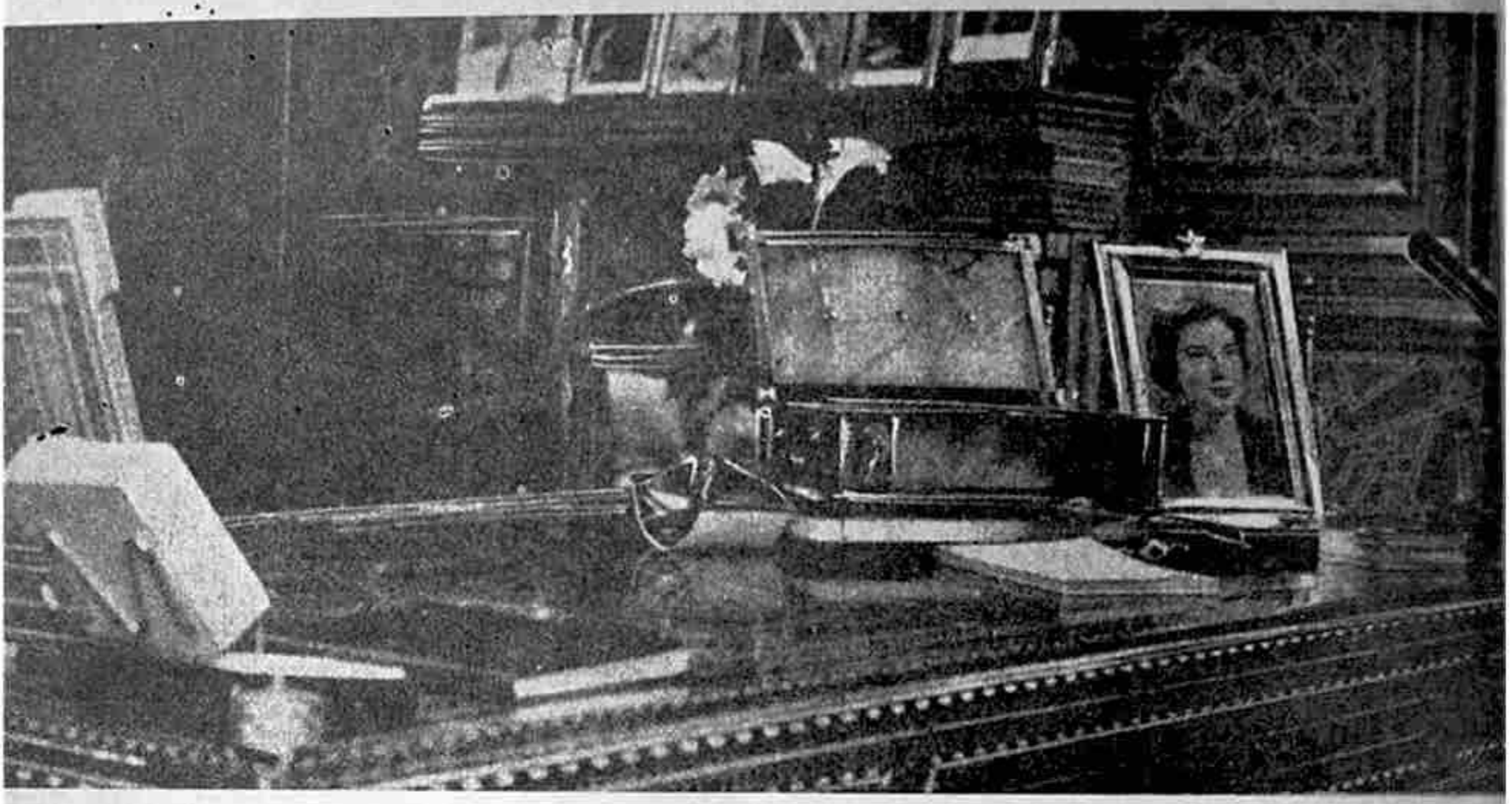

ثریا کو طلاق دینے کے بعد بھی شاہ ایران کے دارالمطالعہ میں ان کی میز پر سابق ملکہ ثریا کی تصویر رکھی رہتی تھی میز پر سے یہ تصویر تو بدل دی جائے گی لیکن شاہ ایران کے دل پر سے ثریا کی تصویر کون مٹا سکے گا؟

لباس کو سنبھالتی ہوئی بصد شان شہزادی شہناز کے ساتھ اس کی کار میں سوار ہوئی۔ راستے ہی میں کار کے گرد باوردی موٹر کار سواروں نے ہالہ کرلیا، اور لاکھوں کے تالیاں پیٹتے اور "مبارک" کہتے ہوئے سات میل لمبے ہجوم سے گزر کر وہ ایوان مرمریں تک پہنچ گئیں۔ یہاں پر مادر ملکہ، ان کی ہونے والی نند، شہزادی فاطمہ اور دوسری خواتین نے انہیں ہاتھ کا سہارا دے کر اُتارا۔ اور ایوان مرمریں کے خاص کمرے تک پہنچنے میں رہنمائی کی۔ اور ہاں لباس کے متعلق تو میں بتانا بھول ہی گئی۔ تمہیں تو ہلکے سے بندے بھی بھاری لگتے ہیں لیکن فرح کو دیکھئے جس کا لباسِ عروسی (زیورات کے علاوہ) کوئی ۱۳½ سیر کا تھا۔ جس کا اپنا وزن محض اکتالیس سیر ہو اس کے لئے اتنا وزن پہننا واقعی ہمت کا کام ہے۔ لیکن فرح تو شکل ہی سے باہمت لڑکی معلوم ہوتی ہے۔

اس نے کانوں میں جو زمردی بندے پہنے ہوئے تھے ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ دُنیا بھر میں بندوں کی سب سے قیمتی جوڑی ہیں۔ لباس عروسی سفید ساٹن کا تھا جس کے اوپر اُس نے بہت ہی خوبصورت زرنگار کوٹ پہن رکھا تھا۔

حجلہ عروسی میں داخل ہوتے ہوئے قد آدم شیشوں میں فرح نے اپنا سراپا دیکھ کر لباس اور بالوں وغیرہ کے درست ہونے کا جائزہ لے لیا اور وہ اس کمرے میں داخل ہوگئیں جہاں پر چاروں طرف آئینے لگے ہوئے تھے اور آئینوں کے ساتھ شمعیں روشن تھیں جنہیں ایران میں ہم لوگ جوڑے کی خوش نصیبی کی نشانی سمجھتے ہیں۔

ان کے داخل ہوتے ہی مادر ملکہ نے اسے گلاب کی صورت کا پانچ پونڈ وزنی زرنگار تاج پیش کیا جسے شہزادی فاطمہ نے اپنی ہونے والی بھابی کے ماتھے پر لگا دیا۔ فرح جائے نماز پر قبلہ رو ہو کر بیٹھ گئیں، جس کے پاس ہی ایک میز پر روٹی، چاول اور پھل رکھے تھے جو خوشحالی کی نشانی سمجھے جاتے ہیں اور انہیں کے قریب قرآن کریم کا ایک طلائی مجلد نسخہ تھا جس کے اوّلین حروف سونے میں مرصع تھے ـــــ اتنے میں تالیوں کی گونج میں ایران کے مجتہد اعلیٰ ڈاکٹر حسن امامی داخل ہوئے اور انہیں کے ساتھ فوجی کمانڈر انچیف کے لباس میں ملبوس شاہ ایران تھے۔ ڈاکٹر امامی نے بہ کمال تمکنت فرح سے ایجاب و قبول کروایا اور جب فرح نے تیسری بار "قبول ہے؟" کہنے پر "بلے" کہہ کر رضامندی ظاہر کردی تو قرآن پاک کی آیتیں پڑھتے ہی ان دونوں کے رشتۂ ازدواج میں بندھے جانے کا اعلان کردیا۔ اس پر ایک طرف سرکاری توپوں نے سلامی شروع کردی اور دوسری جانب مادر ملکہ نے چاول، سوکھے میوے (چھوہارے بھی اس میں شامل تھے) اور طلائی سکے فضا میں پھینکے جنہیں اٹھانے

سیاست اور محبّت

★ سیاست کے ستارے شاہ ایران کی قسمت پر ہمیشہ بھاری رہے ہیں۔ شاید یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ جب ۱۹۳۹ میں مصر کے شاہ فاروق کی بہن فوزیہ سے شادی ہوئی تو دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوگیا اور شاہ کو شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریوں کو بیچ ہی میں چھوڑ کر اپنے دور کی سب سے بڑی حکمت عملی کی جانب متوجہ ہونا پڑا جس کا مقصد مملکت ایران کے وجود کو ختم ہونے سے بچانا تھا۔

★ دوسری شادی ثریا کے ساتھ ۱۹۵۰ میں ہوئی۔ اسی کے ساتھ روس اور ایران کے تعلقات خراب ہوئے۔ ایران میں کمیونسٹ نواز مصدق حکومت نے شہنشاہیت ہی کے لئے نہیں بلکہ خود شاہ کی زندگی کے لئے خطرہ پیدا کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۵۳ میں شاہ اور ثریا دونوں کو باغیوں کے ہاتھوں جان بچانے کے لئے تہران چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

★ ثریا کی طلاق کے بعد حالات کچھ حد تک پھر معمول پر آگئے کہتے ہیں کہ ایران میں اتنی اچھی حالت پہلے کبھی نہیں ہوئی، جتنی کہ آج ہے۔ لیکن فرح سے نکاح کے ساتھ ہی ایران اور عراق کا تنازعہ آن کھڑا ہوا۔ عراقی ایرانی سرحد پر شط العرب دریا کے تین میل لمبے کلیدی علاقے پر عراق کے دعوے نے خطرناک جنگی صورت حال پیدا کر دی۔ ایک نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ اور فرح بحیرۂ کیسپین کے کنارے ہنی مون منانے جا رہے تھے۔ دوسرے ہی روز شاہ کو یہ پروگرام منسوخ کر کے تہران ہی میں رکنا پڑا، تاکہ بطور فوجی سالارِ اعظم کے ان مشکل حالات میں اپنی قوم کی رہنمائی کریں۔ اس طرح کمزور عقیدے والوں کا یہ کہنا شروع میں تو درست ہی معلوم ہوتا ہے کہ جمادی الثانی کا مہینہ شادی بیاہ کے لئے اچھا نہیں ہے لیکن زیادہ بڑا سوال یہ ہے کہ شاہ نے اپنی محبت کا جو پانسہ اس مرتبہ پھینکا ہے وہ بساطِ سیاست کے طاقتور مہروں کے سامنے ٹک بھی سکے گا یا نہیں

★ مستقبل کا پُراسرار مزاج ہی اس سوال کا جواب دے سکے گا جس سے دو اہم زندگیاں ہی نہیں بلکہ ایک پوری قوم کی تقدیر وابستہ ہے۔

کے لئے ملک کے معزز ترین مہمان جھپٹے۔ اور شاہ نے ہیروں سے مرصع ایک بڑی سی انگوٹھی (اندازاً قیمت: ڈیڑھ لاکھ روپے۔ ثریا کی عروسی انگوٹھی کی قیمت کا اندازہ دو لاکھ روپے تھا۔) فرح کے بائیں ہاتھ میں تیسری انگلی پر پہنادی اور فرح نے شرما کر کہا "اب تو میں آپ کی بیوی ہوں"۔ اس کے بعد یہ جوڑا کاخِ گلستاں کے بڑے ہال میں آگیا۔ جہاں پر ایک ہزار سے زائد مہمان جن میں غیر ملکوں کے سفیر اور سلطنت کے دوسرے بڑے لوگ شامل تھے۔ جوڑے کو مبارکباد دینے کے لئے منتظر تھے۔ اس شادی میں ایک خاص بات یہ تھی کہ جانوروں کی روایتی قربانی نہیں دی گئی کیوں کہ فرح کو "خون" سے وحشت ہوتی ہے۔ اس کی بجائے اس نے ایک سو پچاس بُلبل آزاد کر دیئے۔

شادی کی ایک اور خصوصیت یہ بھی تھی کہ دعوت میں شادی کے روایتی کیک کی بجائے ایک دس فٹ لمبی ایرانی نان رکھی گئی۔ جس پر رنگا رنگ کریم سے درج تھا "خدا تمہیں ولی عہد عطا کرے اور تمہارے دشمنوں کو ہمیشہ کے لئے اندھا کر دے"۔ جب ہم لوگ کھانے میں مصروف تھے تو باہر ہزاروں غربا کو اپنی زندگی کی سب سے مثالی دعوت دی جا رہی تھی جو سات روز تک جاری رہے گی۔ اور تہران میں رقص و سرود کے جشن کا یہ عالم تھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ پہلی دو شادیوں کو ملا کر بھی ایسا نہ ہوا ہوگا۔ اب تو ہر شخص یہی کہتا ہے کہ "اللہ ان کی مراد پوری کرے"۔

اب چند الفاظ اس ڈرامے کی پس پردہ ہیروئن ثریا کے متعلق بھی! عین اس روز وہ سوئٹزرلینڈ کے مشہور مقام لوزرن کے ایک شاندار ہوٹل میں مقیم تھی، جہاں اس نے ایک مشہور شاط کو اپنے بالوں کی نئی سیٹنگ کے لئے بلوایا ہوا تھا۔ اخباری نمائندوں کے پوچھنے پر اس نے محض اتنا کہا کہ وہ "اس شادی سے خوش ہے"۔

اس کے بعد وہ روم کے لئے روانہ ہوگئی جہاں پر اس نے اطالوی شاہی خاندان کے ایک وارث اور سینی کے ساتھ کرسمس گزاری۔ لوگوں نے تو یہاں تک کہنا شروع کر دیا ہے کہ وہ شہزادے سے شادی کرنے کے لئے اسلام سے رومن کیتھولک مذہب تبدیل کرے گی (رومن کیتھولک غیر مذہب والوں سے شادی نہیں کر سکتے) لیکن اس نے ان افواہوں کی تردید کر دی کہ اب بھی اس کے تعلقات اوریسینی کے ساتھ بہت گہرے ہیں۔ ادھر شاہ نے شاید اپنی شادی کا تحفہ ثریا کو یہ دیا ہے کہ اس کی ماہانہ پنشن میں اب چھبیس ہزار روپے کا اضافہ کر کے اسے تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے ماہوار کر دیا ہے۔

پہلے سفید بال

یہ کیا ہوگیا، کیا نظر ہوگئی
سرِ شام کیوں کر سحر ہوگئی

بس اے آئینے مجھ کو دھوکا نہ دے
نہ دے اِس طرح دل کو چرکا نہ دے

ابھی سے میں ہوتی کہن سال کیوں
بھلا ایسے ہوتے مرے بال کیوں

جوانی کا باقی ابھی دَور ہے
سفیدی نہیں یہ تو کچھ اور ہے

سنایا تھا نرگس نے جو اَب سے دُور
اسی گھر گئے کا ہے شاید فتور

ملیں گے کہاں اب مجھے ایسے بال
نہ جی میرا کیوں کر بھلا ہو نڈھال

کسی کو رہا خوف کالے کا کیا
بنے گا بھلا جال گالے کا کیا

جوانی پہ بالوں کا کیوں ہو اثر
سفیدی سیاہی پہ کیوں ہو نظر

اگر ولولے دل میں باقی رہیں
جواں کیوں نہ انسان کو ہم کہیں

مگر ہائے کب دل بہلتا ہے یوں
حقیقت عیاں ہے، میں کچھ بھی کہوں

نہ میں ہوں جواں اور نہ دل ہے جواں
جوانی گئی، اب جوانی کہاں؟

حامد اللہ افسر

خزاں میں بہار

علی عباس حسینی

شیخ علیم نماز عشا سے فارغ ہو کر، فرش پر بچھے ہوئے ایرانی قالین پر لیٹا بوعلی سینا کے "قانون" کا مطالعہ کر رہا تھا۔ سرھانے سلطان کا عطا کردہ تین شمعوں والا گنگا جمنی شمعدان روشن تھا۔ شمعوں کی روشنی اس کے چہرے اور سینے کی گرد ایک ہالہ سا بنا رہی تھی۔ اس کے سر کے چھوٹے چھوٹے بالوں کو ایک گول سیاہ مخملی ٹوپی نے چھپا رکھا تھا۔ اس کی چوڑی پیشانی چمک رہی تھی۔ اس کی پتلی لمبی ناک کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں نیم وا سی تھیں۔ جیسے وہ شیخ الرئیس کے کسی خاص نظریہ سے پُر زور اتفاق یا اختلاف رکھتا ہے اور اپنی رائے کی موافقت میں دلیلیں تلاش کر رہا ہے اس کے پتلے ہونٹوں پر کبھی کبھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ جاتی اور اس کا ایک ہاتھ گردن کو چھپائے ہوئے کھچڑی داڑھی کے بالوں کو سلجھانے لگتا تھا۔ اس نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی اور قالین پر کہنیاں ٹیک کر اٹھنے کا قصد کیا ہی تھا کہ دروازہ آہستہ سے کھلا اور اس کے ملازم موسیٰ نے اندر داخل ہو کر اطلاع دی "شہر کے تاجروں کا ایک وفد آیا ہے، جو شیخ سے اسی وقت ملنا چاہتا ہے۔"

شیخ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا "کوئی ایسا ضروری کام ہی ہوگا جو یہ لوگ اتنی رات گئے آئے ہیں۔ انہیں اندر بلا لو۔"

وفد پانچ اراکین پر مشتمل تھا۔ وہ اندر آئے۔ شیخ نے سر وقد تعظیم کی ہر ایک سے مصافحہ کیا اور انہیں اپنے پاس بٹھا کر ملازم کو قہوہ اور میوے لانے کا حکم دیا۔

جب وہ دروازہ بند کر کے باہر جا چکا تو انھوں نے پوچھا "آپ حضرات نے کیسے زحمت کی؟"

وفد کے ایک رکن نے جو جسامت اور لباس دونوں کے لحاظ سے ان کا قائد معلوم ہوتا تھا، اِدھر اُدھر سہمی ہوئی نظر ڈالی "جی ہم آپ کے پاس فریاد لے کر آئے ہیں، مگر ڈرتے ہیں کہ ....."

شیخ نے کہا "آپ اطمینان سے اپنا مقصد بیان کریں۔ میرا ملازم میرا معتمد ہے، اس کمرے کی گفتگو کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی!"

دوسرے نمائندے نے پہلے کی بات دہرائی "جی اب ہم آپس میں بھی گفتگو کرتے ڈرنے لگے ہیں۔ اسی کی تو فریاد لے کر آئے ہیں!"

شیخ نے کہا "تو ایسی فریاد کا سُننے والا تو صرف خدا ہے، یا کسی حد تک ملک کا بادشاہ!"

تیسرے نے عرض کیا "بادشاہ تک اپنی فریاد پہنچانے ہی کی غرض سے تو ہم آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں۔"

شیخ نے سر ہلا کر کہا "جی اس کے لئے حکومت کی طرف سے افسر مقرر ہیں، پرچہ نویس، عرائض نویس، مُنشی، متصدی، وزرا!"

چوتھے نے جلدی سے کہا "قبلہ! انہیں افسروں کے مظالم کے خلاف تو فریاد ہے۔ وہ بھلا اپنے ظلم و ستم کی داستان بادشاہ کے کانوں تک کیوں پہنچنے دیں گے!"

شیخ کی آنکھیں چمک اٹھیں، اس کی آواز میں جھنجلاہٹ کی جھنکار سی پیدا ہوگئی۔ "جی، بادشاہ کی اتالیقی کا مجھے دس برس شرف حاصل رہا ہے۔ میں اس کے مزاج اور

طبیعت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ بڑا کریم النفس اور رعیت پرور ہے وہ یقینی اپنے عاملوں کے کرتوتوں سے بے خبر نہ ہوگا!"

پانچویں نے دست بستہ التماس کی "وہ اگر باخبر ہے تو وہ ظلم کی سرپرستی کرتا ہے اور اگر وہ بے خبر ہے تو اسے ہوشیار کرنا آپ کا فرض ہے!"

شیخ نے قدرے خشک لہجے میں کہا "جی، میں اپنی ذمہ داریاں اچھی طرح سمجھتا ہوں، مگر مجھے اپنے بادشاہ سے تعجب ضرور ہے کہ وہ دو برس کے اندر ساری تعلیمات کو بھول کر اپنے فرائض سے غافل ہوگیا!"

پہلے نے ہنس کر کہا "جی ظل اللہ جوان بھی تو ہیں، اور جوانی دیوانی آپ نے سنا ہی ہے!" اور وہ کھی کھی کر کے اس طرح ہنسا کہ اس کی توند ہلنے لگی۔

دوسرے نے خالی لمحوں کو بیکار نہ جانے دیا۔ وہ بولا "وہ اس وقت بادشاہ نہیں، عاشق ہیں۔ ہم تن فرہاد و مجنوں!" اور اس نے اپنی پھیکی ہنسی بھی پہلے قہقہے میں شریک کر دی۔

شیخ نے بھی مسکرا کر پوچھا "اور لیلیٰ کون ہے؟"

تیسرا بولا "حکومت کے راز بادشاہ ہی جانے، لیکن اڑتی ہوئی خبر ہے...."

چوتھے نے بات کاٹی "اڑتی ہوئی کیوں؟ مصدّق کہئے مصدّق!"

شیخ نے کہا "ہاں، تو وہ آپکی مصدّق اطلاع کیا ہے؟ کس شیریں نے ہمارے خسرو کو اپنا اس درجہ والہ و شیدا بنا رکھا ہے کہ وہ فرائض منصبی بھول گیا؟"

پہلے نے قیادت کا حق ادا کیا، جواب میں سبقت کی "سنا ہے قاف کی رہنے والی کوئی کنیز ہے، گلگونہ نام...."

وہ دم لینے کے لئے زرا رکا تو دوسرے نے بات کا سلسلہ نہ ٹوٹنے دیا۔ "خوبصورتی میں چاند سورج کو ماند کرتی ہے...."

تیسرے نے جھوم کر اضافہ کیا "عورتیں کہتی ہیں نور کا گلا پایا ہے، حضرت داؤد کی خوشنوائی کی داستان کانوں کان سنی تھی، اس کی خوش گلوئی اپنے کانوں سنی...."

چوتھے نے ٹکڑا لگایا "بلبل ہزار داستان کی طرح آواز میں شیرینی ہے...."

پانچویں نے اپنی دانست میں نئی تشبیہ پیش کی "اور دلوں میں گونجنے والی کوئل جیسی لے!"

پہلے نے سانس برابر کر لی تھی، اس لئے غزل تمام کرنے کی کوشش کی "اور پپیہے جیسی بادشاہ کو اپنی آغوش میں بلانے والی تانیں!"

دوسرے کا جی نہ بھرا، اس نے دو غزلہ چھیڑ دیا "اور سنا ہے کہ وہ تلوار کی دھار پر ناچتی ہے!...."

تیسرے نے مصرعہ لگایا "جی نہیں، وہ سلطان کے دل کے تار پر رقص کرتی ہے...."

چوتھے نے دوسرے شعر کا آغاز کیا "اور ہمارا بادشاہ اس گل کے گرد بھونرے کی طرح گھومتا ہے، اس کے اشاروں پر ناچتا ہے...."

پانچویں نے غزل سرائی ختم کرنا چاہی "اور اُسی کے گلستانِ آغوش میں کھو جاتا ہے۔"
لیکن قائد نے مقطع والی بات کہہ کر نظم یوں تمام کی "سلطان اسی گلگونہ کی نرم و نازک باہوں پر تکیہ کئے، حکومت و رعیت سے غافل رات دن سوتا رہتا ہے! اُس کے ہاں ہر وقت بہار ہی بہار ہے اور ملک میں خزاں ہی خزاں!"

شیخ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے تالی بجائی۔ ملازم دو خوانوں میں خشک و تازہ میوے اور قہوہ لاکر رکھ گیا۔ جب مہمانوں کی ضیافت سے فراغت ہوئی تو شیخ نے کھڑے ہو کر کہا "اب آپ حضرات تشریف لے جائیں۔ میں شب میں خدا سے اپنی ہدایت کی دعا کروں گا۔ ممکن ہے کہ سب کا فریادرس اس گتھی کے سلجھانے کا کوئی طریقہ مجھے سجھا دے!"

وفد کے جانے کے بعد شیخ نے تھوڑی دیر آرام کیا، پھر نماز تہجد میں مشغول رہا۔ صبح کو وہ نماز اور مقررہ وظائف سے جلدی سے فراغت کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا درباری لباس پہنکر مجلسرا میں حاضر ہوا۔ پہرے کے سپاہی دربان و حاجب سب ہی اسے پہچانتے تھے۔ وہ بادشاہ کا استاد تھا۔ اس کے آنے کی اطلاع نیم بیدار بادشاہ تک فوراً پہنچا دی گئی۔ سلطان نے دو برس کے بعد استاد کے اچانک تشریف لانے کی جو خبر پائی تو گھبرا گیا۔ اس نے نہ غسل کیا نہ لباس فاخرہ پہنا، بس شب خوابی کے کپڑوں پر ایک مخملی لبادہ ڈال کر نکل آیا۔ اس نے شیخ کے سلام کو اس سے بھی زیادہ جھک کر قبول کیا اور اس کے ہاتھ لیکر آنکھوں سے لگائے اور انہیں بوسہ دیا۔

شیخ نے اس کی سعادت کو سراہا، ترقی اقبال و سلطنت و عمر کی دعائیں دیں اور خاموش ہو رہا۔

سلطان نے گھبرا کر پوچھا "قبلۂ عالم نے اتنے سویرے کیسے زحمت کی؟"

شیخ نے مسکرا کر کہا "آج میں اپنے سلطان سے اپنا حقِ استادی مانگنے آیا ہوں!"

بادشاہ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا کر کہا "میں دل و جان سے حاضر ہوں! میری پوری سلطنت حاضر ہے۔ اس لئے کہ آپ نے مجھے وہ دولتِ علم عطا کی ہے۔ جس کی قیمت دنیا کی بڑی سے بڑی سلطنت بھی نہیں ادا کر سکتی!"

شیخ نے مسکرا کر کہا "نہیں، سلطنت آپکو مبارک! وہ آپ کے لئے بنی ہے اور آپ اس کے لئے۔ مجھے تو ایک رفیقہ چاہیے۔ میری حیات کی ایک شریک۔ میں نے پورا شباب آپکی خدمت اور تعلیم میں صرف کر دیا، مگر اب جبکہ وہ کام انجام پا چکا ہے تو مجھے تنہائی محسوس ہوتی ہے ...."

سلطان نے کہا "تو اس مملکت کی جس شہزادی، امیرزادی سے آپ پسند فرمائیں ...."

شیخ نے ہاتھ کے اشارے سے شاگرد کو روکا "نہیں، مجھے تو ظلّ اللہ کی مجلسرا سے صرف ایک کنیز چاہیئے!"

بادشاہ نے جوش سے کہا "حرم سرا میں ایک ہزار سے زاید کنیزیں موجود ہیں۔ آپ جسے پسند فرمائیں وہ حاضر کی جائے!"

شیخ نے سلطان کو بہ نظر تشکر دیکھ کر کہا "مجھے اپنے بادشاہ سے یہی امید تھی! حکم دیدیا جائے کہ گلگونہ میرے ساتھ کر دی جائے!"

بادشاہ نے استعجاب و اضطراب سے پوچھا "گل؟ .... گل .... گونہ؟"

آواز حلق سے پھنسی پھنسی سی نکلی۔

شیخ نے ایک انجان کی سی سادگی سے کہا "جی ہاں سنا ہے کہ وہ موسیقی کی ماہر ہے۔ مجھے بھی تو سماع سے شوق ہے!"

بادشاہ نے دو بار کانپتے ہونٹوں پر زبان پھرائی۔ پیشانی سے پسینہ پونچھا اور گھٹی آواز میں کہا "بہت خوب!"

شیخ نے پھر دعائیں دیں اور کہا "تو پھر حکم صادر فرما دیا جائے۔"

بادشاہ نے تالی بجائی۔ حبشی غلام حاضر ہوا۔ اس نے حکم دیا "گلگونہ کو میں نے آج سے استاد محترم کی کنیزی میں دیدیا، اسے عزت و احترام سے آپ کے دولتکدے پر پہنچا دو" وہ سلام کر کے پیچھے ہٹنے لگا تو سلطان نے کہا "اور دیکھو اس کے محل کا سارا سامان بھی اونٹوں، خچروں، ٹھیلوں پر لاد کر وہیں پہنچا دینا۔"

شیخ نے کہا "میں ظلّ اللہ کی اجازت سے حکم کے اس آخری جزو میں ترمیم کا طالب ہوں۔ گلگونہ کا سارا سامان صدر الصدور کی خدمت میں ارسال کر دیا جائے تاکہ وہ بیواؤں اور یتیموں میں تقسیم کر دیا جائے!"

بادشاہ نے بھرائی آواز میں کہا "مجھے اس پر فخر ہے کہ مجھے اخلاق کی تعلیم آپ جیسے مرد سخی نے دی ہے!"

شیخ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اور سر جھکا کر بادشاہ کا شکریہ ادا کیا۔ سلطان نے درد سے مسکرا کر پوچھا "لیکن اس کے رقص و نغمہ کے ساز و سامان؟"

شیخ نے کہا "ظل اللہ، ان کی بھی ضرورت نہیں! اب گلگونہ نئے ساز پر گائے گی!"

حبشی کے جاتے ہی شیخ نے زحمت دہی کی معافی چاہی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سلطان نے استاد کے ہاتھوں کو بوسہ دیکر پوچھا "کوئی اور خدمت؟"

وہ بولا "نہیں، مجھے میرا حق مل گیا!"

نوجوان بادشاہ نے گلگونہ کو دے تو ڈالا، مگر اس کی جان پر بن گئی۔ اس کے دل میں غموں کا جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا، چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا، ہاتھ پاؤں بے قابو سے ہو رہے تھے۔ وہ شیخ کے سامنے سیدھا کھڑا تو ہو گیا مگر وہ سارے جسم سے

کانپنے لگا۔ شیخ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "میرے بیٹے، مجنوں و فرہاد بننا آسان ہے، مگر بادشاہ بننا بہت مشکل ہے! اس کے لئے ایک کی جگہ کروڑوں سے محبت کرنا ضروری ہے!" اور وہ متانت سے قدم رکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ اور نوجوان بادشاہ لبِ فرش تک استاد کو پہنچا کر پلٹا اور مسند پر جھوم کر گرا اور سسکنے لگا۔

شیخ کو گھر پر ایک بپھری ہوئی شیرنی سے مقابلہ کرنا پڑا، وہ اپنی بوٹیاں نوچ رہی تھی اور شیخ کے ملازموں پر بجلیاں گرا رہی تھی۔ وہ بادشاہ کی محبوبہ تھی، وہ محل کی رانی تھی، اس کے ابرو کے اشاروں پر سلطنت کا نظم و نسق درہم برہم ہوتا تھا۔ اس کے زبان ہلانے پر بے قصوروں کو پھانسی دی جاتی تھی اور مجرموں کو خون معاف کیا جاتا۔ اس کی خوشی کے لئے جاگیریں عطا ہوتیں، اس کی چتون پر بل آتے ہی خاندانی امرا خائماں برباد کر دئے جاتے تھے۔ وہ جدھر جاتی نظریں بچھائی جاتیں۔ کنیزیں آگے پیچھے دوڑتیں، شہزادیاں مجرے کے لئے کھڑی رہتیں، اور آج وہ اپنے سجے سجائے محل سے اٹھا کر مویشی کی طرح اس مختصر سادے کمرے یا باڑے میں پہنچا دی گئی تھی! نہ یہاں جھاڑ فانوس تھے، نہ قاقم و سنجاب کے پردے، نہ جواہرات جڑے ہوئے ظروف، نہ سونے کی پلنگڑی، نہ حریر و دیبا کے گدّے۔ غیر منقش چھت، بے تصویر کی ننگی دیواریں، ناہموار فرش پر موٹی سی چٹائی۔ بس ایک کونے میں ایک ایرانی قالین۔ گلگونہ کو اس کی ایک ایک چیز کاٹے کھاتی تھی۔ اس لئے اور بھی کہ وہ کنیز تھی، ایک غریب کسان کی لڑکی۔ جس کے گھر میں اتنا سامان بھی نہ تھا جتنا اس سادگی میں یہاں موجود تھا۔ وہ قزاقوں کے ہاتھ گرفتار ہو کر بازار میں بیچی گئی، سلطان کے سامنے پیش کرنے کے لئے اسے موسیقی اور رقص کی تعلیم دی گئی، اور اپنی خوش گلوئی اور خوش ادائی کی بدولت وہ شاہی گردن کا ہار بنی۔ اس کا غصہ اور اس کی جھلاہٹ اس لئے رہ رہ کر بھڑک اٹھتی کہ وہ جس ابتدا کو بھول چکی تھی، وہ پھر شیخ کے ہاتھوں نظروں کے سامنے تھی۔ خاندانی نہ عروج پر اُبلتا ہے، نہ زوال پر بسورتا ہے، وہ جانتا ہے یہ دنیا کے نشیب و فراز ہیں، مگر نو دولتا چھوٹی ہانڈی ہے، جلد ہی ابلتا بھی ہے جلد ہی بیٹھ بھی جاتا ہے۔

گلگونہ اس لئے آپے سے باہر تھی، اس نے غصے میں قمیص کا گریبان اس طرح نوچا تھا کہ ہیرے کے بٹن فرش پر بکھر گئے تھے۔ دوپٹہ دھجیاں بنا ایک گوشے میں پڑا تھا اور وہ اب کمرے کی ہر شے پر قہر کی نظریں ڈال رہی کہ کیا توڑے کیا پھاڑے۔ شیخ اسی وقت اندر داخل ہوا۔ بے مقنع و چادر، پھٹی ہوئی قمیص میں اس نے مجاز میں وہ جلوہ دیکھا کہ آنکھیں خیرہ کرنے لگیں۔ اس نے اپنے دھڑکتے دل کو قابو میں لانے کے لئے داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور کھانس کر گلگونہ کو مخاطب کرنے کی کوشش کی۔

گلگونہ نے شیخ پر سر سے پاؤں تک نظر ڈالی۔ سوکھا چہرہ، لاغر جسم، چالیس پینتالیس برس کا مرد، سر پر عمامہ، سپید قبا پر کالی عبا، لمبی ناک، لمبا ڈیل، کھچڑی داڑھی، پوری صورت میں سوائے دو بڑی بڑی چمکتی آنکھوں کے کوئی جذبہ نہیں۔ گلگونہ نے لمبی لمبی سانسیں لے کر کہا "یہ آپ ہی کی کارستانی ہے کہ میں فلسرا سے نکال کر اس پاپوش خانے میں بھیجی گئی؟"

شیخ نے کہا "نہیں، اس میں مجھ سے زیادہ کاتبِ تقدیر کو دخل ہے! اور ہی جھونپڑے سے نکال کر محل میں لے گیا، اسی نے شاہی محل سے ایک درویش کے گھر بھجوا دیا!"

گلگونہ غصے میں تھرا کر اکڑوں بیٹھ گئی۔ اس نے دونو گھٹنوں پر سر رکھ لیا۔ "مگر میرے معاملے میں تو کاتبِ تقدیر آپ ہی بنے! نہ جانے میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا!"

شیخ نے کہا "تم اپنی ہی نہیں، سارے ملک کی قسمت بگاڑ رہی تھیں۔ میں تمہیں ایک بُری زندگی سے نکال کر ایک اچھی زندگی کی طرف لایا ہوں!"

اس نے سر اٹھا کر طنز سے پوچھا "آخر میرے حال پر یہ کرم خاص کیوں؟"

شیخ نے مسکرا کر کہا "اس لئے کہ تم اس ملک کی سب سے بڑی حسینہ ہو!"

اس نے پھر طنز سے کہا "تو خیر سے آپ حسن و جمال کے پرکھنے کی تمیز بھی رکھتے ہیں!"

شیخ نے بڑی متانت سے کہا "میں نے ساری عمر جمال ہی کی تلاش میں صرف کی ہے!"

اس نے پھر وار کیا "اور اس ساری عمر کی تلاش کے بعد آپ کو نظر آئی تو میں ہی!" مگر لہجے میں اب تلخی کم تھی۔

شیخ نے پھر مسکرا کر کہا "ہاں، مجاز میں تو تم کسی حد تک اس جمال کا نمونہ کہی جا سکتی ہو، مگر ابھی بڑا نقص ہے، جیسا ظاہر ہے ویسا باطن نہیں!"

گلگونہ بولی "مجھے پہیلیاں بوجھنے کا دماغ نہیں!"

شیخ نے کہا "دماغ تو ہے، مگر دھیان دینے کی خود پرستی اجازت نہیں دیتی!"

گلگونہ جھلا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ دانت پیس کر بولی "خود پرستی! خود پرستی! سُوپ کو ہنسے چھلنی جس میں بہتّر چھید! یہ آپ کی خود پرستی و نفس پرستی نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ نے بادشاہ سے اس کی چہیتی کنیز اور مجھ سے دولت و ثروت، عیش و نشاط کی زندگی چھین لی، تاکہ آپ اپنے کرم خوردہ، خشک و بے آب جسم کو میرے لمس کی حرارت سے تر و تازہ بنائیں!" اور اس نے جھٹکا دے کر قمیص کے چاک کو بڑھا دیا۔ شیخ نے نظریں نیچی کر لیں۔ وہ آہستہ آہستہ بولا "تم نے میری غرض غلط سمجھی۔ میرا مقصد واقعی رعیت کی، بادشاہ کی اور تمہاری بھلائی ہے۔ خیر، میں تمہارے لئے بازار سے کچھ سلے سلائے کپڑے لایا ہوں وہ خادمہ سے بھیج دیتا ہوں، مونہہ ہاتھ دھو ڈالو، کپڑے بدل لو، پھر تھوڑا آرام کر کے مجھ سے گفتگو کرنا۔" وہ دروازے میں سے نکلتے نکلتے پھر بولا "دو چار دن میں تم مجھے پہچان لو گی۔ میں برابر تمہارے لئے توفیقِ نیک کی دعا کرتا رہوں گا!۔۔۔۔ اور سنو! یہ جو ہیرے کے بٹن ہیں انہیں بھی صدر الصدور کے پاس بطور صدقہ بھجوا دو!"

دو گھنٹے بعد وہ اپنے کمرے میں بیٹھا تفسیر کا مطالعہ کر رہا تھا کہ وہ دروازے کو تڑاق پھڑاق کھولتی بند کرتی، بڑبڑاتی داخل ہوئی "میں اس بالشت بھر کے گھر میں کہاں جاؤں، کہاں گھوموں پھروں، کس سے باتیں کروں؟ مجھے تو اس میں قبر جیسی تنہائی محسوس ہوتی ہے!"

شیخ نے اپنے پہلو میں قالین تھپک کر کہا "آؤ، میرے پاس بیٹھو" اور اس نے مصری لحن سے چند آیتیں پڑھیں۔ پھر گلگونہ سے پوچھا "تم قرأت جانتی ہو؟" اس نے نفی میں سر ہلایا تو اسے مخارج بتاتا اور ان کی مشق کراتا رہا۔ موسیقی سے واقف ہونے کی وجہ سے گلگونہ کو اس فن کے سیکھنے میں بڑا لطف آیا۔ وہ اپنا غم بھول گئی۔ جب وہ اس مشق سے تھک چلی تو شیخ نے اس کے سر پر چادر ڈال کر تالی بجائی۔ غلام کشتی میں انگور و انار، اور ایک کیتلی میں چائے اور دو استکان لا کر رکھ گیا۔ شیخ نے ایک میزبان کی طرح اصرار کر کے اسے میوے بھی کھلائے اور چائے بھی پلائی۔ پھر کہا "معاف کرنا، میں نے ابھی عصر نہیں پڑھی ہے۔ اب میں آٹھ بجے کھانے پر ملوں گا!"

اور جب وہ گردن جھکائے اپنے کمرے کی طرف چلی، تو شیخ نے مسکرا کر کہا "تم اپنا دل بہلانے کو باورچن کو بلا لو۔ اس کے ساتھ جا کر گھر کے سارے اسباب کا جائزہ لے ڈالو۔ کیا چیز ہے، کیا نہیں ہے، کیا کیا ہونا چاہئے، کیا کیا منگانا ہے، ان سب کی فہرست بنا ڈالو۔ تمہیں کو اب اس گھر کا انتظام کرنا ہے، تمہیں اس کی مالکہ ہو!" اور اس نے اس کے ہاتھ میں اشرفیوں کی ایک تھیلی دیدی۔ گلگونہ نے بند مٹھی دانت کے نیچے دبا کر کہا "مگر میں نے تو آج تک کسی گھر کا انتظام نہیں کیا، میں کیا جانوں؟"

شیخ نرمی سے بولا "تو تم نے عورت کا سب سے بڑا فرض ابتک ادا نہیں کیا۔ خیر جاؤ آج سے بسم اللہ کرو۔ کرنے ہی سے سب کچھ آجاتا ہے" اور وہ مصلے پر کھڑا ہو گیا۔

اور یونہی دن گزرنے لگے۔ شیخ کبھی گلگونہ کے ساتھ چائے پی لیتا، کبھی کھانا کھا لیتا، کبھی اس سے خدا اور رسول کی باتیں کرتا، کبھی اسے تفسیر سناتا، کبھی حدیثوں کے معنی و مطلب بیان کرتا اور کبھی اس سے مصری و عراقی لہجوں میں تلاوت کرا کے اس کی قرأت درست کرتا۔ لیکن پہلے دن کے بعد اس نے کبھی نہ تو اس کے حسن کی تعریف کی، نہ اسے یاد دلایا کہ وہ اس کی کنیز ہے اور وہ اس کا آقا اور نہ کسی موقع پر اپنے حقوق جتلائے۔ ان دونوں کے درمیان استاد و شاگرد کا رشتہ تھا یا مالک مکان اور گھر کی منتظمہ کا اور بس۔

شیخ کی اس بے پروائی سے گلگونہ کے اندر والی عورت جاگ پڑی، اسے ایک زاہد خشک کا اپنی جنس کی طرف سے یوں بے حس ہونا اپنی پوری صنف کی توہین محسوس ہوئی۔ اس کی خودی مجروح ہوئی اور وہ شیخ میں سوئے ہوئے مرد کو جگانے پر آمادہ ہو گئی۔ اب وہ جب بھی شیخ کے پہلو میں بیٹھتی تو دو ایک بار اس کے خشک و سرد ہاتھوں پر اپنا نرم و گرم ہاتھ ضرور رکھ دیتی۔ وہ اس طرح اس کے قریب آ کر بیٹھتی کہ جسم سے جسم ضرور مس ہو جاتا۔ اور اب وہ جب بھی نیا لباس بدلتی تو شیخ کے کمرے میں کسی نہ کسی بہانے سے آ کر ضرور ہو جاتی۔ اور آتی تو گنگناتی ہوئی آتی اور جاتی تو گنگناتی ہوئی جاتی۔

شیخ کوئی پتھر نہ تھا، انسان تھا۔ اس نے اپنی جنس کو اپنی کتابوں میں بھلا رکھا تھا، مگر اس روز روز کے وار نے اس کی سپر کو کاٹنا شروع کر دیا۔ اس کی زرہ کی زنجیریں ٹوٹنے لگیں۔ اس کو گلگونہ کی شرارتوں پر جتنا پیار آتا، اتنا ہی اس کا غصہ بڑھنے لگا۔

ایک دن شیخ اپنے دار المطالعہ میں بیٹھا کتاب بند کئے اپنے ہاں جذبے اور عقل کی جنگ پر غور کر رہا تھا کہ اس کے کانوں میں خلخال کی آواز آئی۔ اس جھن جھن میں کچھ ایسی دلکشی تھی کہ وہ بیساختہ اس پردے کو دیکھنے لگا جو اس کے اور گلگونہ کے کمرے کے درمیانی دروازے پر پڑا تھا۔ وہ اسی طرح دیکھ رہا تھا کہ پردہ ہٹا اور گلگونہ ایک تتلی کی سبکی سے ناچتی اس کمرے میں داخل ہوئی وہ نیم عریاں تھی۔ جو لباس جسم پر تھا وہ اتنا باریک اور نازک تھا کہ جسم کا رویاں رویاں دکھائی دیتا تھا۔ لباس نہ تھا، گویا فانوس تھا کہ ایک جلتی شمع کو آغوش میں لئے ہوئے تھا۔ اس کے پاؤں پھرکی کی تیزی سے چل رہے تھے اور اس کی پور پور حسن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی دعوت نظارہ دے رہی تھی۔

شیخ کے دل میں وہی تھرتھراہٹ پیدا ہو گئی جو نسیم کے جھونکوں سے وقت سحر گلوں کی کھلتی پنکھڑیوں میں دکھائی دیتی ہے۔ شیخ نے گھبرا کر آنکھیں جھکا لیں۔ اس کی زبان پر بیساختہ وہ آیت جاری ہو گئی جو بجلی چمکتے وقت تلاوت کرنے کا حکم ہے۔ پھر اسے اچانک یہ محسوس ہوا جیسے سارے جسم کا خون تیزی سے سر کی جانب چڑھتا چلا جا رہا ہے۔ کنپٹیاں دھکنے لگیں، تالو چٹخنے لگا۔ سانس لینے میں دقت ہونے لگی۔ وہ دفعتہً گرج اٹھا "تم کو میرے کمرے میں اس طرح ناچتے ہوئے آنے کی کس نے اجازت دی؟"

گویا بجلی گرانے والی پر بجلی گری۔ گلگونہ کچھ لمحے تو بت بنی کھڑی رہی، پھر سسکتی ہوئی اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔

شیخ کو فوراً محسوس ہوا کہ اس نے گلگونہ کے ساتھ ناروا سلوک کیا۔ اپنے بے قابو نفس پر آنیوالا غصہ اس حسینہ دلنواز پر بیجا اتارا۔ وہ اپنے اس ظلم پر منفعل و شرمسار اپنی جگہ سے اٹھا۔ قصد تھا کہ گلگونہ سے چل کر ابھی معافی مانگے۔ اس نے تیزی سے قدم بڑھا کر پردہ ہٹایا، بیچ کے دروازے کے دونوں پٹ کھلے تھے۔ سامنے ہی گلگونہ نظر آئی وہ سسکتی جاتی تھی، اپنے کپڑے نوچ کر پھینکتی جاتی تھی اور پاؤں پٹکتی جاتی تھی۔ گھنگھرو اب بھی پاؤں میں بندھے تھے اور جسم کی غیر شعوری حرکت میں رقص کا پورا کیف تھا۔ شیخ کا عزم پائمال ہونے لگا۔ اس کے قدم رکنے لگے۔ اسے اپنے جسم میں جلتی چنگاریاں سی اڑتی محسوس ہونے لگیں۔ وہ اس نئی کیفیت سے اور بھی گھبرا اٹھا۔ حسب عادت اس کا ایک ہاتھ داڑھی کے بالوں تک پہنچ گیا۔ خشک انگلیوں میں ان سوکھے تاروں کی رگڑ نے جیسے اسے

جگا دیا۔ وہ چونک اٹھا، اس نے اپنے نفس کو ملامت کی اور وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتا اپنے کمرے میں پلٹ آیا اور فلسفہ کا ایک نہایت ہی پیچیدہ مسئلہ حل کرنے میں مشغول ہو گیا۔

دو گھنٹے بعد اس نے گلگونہ کو آواز دی۔ جب وہ سر جھکائے آئی تو شیخ نے اظہار ندامت کرتے ہوئے کہا "تم میرے سامنے نیم برہنہ ناچتی چلی آئیں، اس میں تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں تمہارا آقا اور تم میری کنیز ہو۔ لیکن تمہارا یہ فعل میری اجازت کے بغیر تھا، اس لئے مجھے غصہ آگیا۔ اور میرے مشرب میں غصہ حرام ہے۔ اس لئے میں نے اپنے کو خود سزا دی۔ میں تین روزے بطور کفارے کے رکھوں گا!"

ابتدائے گفتگو میں جو گلگونہ کی آس بندھی تھی وہ ختم کلام پر ٹوٹ گئی۔ اپنی شکست کا احساس اس کے ہاں تیز تر ہو گیا۔ وہ عورت تھی، جو کبھی اپنی شکست نہیں مانتی۔ اسلئے اس نے پرانے حربے بدل ڈالے۔ اس نے روزوں میں بھی شیخ کا ساتھ دیا اور وہ پنج وقتہ اس کے پیچھے آکر نماز بھی پڑھنے لگی۔ اس نے شیخ سے پوچھ پوچھ کر اس کے سارے اوراد و وظائف بھی یاد کر ڈالے اور وہ صبح شام انہیں جھوم جھوم کر خوش گلوئی سے پڑھنے لگی۔ ریاضت و عبادت کی اس رفاقت نے شیخ کی جنسی آگ کو اور بھڑکایا۔ زاہد زاہدہ کو چھپ چھپ کر للچائی نظروں سے دیکھنے لگا۔ مگر جب بھی نفس کا شیطان اسے حد سے زیادہ ستاتا، وہ روزوں کی تعداد میں زیادتی کر دیتا۔ نمازیں بڑھا دیتا، تلاوت کے گھنٹوں میں اضافہ کر دیتا۔ لیکن جذبے اور عقل کی اس کشمکش میں اس سے تصنیف و تالیف کا کوئی کام نہ بن پڑتا۔ گلگونہ کے علاوہ کسی موضوع پر دماغ غور و فکر کے لئے تیار نہ تھا۔

ادھر گلگونہ نے بھی اپنا رنگ روپ کھونا شروع کر دیا۔ روزوں پر روزے، نمازوں پر نمازیں روح کی طاقت کو جتنا بھی بڑھائیں جسم سے ساری حیوانی کشش چھین لیتی ہیں۔ گلگونہ کے گلابی گال اب کندنی بن گئے تھے۔ ہونٹوں سے تازگی، آنکھوں کا نشیلا پن غائب ہونے لگا تھا۔ اسے یہ احساس مارے ڈالتا تھا کہ جس کے کارن یہ سارے پاپڑ بیلے وہ اب بھی بے پروا ہے ایک دن وہ اپنے کمرے میں جانماز پر بیٹھی ہاتھ اٹھائے احسن الخالقین سے یہی شکایت کر رہی تھی اور اس کے گال آنسوؤں سے تر تھے کہ شیخ کسی کام سے اندر داخل ہوا۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دل پر آرے چلنے لگے۔ وہ جھٹپٹا ہوا اپنے کمرے میں آیا۔ اس نے درباری لباس پہنا اور وہ شاہی محل کی طرف لپکتا ہوا روانہ ہو گیا۔

سلطان کی خدمت میں وہ اسی طرح ایک حد تک بدحواس باریاب ہوا۔ حسب معمول مصافحے اور معانقے کے بعد سلطان نے خیریت مزاج پوچھنے کے بعد دریافت کیا "کیسے سرفراز فرمایا؟"

شیخ نے کہا "جو کنیز ظل اللہ سے مانگ کر لے گیا تھا اسے پلٹانے آیا ہوں"

سلطان نے کہا "آپ ہی کی تعلیم ہے کہ بادشاہ دی ہوئی چیز واپس نہیں لیتا"

شیخ نے کہا "مگر میں نے یہ چیز عاریتاً لی تھی، محض اپنے سلطان کو سلطنت کی حالت کی طرف متوجہ کرنے کے لئے۔ وہ ایک پردہ تھی جس کا ہٹانا ضروری تھا"

سلطان نے مسکرا کر پوچھا "اور جو وہ واپس ہو کر پھر پردہ بن جائے؟"

شیخ نے کہا "مجھے سلطان پر اعتماد ہے کہ وہ کروڑوں کا دلدار بننے کے فوائد سے آگاہ ہو کر پھر صرف ایک کا ہو کر نہ رہے گا"

سلطان نے کہا "آپ کچھ اس سے بیزار سے معلوم ہوتے ہیں"

شیخ نے سر جھکا کر کہا "ہاں، جو شاہ کی امانت میں خیانت کی رغبت دلائے اس سے بیزاری ضروری ہے"

سلطان نے مسکرا کر پوچھا "تو آپ نے امانت کو امانت کی طرح رکھا؟"

شیخ نے سر جھکا کر کہا "یہ ظل اللہ اس سے بھی دریافت کر سکتے ہیں"

بادشاہ نے کہا "اچھا، تو آپ اسے آج شام یہاں بھیجدیں۔ مگر واپس لیجئے مسئلہ اس سے گفتگو کے بعد ہی طے ہو گا!"

اور اسی دن شام کو جب گلگونہ اپنے پچھلے محل سرا میں آئی تو ایک خواص زرنگار خلعت لائی کہ اسے زیب جسم کیجئے۔ سلطان بہ نفس نفیس شب میں تشریف لائیں گے اور آپ کا رقص دیکھیں گے۔

اور سلطان آیا اور گلگونہ نے اسے اپنے رقص سے اس قدر مسرور کیا کہ اس نے اس شعلۂ جوالہ کو اپنے قریب بلا کر کہا "مانگ، کیا مانگتی ہے، کنیز خاص!" اور وہ اسے بڑے یقین کی نظروں سے دیکھنے لگا کہ وہ سوائے سلطان کے پہلو کے کچھ اور مانگ ہی نہیں سکتی۔ مگر گلگونہ نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی "اپنا گھر، شیخ کی کنیزی!"

سلطان کو محسوس ہوا جیسے گلگونہ نے اس کے شاہی گال پر طمانچہ مار دیا۔ وہ تلملا گیا۔ مگر وہ بادشاہوں جیسا دل بھی رکھتا تھا، اور شیخ سے معلم اخلاق کا شاگرد بھی تھا۔ اس نے کہا "جا، وہیں چلی جا! تجھ پر بھی میرے استاد کا جادو چل گیا!"

اور گلگونہ جب شیخ کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ وہ سجدے میں سر رکھے ہوئے کہہ رہا ہے "میرے رب مجھے قوت صبر عطا کر! گلگونہ کی جدائی مجھے بہت شاق ہے! میرے رحیم! صبر! صبر!"

گلگونہ نے جھک کر شیخ کے گال سے گال ملا کر کہا "اور صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے!"

شیخ نے سجدے سے سر اٹھایا، دو زانو بیٹھ کر تین بار "شکر! شکر! شکر!" کہا اور دونوں ہاتھ گلگونہ کی گردن کی طرف بڑھا دئے۔ اور خزاں کی آغوش میں بہار آگئی

مکتبہ دینیات

آصف علی روڈ نئی دہلی

پیش کرتا ہے

قرآن شریف احادیث نبوی

سی پارے ۔ میلاد اور دیگر دینی تاریخی اور اصلاحی کتابیں

شمع بک ڈپو

آصف علی روڈ نئی دہلی

پیش کرتا ہے

ہندوستان کے بلند پایہ لکھنے والوں کے

معیاری ناول افسانے اور ادبی کتابیں

کھلونا بک ڈپو

آصف علی روڈ نئی دہلی

پیش کرتا ہے

نونہالوں کے لئے

ستھری دل چسپ اور سبق آموز کہانیاں

بانو بک ڈپو

آصف علی روڈ نئی دہلی

پیش کرتا ہے

بہنوں کے لئے نئی نئی کشیدہ کاریاں ٹیلرنگ کٹنگ اور فیشن بکس

دسترخوان اور باورچی خانے پر مفید اور معلوماتی لٹریچر اور ہر قسم کی تکنیکل و صنعتی کتابیں

آپ کو جس عنوان پر

اردو یا ہندی زبان میں کسی کتاب کی ضرورت ہو آپ مندرجہ بالا
پتوں پر اپنی فرمائش روانہ فرمائیے
فہرست کتب مفت طلب فرمائیے
سکولوں، لائبریریوں، اور تاجران کتب کو معقول کمیشن پیش کیا جاتا ہے
آپ کی فرمائش کی اطمینان بخش تعمیل ہمارا نصب العین ہے۔

نہیں دوست

عصمت چغتائی

مغربی ممالک میں طلاق زندگی کے لئے وبا بن کر رہ گئی ہے۔ جوں جوں دنیا ترقی کر رہی ہے، عورتیں مردوں کے دوش بدوش مختلف کام انجام دے رہی ہیں۔ ان میں خود مختاری اور اعتماد بڑھتا جا رہا ہے۔ مگر ساتھ ساتھ طلاقوں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ میرے اپنے خیال میں طلاق کوئی گھناؤنا مرض نہیں۔ اگر دو انسان ساتھ نہیں رہ سکتے، تو یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ ایک دوسرے کی جان کو مستقل روگ کی طرح چپکے رہیں۔ بچوں کی خاطر طلاق کو برا سمجھنا کہ طلاق سے بچوں کی ذہنیت پر برا اثر پڑے گا سو فی صدی صحیح نہیں۔

اگر ماں باپ ہر وقت ایک دوسرے سے لڑتے رہیں یا بچوں کا خیال کر کے خاموش ایک دوسرے سے نفرت کرنے کے باوجود جبراً بلائے آسمانی سمجھ کر جھیلتے رہیں تب بھی تو بچوں پر برا اثر پڑتا ہے۔ بچے اس معاملے میں بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔ ماں باپ کے درمیان ذرا سا کھنچاؤ پیدا ہو جائے تو وہ فوراً بھانپ لیتے ہیں۔ گھر کی اس مصنوعی فضا سے ان کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ ایمان داری سے بچوں کو سمجھا دیا جائے کہ وہ بچوں کے والدین کے علاوہ انسان بھی تو ہیں، اگر انہیں واقعی ایک دوسرے کی صورت سے کوفت ہوتی ہے تو بہتر ہے کہ ساتھ نہ رہیں۔ شادی ایک قانون کے علاوہ ایک عادت بھی ہوتی ہے۔ اگر بہت دن دو انسان دنیا کے دکھ سکھ ساتھ ساتھ رہ کر جھیلیں، ساتھ رہیں ساتھ کھانا کھائیں تو کچھ ایک دوسرے کے وجود کی عادت سی پڑ جاتی ہے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے یہ عادت دو انسانوں کو نہ پڑ سکے یا ان میں سے ایک، کسی تیسرے انسان کے ساتھ زندگی گزارنا چاہے تو انسان کی حیثیت سے اسے یہ حق حاصل ہونا چاہئے کہ طلاق لے لے۔

کچھ ایسے میاں بیوی دیکھنے میں آئے ہیں جو ایک دوسرے کو صرف ناپسند ہی نہیں کرتے، ایک دوسرے سے انتہائی نفرت کرتے ہیں۔ میاں کسی دوسری عورت سے دل چسپی رکھتے ہیں، بیوی کا کسی دوسرے مرد سے معاشقہ چل رہا ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں طلاق مفید ہی نہیں لازم ہو جاتی ہے اور ایسے والدین بچوں کو دھوکا دیتے ہیں اگر وہ پھر بھی شادی شدہ جوڑے کا سوانگ رچائے رہتے ہیں۔

ایسی صورتوں میں طلاق لازم ہے۔ گو طلاق بذاتِ خود کوئی مستحسن عمل نہیں۔ دو انسان ساتھ نہ رہ سکیں ایک دوسرے سے نفرت کریں یہ کوئی فخر کی بات نہیں۔ قابلِ عزت ہیں بلکہ قابلِ رشک ہیں وہ میاں بیوی جو ایک دوسرے کے دوست اور ہمدرد ہیں۔ اسی کا نام چاہے محبت رکھ لیجئے۔

جی ہاں شادی سب سے مشکل سب سے اہم دوستی کا نام ہے۔ جیسے ساجھے میں بزنس کی جاتی ہے بالکل اسی طرح دو انسان ایک ساجھے کا گھر بناتے ہیں، ساجھے کے بچے پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح لازمی طور پر دونوں کے دکھ درد اور خوشیاں ایک ہو جاتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں رہتا کہ ایک کو دکھ ہو اور دوسرا بالکل بے تعلق رہے۔

مگر مصیبت تو یہ ہے کہ یہ ساجھے داری اور دوستی کا رشتہ سماجی وجہ

بن گیا ہے۔ عقل کیا کہتی ہے اور دل کیا کہتا ہے کی بجائے دنیا کیا کہتی ہے، اس کا خیال بڑھ گیا ہے۔ وہ شادی کیا ہوئی جو سماج کے خوف سے قائم ہے؟ وہ محبت کیا ہوئی جو مارے باندھے کرنا پڑ رہی ہے؟ شادی کا رشتہ دنیاداری کا رشتہ بن کر رہ جائے تو یہ شادی نہیں ڈھکوسلہ ہے۔ میاں بیوی کا کہنا مانتے ہیں تو انہیں دو قسم کے لوگوں کی باتیں سننا پڑتی ہیں۔ ایک وہ جو میاں کے طرف دار ہیں وہ کہتے ہیں "میاں تو جورو کے غلام ہیں"۔ دوسرے وہ ہیں جو بیوی کے طرف داروں میں سے ہیں وہ کہتے ہیں "اللہ سب کو ایسا میاں دے"۔ وہی جورو کا غلام ان کے خیال میں بے مثال شوہر ہے۔ اسی طرح بیوی اگر میاں کا کہنا مانے تو پارٹی کے لوگ خوش ہوتے ہیں مگر ان کے مخالف بیوی کو جاہل گنوار میاں کے پیر کی جوتی کہتے ہیں۔ غرض میاں بیوی کا رشتہ سماج کے ٹھیکیداروں کی خوشنودی پر منحصر ہے۔

اس لئے میرے خیال میں یہ تو سوچنا ہی حماقت ہے کہ دنیا کیا کہے گی۔ یا بچوں کا کیا ہوگا۔ مگر یہ میں کیا کہہ رہی ہوں کہ دنیا کیا کہتی ہے اس کی پروا کرنا حماقت ہے۔ یہ دنیا یہ سماج بہت طاقت ور چیز کا نام ہے۔ سماج سے لڑنا بہت مشکل ہے۔ سماج سے میرا مطلب ساری دنیا نہیں بلکہ آس پاس رہنے بسنے والے، دوست احباب اور رشتہ دار ہیں۔ یہی سماج ہے اور اسی کا فیصلہ اٹل ہے۔

لیکن اگر آپ کے پاس دولت اور عزت ہے تو یہی سماج آپ کی بہت خطائیں معاف کر دے گا۔ دولت نہ سہی کوئی بے مثال فن ہی۔ مثلاً ایک بہت بڑا مصور، لیڈر یا مصنف اگر سماج کے چند اصول توڑ بھی ڈالے تو اس کے چاہنے والے درگزر کر جاتے ہیں۔ پر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سماج نے تو معاف کر دیا مگر اپنی اولاد نے نہ بخشا۔ ایک بہت بڑے فن کار ہیں، سخت دل پھینک قسم کے۔ اُن کے مداحوں کو ان کی یہی ادا بے انتہا بھاتی ہے، مگر بیوی سے نہیں بنتی۔ گھر میں عجیب "کولڈ وار" (سرد جنگ) کا سماں بندھا رہتا ہے۔ شاید بیوی جاہل ان پڑھ ہوتیں تو میاں کی شخصیت سے مرعوب ہو کر ان کے سامنے سر جھکا دیتیں۔ مگر وہ بھی تعلیم یافتہ ہیں۔ جذبۂ خودداری کو ٹھیس لگنے سے نہایت نازک مزاج ہو گئی ہیں۔ لوگ ان کے گھر جاتے ڈرتے ہیں کیوں کہ وہ اپنے شوہر کے مداحوں سے سخت نفرت کرتی ہیں۔

فن کار کو تو اپنی پوزیشن کی وجہ سے جلسوں پارٹیوں میں دوستوں اور چاہنے والوں کی صحبت مل جاتی ہے۔ بیوی اور بچے ایک عجیب قسم کے حبسِ دوام کا شکار رہیں۔ بیوی کو میاں کی دل پھینک عادتوں کی وجہ سے دنیا کے ہر فرد سے نفرت ہو گئی ہے۔ ایسے گھر میں بچوں کی ذہنیت کی جو گت نہ بن جائے کم ہے۔ ان میں سے ایک تو اعلانیہ طور پر پاگل ہے۔ اس گھٹن اور نفرت کے سمندر میں جو بچہ بھی غوطے کھانے پر مجبور ہوگا اگر وہ طبیعت کا حساس ہے تو ضرور دماغی توازن کھو بیٹھے گا۔ وہ بچہ جو ماں باپ کو ایک دوسرے سے اتنی شدید نفرت کرتے دیکھتا ہے، اس کے دماغ میں ساری انسانی قدریں اتھل پتھل ہو جاتی ہیں۔ ہم بچوں کو جتنا بھولا سمجھتے ہیں قدرت نے انہیں اتنا بے وقوف نہیں بنایا۔ بچے بڑوں سے زیادہ حساس اور سمجھ دار ہوتے ہیں۔ جب والد صاحب کہیں عشق و محبت کے پینگ لڑاتے ہیں اور والدہ صاحبہ دورانِ جنگ میں اُن کی باتفصیل دھجیاں اُڑاتی ہیں تو یہ بچے اس لیتھڑ کو سمجھتے ہیں دیکھتے ہیں اور سنتے ہیں۔ اسی ماحول میں ان کی ذہنیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ لہٰذا سماج نے تو فن کار کی بے راہ روی کو معاف کر دیا ہے مگر بچوں نے نہیں بخشا۔ اور ایک نازک حس رکھنے والے فن کار کو جو کوفت اور دُکھ اپنے بچے کے پاگل پن سے ہو سکتا ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس نے کبھی کسی پاگل کو دیکھا ہے۔

یقین تو نہیں آتا مگر لوگوں کا خیال ہے کہ بیوی نے شوہر سے بدلہ لینے کے لئے قصداً پاگل بنا دیا ہے۔ کیا ایک ماں کی ذہنیت اتنی بھیانک ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو پاگل کر دے؟ بہت ممکن ہے مسلسل کوفت اور احساسِ کمتری کے حملوں سے مفلوج ہو کر خود ماں بھی ایک قسم کی پاگل ہو چکی ہو۔ ظاہر ہے کہ پاگل کے سایہ عاطفت میں پلنے والے کبھی بھی صحت مند ذہنیت کے بچے نہیں ہوں گے۔ بڑے ہو کر یہ بچے والدین کے لئے لعنت ثابت ہوں گے یا مسلسل کوفت۔ نفرت ان کی گھٹی میں پڑ چکی ہے، اور وہ سب کے سب سنِ بلوغت کو پہنچنے تک کھلم کھلا پاگل نہیں ہوں گے تو ٹیڑھی میڑھی ذہنیت کے تو ضرور ہوں گے۔ وہ بھی اپنے جیون ساتھی کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو اُن کی پیاری اماں ان کے والد بزرگوار کے ساتھ کرتی ہیں۔

میری ایک سہیلی ہیں۔ اُن کے باپ نے ان کی ماں کو بہت دُکھ دیئے۔ ان کی ماں نے خاموش سر جھکا کر یہ دُکھ سہے مگر بیٹی کے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ "مرد کی ذات بے وفا ہوتی ہے۔ اس پر بھروسہ کرنا بھول ہے اس سے پیار کرنا حماقت ہے۔" چنانچہ بڑی ہو کر محترمہ نے ماں کا انتقام دنیا کے مردوں سے لینے کا فیصلہ کر لیا۔ خیر اگر چپ چاپ بیٹھی مردوں سے نفرت کیا کرتیں تو کیا حرج تھا۔ دنیا میں ایک عورت اور بے مصرف ہو جاتی۔ انہوں نے تو مجمعے عشق کر کے دھڑا دھڑ لوگوں کے دل توڑنے شروع کر دیئے۔ اس پر بھی جی نہ بھرا تو شادیاں کر کے شوہروں کو زندگی کا مزا چکھایا۔ انہوں نے پانچ شادیاں کیں اور

ہر شوہر کو وہ ذہنی چابک لگائے کہ شل اور بدحواس کر دیا۔ ویسے نہایت حسین، پڑھی لکھی دل چسپ عورت ہیں۔ مگر جب وہ اپنے کارہائے نمایاں کا ذکر کرتی ہیں تو کراہت آنے لگتی ہے۔ اس مردکشی کی لت سے سخت وحشت ہوتی ہے۔ اتنی شادیوں کے بعد بھی انہوں نے کوئی بچہ پیدا نہیں کیا، کیوں کہ وہ کسی مرد کو اس قابل نہیں سمجھتیں کہ اُسے بچہ کی تعمیر میں شرکت کا موقع دیں۔ اللہ نے اچھا ہی کیا جو انہیں بچہ نہ پیدا کرنے کی جھک لگادی ورنہ اس ایٹمی دنیا میں ایک اور "گورکھ دھندا" پیدا ہو کر ہٹلر یا مسولینی کی طرح زندگی کی گتھیوں کو اور الجھا دیتا۔

عموماً جس گھر میں ماں اور باپ کی نہیں بنتی ایک گھٹی گھٹی عجیب سی فضا طاری ہو جاتی ہے، جو ایک ننھے منے دماغ کو کچلا کے رکھ دیتی ہے۔ اگر باپ کو اولاد سے دل چسپی ہوتی ہے اور وہ وقت نکال کر ان سے دوستی پیدا کرتا ہے، کھل کر ان سے بات چیت کرتا ہے تو بچوں کے دل میں باپ کی طرف سے کدورت نہیں جمنے پاتی۔ مگر عموماً مائیں جو اپنے شوہر سے نفرت کرتی ہیں وہ اپنے بچوں کو باپ سے محبت کرتے دیکھنا نہیں چاہتیں۔ ساری نفرت وہ بچوں کے دماغ میں بھر دینا چاہتی ہیں تاکہ شوہر نے جو انہیں پیار سے محروم کر رکھا ہے، سماج میں پوزیشن مضحکہ خیز بنا دی ہے اس کا انتقام لیا جا سکے۔ وہ بچوں کے دل میں یہ بٹھا دیتی ہیں کہ ان کا باپ کمینہ اور نیچ انسان ہے۔ وہ ماں سے محبت کرتا ہے اور نہ ان کی ماں سے۔ وہ جانور ہے۔ بے حس ہے ان کی محبت کا اہل نہیں۔ اس کی کوئی وقعت نہ ہونی چاہئے اور دنیا جو اُن کی عزت کرتی ہے۔ خوشامد پرست لالچی ہے۔ بچے کا ننھا سا دل باپ اور اگر سماج باپ کے ساتھ ہو تو اس سماج سے، ساری دنیا سے گھن کھانے لگتا ہے۔

بعض باپ جاہل یا کم عقل ماں کی بچوں کے سامنے ہتک کر دیتے ہیں۔ بچے ماں کو احمق اور جاہل سمجھتے ہیں۔ اگر وہ اُن کے باپ سے کسی بات پر جھگڑتی ہے تو اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ وہ ساری نفرت جو باپ کو اپنی بیوی سے ہوتی ہے ورثہ میں اپنی اولاد کو بگاڑ دیتا ہے۔ اولاد ماں کو اپنا اور باپ کا دشمن سمجھتی ہے۔ وہ اولاد جو اپنے خون سے نفرت کر سکتی ہے۔ دنیا کے کسی بھی فرد سے بے لاگ محبت نہ کر سکے گی۔ ایسے بچے یقیناً صحت مند ذہنیت کے مالک نہ ہوں گے۔ "پرابلم بچے" ہوں گے اور بڑے ہو کر دنیا کو وہی نفرت دیں گے جو انہیں ورثہ میں ملی۔

یہ سماج دشمن بچے انسانیت کی قسمت جگانے کے بجائے ایک گھناؤنا ناسور بن کر فضا کو اور بھی متعفن کر دیں گے۔ کاش ایسے بچے ڈھالنے پر کوئی قانونی پابندیاں ہوتیں۔ مگر کیا ہوتا ہے ان قانونی پابندیوں سے؟ شراب پر

بہترین دوست

پابندی ہوئی تب گلی گلی تیزاب بکنے لگا ہے جو پولیس کی سایہ عاطفت میں تیار ہو کر عوام کے کلیجے کو چاٹتا ہے۔ ایسے میاں بیوی جنہیں ایک دوسرے سے نفرت ہے بہتر ہو کہ طلاق لے کر الگ الگ گھر بسائیں، یا کم از کم بچے ہی نہ پیدا کریں۔ کیوں کہ ایسے سماج دشمن جوڑے ایک ملک کے لئے لعنت ہیں۔ بھگتنا تو یہ بچے ہم دنیا والوں کو پڑتے ہیں۔

ہے کوئی عدالت جو ان جیسے لاکھوں بچوں کی فریاد سُنے۔ ہے کوئی قانون جو بچوں کی دل شکنی کی روک تھام کر سکے۔

ایک اور صاحبہ ہیں جنہوں نے میاں سے نہ بننے کی صورت میں طلاق لے کر دوسری جگہ شادی کر لی اور ہنسی خوشی رہنے لگیں۔ اپنے اور بھی بچے ہوں گے مگر پہلے بچوں کے لئے تڑپا کرتیں۔ باپ نے شادی نہ کی اور انتقاماً بچوں کے دل میں ماں کی طرف سے زہر بھر دیا۔ بچے ماں باپ کی ساری محبت صرف باپ کو دینے کے عادی ہو گئے۔ لڑکی جوان ہو رہی ہے، ماں نے بلایا تو انکار کر دیا بار بار پوچھا تو جواب دیا "کیا کریں گی مجھ سے مل کر آپ کی اپنی بیٹی تو ہے اگر اس سے اتنی محبت تھی تو چھوڑ کے کیوں چلی گئی تھیں؟"

والدہ صاحبہ دھاروں دھار روتی ہیں۔ ایک ماں کی اس سے زیادہ کیا ہتک ہو سکتی ہے کہ بچوں کو اس کی ضرورت ہی نہ رہے۔ سچ تو ہے جب بچی کو ماں کی ضرورت تھی تب نہ ملی، اب وہ بغیر ماں کے زندہ رہنے کی عادی ہو گئی جب میں اس کڑوی کسیلی بچی کو دیکھتی ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نہ جانے وہ کس کس کی زندگی میں زہر گھولے گی۔

ماں کا قصور بس اتنا ہے کہ وہ عورت بھی ہے اور ماں بھی۔ اس شوہر کے ساتھ رہنے سے اُسے موت زیادہ آسان نظر آتی تھی۔ باپ کو ایک شریف انسان کی حیثیت سے بچی کو انتقام کا آلہ نہیں بنانا چاہئے تھا۔ صرف ماں کے دل کو چوٹ پہنچانے کے لئے بچی کو پتھر بنا کر باپ نے ماں کے خلاف ہی نہیں سماج اور زندگی کے ساتھ جرم کیا۔

میں پھر کہوں گی کہ طلاق کوئی قابلِ فخر بات نہیں۔ لیکن اگر لینی ہی پڑے تو والدین کو بچوں کو اپنے نجی احساسات کا غلام نہیں بنانا چاہئے۔ دنیا ترقی کر رہی ہے یا تنزل پذیر ہے اس کا دو الفاظ میں فیصلہ نہیں دیا جا سکتا۔ اتنا معلوم ہے کہ عورت دن بدن اقتصادی طور پر آزاد ہوتی جا رہی ہے اور کوئی قانون اسے نہیں روک سکتا۔ یہ ایک اقتصادی مسئلہ ہے۔ سماجی طاقتوں کو سر جھکانا پڑے گا۔ لوگوں کا خیال ہے اقتصادی طور پر آزاد عورت ایک اہم مسئلہ بنتی جا رہی ہے اور

بہترین دوست

اس کی اس تبدیلی کی وجہ سے طلاقیں زیادہ سے زیادہ ہوتی جارہی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بات ٹھیک ہو کیوں کہ اقتصادی طور پر آزاد عورت مرد کی لونڈی نہیں رفیقۂ حیات بننے پر مصر ہے۔ مردوں کو صدیوں سے عورت پر حکومت کرنے کا حق ملا ہوا ہے۔ وہ چاہے طوائفوں میں جائیں، نئی نئی شادیاں رچائیں۔ عورت کا، خصوصاً مشرقی عورت کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ اُسے خدائے مجازی ہی سمجھتی رہے۔

میرے خیال میں اگر کوئی عورت میاں کی دھونس صرف اس لئے سہتی ہے کہ وہ اس کے روٹی کپڑے کا کفیل ہے تو اس عورت میں اور بازاری دیشیا میں کوئی فرق نہیں۔ وہ بھی پیٹ کی خاطر جسم بیچتی ہے اور یہ بھی پیٹ کی خاطر بیوی بنی رہتی ہے۔ میاں اور بیوی کے درمیان جب یہ بیوپاری باتیں آجائیں تو اسے شادی نہیں کانٹرکٹ یا مجبوری کا معاہدہ کہنا چاہئے۔ یہ رشتہ تو بے غرض محبت کی ڈوریوں میں بندھ کر ہی شادی کہلا سکتا ہے۔

ازدواجی رشتہ میں ناکامیابی بھی دوسری شکستوں کی طرح شرم کی بات ہے۔ دو انسان پیار کر کے پھر نفرت کرنے لگیں یہ کوئی فخر و مسرت کی بات نہیں۔ جسم کا کوئی حصہ بالکل ہی بے کار اور باقی جسم کے لئے نقصان دہ ثابت ہو جب ہی اُسے کاٹ کر جدا کرتے ہیں۔ جیسے کوئی لنگڑا لولا اپنی کوتاہی پر بے جا فخر نہیں کر سکتا اسی طرح ایک طلاق شدہ عورت یا مرد فخر سے سر اٹھا کر نہیں چل سکتا، نہ اپنے اس نعل کی شیخیاں بگھار سکتا ہے۔ خوش نصیب اور قابلِ عزت ہیں وہ لوگ جو رشتہ کو بے غرض پیار و محبت کے بل بوتے پر نباہ جاتے ہیں۔ طلاق ایک دوا ہے جسے صرف مریض ہی پیتا ہے لوگ شوقیہ مونہہ کا مزا بدلنے کو نہیں پیتے۔

قابلِ رحم سہی لیکن قابلِ تحسین ہیں وہ لوگ جو شادی جب ڈھکوسلہ ہو جاتی ہے تو اسے ختم کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ شادی ایک مجبوری کے بندھن سے زیادہ ایک سمجھوتہ ہے، ایک دوستی ہے جس میں دو عزیز ترین دوست ایک دنیا بساتے ہیں، مل جل کر ایک خاندان پیدا کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ غم خوشی کے آنسو بہاتے ہیں لڑتے ہیں جھگڑتے ہیں اور زیادہ قریب آنے کے لئے، ایک دوسرے میں غرق ہو جانے کے لئے۔ اب چاہے انہیں میاں بیوی کہہ لیجئے یا بہترین دوست۔

"بانو" کے اس سال نامہ پر اپنی رائے ہمیں بھیجئے ـــــ مدیر

رفیقِ صحت

صحت و تندرستی کی بقا کے لئے معلوماتی، مفید اور مجرب نسخہ جات اور مستند مضامین کا مجموعہ، یہ کتاب آپ کی سچی رفیق ثابت ہوگی اور روزمرہ کے ڈاکٹروں اور حکیموں کے بلوں کی ادائیگی سے نجات دلا دیگی۔ ایسے راز آپ کو معلوم ہو جائیں گے کہ زیادہ محنت کے بعد بھی آپ تھکاوٹ محسوس نہ کریں گی

خوراک کے متعلق بہترین مشورے، بیماروں کی غذاؤں میں معمولی ردوبدل سے دوبارہ صحت حاصل کرنے کے طریقے، صحت خراب ہونے کی صورت میں یہ کتاب پڑھ کر آپ اپنے اندر نئی زندگی حاصل کرنے کے لئے نئی امنگیں ابھرتی ہوئی محسوس کریں گی۔

قیمت ۶ روپے

نئی دھرتی پرانے گیت

رام لعل سہمی ہوئی دھرتکنوں، دبی دبی سسکیوں اور دبی دبی خواہشات کی مبہم آوازوں کی زبان خوب سمجھتا ہے، اسی خصوصیت نے اُسے حیات و کائنات کے مسائل سے دلچسپی لینا ہی نہیں سکھایا بلکہ انسانوں کے بے پایاں غموں اور بے اندازہ دکھوں میں حصہ دار بننے کی اہلیت بھی عطا کی ہے، رام لعل کے نئے اور بہترین افسانوں کا نیا مجموعہ۔

قیمت ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے

مولانا امداد صابری کی تاریخی کتابیں

تاریخ صحافت اردو ۳/۵۰۔ فرنگیوں کا جال ۵/۔ ہندوستان کے انقلابی ۲/۔ تاریخ جرم و سزا مکمل ۱۲/۵۰ حیاتِ آشوب ۲/۔ سیرت حاجی امداد اللہ ۱/۵۰، علامہ سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں ۲/۔

بانو بک ڈپو، آصف علی روڈ نئی دہلی

ہفت رنگ

روحِ تخلیق ناچ اُٹھی ہوگی ذہن پر کیف چھا گیا ہوگا
تو بھی دے کر وجود عورت کو اے خدا جھوم جھوم اُٹھا ہوگا

ہر نظر میں خلوصِ دل کی جھلک ہر نفس آئینہ لطافت کا
لوگ عورت جسے سمجھتے ہیں دوسرا نام ہے محبّت کا

زندگی آہ ابنِ آدم کی یوں تو معمور درد و غم سے ہے
پھر بھی اس میں ہے جو سرور و نشاط صرف عورت کے دم قدم سے ہے

کوئی دنیا میں سیم و زر کے عوض کیا خریدے گا پیار عورت کا
مفت مل جائے یہ ممکن ہے قیمتاً تو یہ مل نہیں سکتا

اپنے بچے کو جب کوئی عورت شادماں ہو کے چوم لیتی ہے
مجھ کو اس وقت اُس کے پیکر میں رحمتِ حق دکھائی دیتی ہے

جو بھی عورت ہے، سازِ ہستی کا بیش قیمت سا اک ترانہ ہے
ایک ہیرا ہے خوب رو ہے اگر نیک خو ہے تو اک خزانہ ہے

ہونٹ اس کے ہیں مدھ بھرے بیشک اس کی آنکھیں ہیں لاکھ کیف آگیں
بے خبر! پھر بھی جسم عورت کا ایک معبد ہے میکدہ تو نہیں

نریش کمار شاد

م۔م۔ مدراجندر

آدابِ حُسن، آدابِ محفل

ٹھہریئے اور اپنی سوچ میں آگے نہ بڑھیئے۔ اس مضمون کا تعلق کسی رقاصہ سے ہے، نہ مغنیہ سے۔ یہ آپ کے بارے میں ہے، آپ جو اپنے گھر کی ملکہ ہیں، آپ جو ایک اوسط درجے کی گھریلو عورت ہیں!

جی ہاں، حسن کو چند آداب کی ضرورت ہے اور ہماری سماجی سرگرمیاں، اپنے پڑوسیوں، دوستوں اور رشتہ داروں سے میل جول چند قواعد یا آداب کا تقاضی ہے۔ آپ جسمانی طور پر کتنی بھی دلکش ہوں لیکن اگر آپ 'آدابِ حُسن اور آدابِ محفل' سے بے بہرہ ہیں تو آپ کبھی کبھی واقعی بدصورت نظر آئیں گی! اور اگر آپ ان آداب کے بارے میں محتاط ہیں تو آپ معمولی شکل و صورت کی ہوتی ہوئی بھی 'دل خوش کن' نظر آسکتی ہیں۔

محمود کو اس کے دوست راشد نے چائے پر بلایا تھا۔ ایک دو دوست اور بھی مدعو تھے اور بیویوں کو بھی جانا تھا۔ محمود نے سکینہ سے کہا کہ وہ جلدی سے تیار ہو جائے اور سکینہ اپنی تیاری کرنے لگی۔ وہ سانولے رنگ کی اور دلکش مقدوخال کی ایک پڑھی لکھی خاتون تھی۔ مگر اس کا جسم ذرا بھاری تھا اور قد بھی کوئی زیادہ نہ تھا۔ جس وقت سکینہ تیار ہو کر محمود کے سامنے آئی تو محمود بولا "خوب۔ مگر سنو ساڑی کوئی اور نہیں پہن سکتیں"

"یہ ساڑی تو بہت شاندار ہے اور اس کا آج کل رواج بھی بڑا ہے"

"شاندار تو ہے اور رواج بھی یقیناً ہوگا مگر اس کا کپڑا ایسا ہے کہ یہ جسم پر پھولی پھولی رہتی ہے اور اس میں تم کافی موٹی لگ رہی ہو"

"تو پھر بتایئے۔ وہ پہن لوں جو آپ نے ابھی عید پر دلوائی ہے"

"ہاں وہ زیادہ اچھی لگے گی ـــ ارے اور سنو۔ تم نے یہ جوڑا ذرا بے دلی سے بنایا معلوم ہوتا ہے۔ بالکل شلغم معلوم ہوتا ہے۔ تمہارے بڑا جوڑا اچھا لگتا ہے ذرا جوڑا بھی اچھا سا بنالو ـــ شاباش"

سکینہ ان تبدیلیوں کے بعد جو آئی تو کچھ اور ہی لگ رہی تھی۔ یہی تبدیلیاں یہی کیفیتیں آدابِ حسن ہیں: اگر آپ رواج سے بالاتر ہو کر اپنے ملبوسات کو اس سادہ کسوٹی پر پرکھیں کہ "کیا میں اچھی لگ رہی ہوں"، تو ان آداب کے لئے آپ کے شوہر کو بھی، دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

پروفیسر شیکھر کی بیوی چندا ایک خوب صورت پڑھی لکھی عورت تھی۔ رنگ بھی گورا تھا اور بدن بھی پتلا تھا۔ پروفیسر بڑا باذوق آدمی تھا اور گھر کی ہر چیز میں ترتیب اور نفاست مانگتا۔ اپنی بیوی کو بھی چاہتا کہ ہر وقت اچھی نظر آئے۔ ایک روز وہ اندرونی برآمدے میں بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا کہ بیوی کی آہٹ سن کر نظر اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اُس کی طبیعت بڑی مکدر ہوئی کیوں کہ چندا ننگے پاؤں ایک پٹڑا ہاتھ میں لئے غسل خانے کی طرف جا رہی تھی۔ نیچے کی طرف سے دھوتی اٹھی ہوئی تھی اور پیٹی کوٹ کی جھالر نظر آ رہی تھی۔ پیچھے کمر پر سے دھوتی نیچے کھسک گئی تھی اور پیٹی کوٹ نظر آ رہا تھا۔ چولی کے سائڈ کے بٹن کھلے ہوئے تھے جس کی وجہ سے وہ کھلی کھلی سی بھدی سی لگ رہی تھی۔ شیکھر بولا "چندا یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے"

"کیوں"

"ذرا کچھ سوچا تو کرو۔ یہ کوئی کپڑے پہننے کا ڈھنگ ہے۔ اور تمہاری چپل کہاں ہے۔ دھوتی کئی جگہوں سے سرک رہی ہے اور تمہیں ہوش ہی نہیں"

"آپ میں تو ٹوکنے کی عادت ہو گئی ہے۔ کام میں تو ایسی حالت ہو ہی جاتی ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں ہر وقت بنی سنوری رہوں تو نوکر رکھ لیجئے"

"کام کا یہ مطلب نہیں کہ تم جھلی باؤلی نظر آؤ" پروفیسر شیکھر ذرا غصے سے بولا "میں یہ سمجھ سکتا ہوں کہ کام کے وقت ذرا پرانے کپڑے پہن لئے جائیں مگر یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ عورت اس بہانے اپنے شعور، اپنے احساس اور اپنے وقار کو کھو دے۔ اس وقت تم اپنے حلئے سے ان پڑھ ہی نہیں بلکہ کافی بڑی عمر کی عورت لگ رہی ہو"

پروفیسر شیکھر کی بات میں بڑی صداقت تھی۔ کام کی آڑ لے کر آپ اپنے احساس اور نسوانی وقار کو نہیں کھو سکتیں۔ آپ اگر گوبر سے فرش بھی لیپ رہی ہیں، تب بھی آپ کا کام نسوانی تمکنت سے کر سکتی ہیں۔ آپ کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے، بات کرنے، کپڑے پہننے اوڑھنے میں، ایک وقار پنہاں ہے، ایک حسن ہے، ایک نزاکت ہے جسے کام کی نوعیت نہیں بلکہ آپ کی غفلت آپ سے چھین لے گی۔ کام کرنے کا "انداز" ایک بڑی ضرورت ہے اپنی دل کشی کو قائم رکھنے بلکہ بڑھانے کے لئے۔ اس سے غفلت محض اس لئے کہ آپ گھر میں ہیں یا کام میں لگی ہوئی ہیں معقول وجہ جواز نہیں ہے۔

یاد رکھئے کہ کسی بھی چیز کی قیمت کا زیادہ ہونا اس کی خوبصورتی کی ضمانت نہیں ہے اگرچہ ایک بیش قیمت چیز بسا اوقات خوشنما ہوتی ہے۔ اگر آپ کسی ساڑی یا زیور کو محض اس لئے خریدنا چاہتی ہیں کہ وہ قیمتی ہے تو یہ آپ کے حسن ذوق کی دلیل نہیں ہے۔ بعض مرتبہ سونے کے زیور کے مقابلے میں ایک سستا کانچ کا زیور، نقلی موتیوں، سیپ یا محض تازہ پھولوں کا زیور آپ کو زیادہ حسین بنا دے گا۔ اسی طرح ایک بھاری سونے کے زیور کے مقابلے میں ایک ہلکا لیکن بہتر ڈیزائن کا سونے کا زیور خوش نما لگ سکتا ہے۔ اسی طرح یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک کامدار بھاری بنارسی ساڑھی آپ کے ہر حالت میں اچھی لگے۔

خالد صاحب جب کبھی ملتے مجھے گھر پر آنے کے لئے فرماتے۔ ایک روز میں ذرا فارغ تھا میں نے سوچا خالد صاحب کے یہاں ہی ہو آؤں۔ میں نے جا کر آہستہ سے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ خالد صاحب گھر پر نہیں تھے اور دروازہ ان کی بیگم نے کھولا۔ آداب عرض کے بعد بڑی شائستگی سے بولیں "تشریف لے آئیے۔ خالد صاحب اپنی ایک ضروری چٹھی ڈالنے چلے گئے ہیں۔ بس آتے ہی ہوں گے تشریف رکھئے"

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ مسز خالد مجھ سے بات کرنے لگیں۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ وہ "آداب محفل" کو ملحوظ رکھتی ہیں۔ مجھے وہ مسز کرامت سے زیادہ "خوش گوار" خاتون نظر آئیں۔ چند روز ہوئے جب میں کرامت صاحب کے گھر گیا تھا اور میں نے انہیں آواز دی تھی تو مسز کرامت بغیر دروازہ کھولے اندر سے کرخت آواز میں بولی تھیں "کون ہے؟"

"کرامت صاحب ہیں"

"نہیں گھر پر نہیں ہیں"

"کیا آپ بتا سکیں گی وہ کب تک آئیں گے۔ مجھے ان سے ایک ضروری کام سے ملنا تھا"

"آپ کون ہیں؟"

"میرا نام راجندر ہے۔ میں سامنے ۱۹ نمبر سے آیا ہوں"

"آپ کے اردو کے رسالے تو ہم بھجوا چکے ہیں"

"معاف کیجئے میں رسالے لینے نہیں آیا۔ مجھے کرامت صاحب سے ملنا تھا"

"ان کا کچھ پتہ نہیں کب آئیں گے۔ ہم ان سے کہہ دیں گے"

آخری فقرہ مسز کرامت نے دور ہٹتے ہوئے یعنی مکان کے اور اندر جاتے ہوئے کہا تھا اور میں اب کچھ مزید پوچھ بھی نہیں سکتا تھا!

آج کے ڈرائنگ روم یعنی نشست گاہ میں ہر چیز اپنی اپنی جگہ قرینے سے لگی ہوتی ہے۔ صوفہ سیٹ، کرسیاں وغیرہ مالک خانہ کے ذوق کے خاص ڈھنگ اور ترتیب سے رکھی جاتی ہیں۔ بیٹھتے ہوئے کسی

سے کھسکانا یا آگے پیچھے کرنا بے ادبی میں شمار ہوتا ہے اگرچہ بیٹھنے والوں کے درمیان فاصلہ کافی بھی کیوں نہ ہو۔ عام طور پر فرنیچر کی تمام اشیا اس طرح آراستہ ہوتی ہیں کہ سوائے ایش ٹرے یعنی خاک دان کے اور کسی چیز کے ادھر ادھر اٹھانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی یا بہت زیادہ ہوا تو کوئی پیگ ٹیبل یعنی سائڈ میں رکھی ہوئی تپائی نما میز کھسکا لی جاتی ہے۔

شہناز کے یہاں چند عورتیں آئیں اور اس نے اپنا ڈرائینگ روم کھول دیا۔ ڈرائینگ روم میں دو صوفے سیٹ ایک دوسرے کے بالمقابل ایک خوشنما مستطیل کی شکل میں رکھے ہوئے تھے۔ سارے فرش پر قالین بچھا تھا اور وسط میں ایک خوبصورت گول میز تھی۔ جگہ جگہ پیگ ٹیبل لگی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کسی کسی پر کوئی آرائشی چیز بھی رکھی ہوئی تھی۔ آنے والی عورتیں چار تھیں اور چاروں پڑھی لکھی معلوم ہوتی تھیں۔ ان میں دو کے ساتھ ایک ایک بچہ بھی تھا۔ تمام عورتیں بیٹھ گئیں۔ ایک عورت نے بیٹھنے کے فوراً بعد اپنی کرسی کھسکا کر آگے کر لیا جس سے ترتیب کی وہ خوبصورت مستطیل بگڑ گئی اور تمام ڈرائینگ روم میں ہی ایک بے ڈھنگا پن آگیا۔ شہناز کو بڑا برا محسوس ہوا اور وہ عورت اپنی خوبصورتی اور اعلےٰ لباس کے باوجود شہناز کو اچھی نہیں لگی۔

ایک دوسری بچے والی عورت نے اپنے بچے کو پیگ ٹیبل پر بٹھا دیا اور دوسری پیگ ٹیبل پر سے ہڈی کا بنا ہوا سارس اٹھا کر اُسے کھیلنے کو دے دیا۔ شہناز کو یہ عورت بھی بری لگی۔

دوسری بچے والی عورت بڑی عقلمند اور مہذب تھی۔ اس کا بچہ چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے کسی چیز کو چھوا تک نہیں۔ شہناز نے اس عورت کی طرف خاص طور پر توجہ کی۔

آداب حسن، آدابِ محفل، کی یہ چند مثالیں محض رہنمائی کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔ حسن اور محفل دونوں زندگی کی لامحدود سرگرمیاں احاطہ کئے ہوئے ہیں مگر ایک کسوٹی جو آپ سب حاصل کر سکتی ہیں وہ اعلیٰ ذوق ہے۔ جس طرح ایک انجنیئر صرف اصولوں کا مطالعہ کرتا ہے اور اپنی عملی ٹریننگ میں تمام مشینوں کی جان کاری حاصل نہ کرنے کے باوجود ان اصولوں کی مدد سے ہر مشین کی دیکھ بھال اور ان پر کام کر لیتا ہے، اسی طرح جب آپ ایک سلجھا ہوا ذوق پالیں گی تو آداب حسن اور آداب محفل، خود آجائیں گے۔ یاد رکھئے کہ ان کے بغیر آپ کی شخصیت میں نکھار اور جاذبیت نہیں آسکتی اور ذوق کی آب یاری کے لئے اچھی سوسائٹی اور عمدہ مطالعہ ناگزیر ہے۔

●●

دوشیزۂ پاکستان

پاکستان کے مختلف گھرانوں کی تین حسین دوشیزہ لڑکیوں کی عجیب و غریب، دل چسپ اور حیرت انگیز داستان پاکستان میں نام نہاد ترقیٔ نسواں کی آڑ میں جس عریاں اور فحش تہذیب کی طرف نئی نسل بڑھ رہی ہے اس پر مشہور ناول نگار ایم، اسلم نے بڑی دردمندی سے تنقید کی ہے۔ قیمت: ۶ روپے ۵۰ نئے پیسے۔

ایک بیوی ہزار عورتیں

اس ناول میں ایک ایسی عورت کی زندگی کو اُجاگر کیا گیا ہے جو ایک ہی وقت میں اپنے شوہر کے لئے "دیوی" بھی تھی اور "عورت" بھی۔ لیکن چالیس سال کی عمر میں اس نے عملی طور پر عورت بننے سے انکار کر دیا اور اس کے بعد نہایت خوش دلی کے ساتھ نوجوان لڑکیوں کو اپنے شوہر کے آغوش کی زینت بناتی رہی۔ ایک اصلاحی ناول قیمت: ۵ روپے۔

۱۸۵۷ کی دلّی

۱۸۵۷ء کی دہکتی آگ میں پرانا ہندوستان جل کر راکھ ہوا اور مغلیہ حکومت کا زوال ہوا۔ انگریز نے ہندوستان میں سامراجی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ شریفوں، امیروں، رئیسوں اور شاہی خاندان کے افراد کی عزت و آبرو اور جان و مال خاک میں مل گئے۔ دلّی والوں پر کیا بیتی، اس درد بھری داستان کو ڈرامائی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ قیمت: ۳ روپے۔

پاسبانِ حرم

دل چسپ واقعات، پرجوش جذبات، جنگ کے ہولناک نظارے اور محبت کے روح پرور مناظر کے ساتھ ساتھ حسن و عشق کی گھاتیں اور وصل و ہجر کی وارداتیں، سحرالبیان ناول نگار ایم اسلم کے قلم سے قیمت: ۴ روپے۔

بانو بک ڈپو، آصف علی روڈ۔ نئی دہلی

اندرا گاندھی

پرکاش چندر جین

"پھر جب سایہ باقی نہ رہے۔
اور روشنی ہی باقی رہ جائے،
تب وہ روشنی بھی ایک بلند تر روشنی کا سایہ بن جاتی ہے۔"

—— جبران خلیل جبران

پنڈت نہرو کی شخصیت میں بڑی جاذبیت ہے، بڑی عظمت ہے۔ سارے ہندوستان کو وہ عزیز ہیں —— لیکن مقبولیت اور محبوبیت میں ان کی ۴۲ سالہ بیٹی اندرا گاندھی بھی کچھ کم نہیں۔ پچھلے دنوں تک وہ انڈین نیشنل کانگریس کی صدر رہ چکی ہیں۔ بااثر سیاست دانوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ نیا ہندوستان ان کا شیدائی ہے۔ نئی امنگوں، نئے ولولوں کی وہ علامت ہیں۔ ۱۹۴۲ میں ایک پارسی بیرسٹر جناب فیروز گاندھی سے (جو ہندوستانی پارلیمنٹ میں ان کے باپ کی حکومت پر سخت اعتراض کرنے والوں میں سے ہیں) ان کی شادی ہوئی تھی۔ لیکن ۱۹۴۶ سے، جب سے پنڈت نہرو نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی، انہوں نے ازدواجی زندگی کی مسرتوں کو تیاگ دیا۔ باپ کی (اور اس طرح سارے ملک کی) خدمت پر کمر باندھ لی۔ جب سے وہ ہر دم انہیں کے ساتھ رہتی ہیں۔ آج وہ جواہر لال کی "میزبان" بھی ہیں اور "مشفق سرپرست" بھی۔ ان کی ساری چھوٹی بڑی ضرورتوں کا خیال رکھتی ہیں۔

جواہر لال کی قد آور، بلند آہنگ، شہ زور، لیکن منتشر مزاج شخصیت کے ساتھ اندرا کی نسائی دل کشی، نرمی اور ٹھیراؤ نے امریکہ، روس، چین یوروپ، غرض ساری دنیا کا سفر کیا ہے۔ اپنے اپنے رنگ میں یکتا، ان دو ذاتوں کا یہ آمیزہ بے پناہ حسین ہو گیا ہے۔ اندرا گھر کے انتظام میں طاق ہیں۔ اپنے باپ کی وسیع رہائش گاہ کے سولہ رہائشی کمروں کو وہ ایسا سجا سنوار رکھتی ہیں کہ دیکھنے والا عش عش کر اٹھے۔ ان کا ذوقِ آرائش ہر کمرے کو انفرادیت بخشتا ہے۔ فرنیچر، تصویروں، آرٹ کے نادر نمونوں، سجاوٹ، سب میں ان کی خوش ذوقی جھلکتی ہے۔ نگرانی، انتظام اور دیکھ بھال وہ خود ہی کرتی ہیں۔

کبھی کبھی لوگ سوچتے ہیں، کیا اندرا کے لئے نہرو کی "دیکھ بھال" صبر آزما اور مشقت طلب کام نہیں؟ اس سوال کو وہ ہمیشہ ٹال جاتی ہیں۔ وہ تو بس لگن، محنت اور اور حوصلے سے کام کئے جاتی ہیں۔ کام کرنا ہی ان کے نزدیک کامیابی ہے، عمل خود عمل کا انعام ہے۔ تاہم اتنا تو سبھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایسے باپ کو مطمئن رکھنا کچھ آسان کام نہیں جو شدید مصروف ہو، برق رفتار ہو اور ہر بات مرضی کے مطابق چاہے۔ نہرو میں اکبر کی فراست، گاندھی کی روشن ضمیری اور لنکن کے آدرش جمع ہیں —— اندرا کو بھی ان سب کا بڑا حصہ ملا ہے۔

ان کا سارا اقتدار اور اعزاز محض خاندانی تعلقات کا عطیہ نہیں۔ ویسے بھی ان کا اثر کافی ہے۔ وہ ہندوستان کے بہت سے اعلیٰ انتظامیہ اور قانون ساز اداروں کی سرگرم رکن ہیں۔ کانگریس پارٹی کی گیارہ افراد پر مشتمل مرکزی انتخابی کمیٹی کی وہ بھی ممبر ہیں۔ یہ کمیٹی الیکشن کے لئے پارٹی کے امیدواروں کو نامزد کرتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ بہت سی ثقافتی اور سماجی انجمنوں کی رکن ہیں، مثلاً کانگریس پارٹی کے رضاکاروں کی تربیت کی کمیٹی، چھوٹی بچیوں کے منصوبے کی کمیٹی، ہندوستانی کونسل برائے بہبودیٔ اطفال، چلڈرنس فلم سوسائٹی، سماجی بہبود کا مرکزی بورڈ، وغیرہ۔ ان کی ذمہ داریاں روز بڑھتی ہی رہتی ہیں۔ وہ جہاں بھی پہنچتی ہیں، عورتوں کے ہونٹوں پر ان کی تعریف ہوتی ہے، بچے ان پر پھول برساتے ہیں، بڑے ان سے مشورے مانگتے ہیں۔

کسی کو علم نہیں کہ اندرا کے سیاسی رجحانات کیا ہیں۔ شاید وہ خود بھی نہیں جانتیں۔ ان کے لئے تو اتنی آگاہی ہی کافی ہے کہ اپنے باپ پر پورا اعتماد رکھیں انہیں کے نقشِ قدم پر چلیں۔ ویسے پچھلے دنوں وہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی پر بہت گرجی برسی ہیں۔ حتیٰ کہ انہیں "چھپے ہوئے غدار" اور "پانچویں کالمی" بھی کہہ گئی ہیں۔ تاہم وہ بیباکی سے سوشلسٹ ہیں۔ عملی زندگی میں سادگی برتتی ہیں، قیمتی، زرکار لباس اور زیورات

نئے ہندوستان کی محبوب، اندرا گاندھی، کلہاڑی کے کچھ نمائندوں کے ساتھ کھدر کی ٹوپی اور گھاگھرا پہنے بیٹھی ہیں

استعمال ترک کر رکھا ہے۔ ہاتھ کی بنی ہوئی ساڑھیاں اور سادے بلاؤز پہنتی ہیں۔ اپنے باپ کی طرح کو آپریٹو کھیتی اور بڑی صنعتوں کے فروغ کی حامی ہیں۔

اندرا ۱۹ نومبر ۱۹۱۷ کو پیدا ہوئیں۔ سیاسی اور عوامی زندگی گزارنے کی چاہ انہیں بچپن ہی سے تھی۔ پچھلے دنوں انہوں نے ایک اخباری نامہ نگار کو بتایا، "میری سیاسی زندگی تو تین سال کی عمر میں ہی شروع ہو گئی تھی۔ گڑیاں کھیلنا، بچوں کے جھگڑے، دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل کود، مجھے کچھ یاد نہیں۔ بچپن میں تو میرا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ ایک اونچے اسٹول پر کھڑی ہو جاتی اور نوکروں کو جمع کر کے دھواں دھار تقریر شروع کر دیتی!" چار سال کی عمر میں وہ اپنی ماں کے ساتھ پارٹی کی میٹنگوں میں جانے لگیں۔ بارہ سال کی ہوئیں تو اپنے باپ کے ساتھ انگریزوں کے خلاف صف بیرا کانگریس پارٹی میں شامل ہونے کے لئے ضد کرنے لگیں۔ اجازت نہ ملی تو انہوں نے ایک نئی راہ نکالی۔ انہوں نے ایک "بندروں کا دستہ" بنایا۔ یہ "بندر" انگریز سپاہیوں سے بچتے بچاتے محبِ وطن قیدیوں تک پیغام پہنچایا کرتے تھے، لاٹھی چارج میں جو لوگ زخمی ہوتے تھے انہیں فوری طبی امداد پہنچاتے تھے، قوم کی راہ میں مرنے والوں کی بیواؤں کے لئے مالی امداد کا انتظام کرتے تھے۔ جب اندرا چودہ سال کی ہوئیں، تو کسی کے روکے نہ رکیں اور قوم کے درد کے جرم میں جیل بھیج دی گئیں۔ اس طرح سختیاں سہنے اور مشقت کرنے کی تربیت انہیں بچپن سے ہی ملی۔

دنیا کا دستور ہے کہ اہم شخصیتوں کی لوگ رپس کرتے ہیں۔ ان کی ایک ایک بات پر تبصرے کئے جاتے ہیں، بحثیں ہوتی ہیں۔ ان کی عادتیں اپنائی جاتی ہیں۔ لباس اور وضع قطع کی نقلیں ہوتی ہیں۔ اندرا بھی اونچی سوسائٹی میں اکثر بات چیت کا موضوع بنتی ہیں۔ عورتوں کے رسالوں میں فیشن کے کالموں میں اکثر ان کا ذکر آتا ہے۔ ان کے لباس، ان کے بال بنانے کے ڈھنگوں پر گفتگو ہوتی ہے۔ مشورے دئے جاتے ہیں۔ ایک بار ایسا ہوا کہ انہوں نے اپنے بالوں کو چھوٹے سے جوڑے کی شکل میں لپیٹ لیا۔ ایک اخباری نامہ نگار نے فوراً ان پر مغربی وضع کی نقل کرنے کا الزام لگا دیا!

وہ جب روس کے دورے پر گئیں تو انہوں نے رنگا رنگ، لیکن سادی چھپی ہوئی ریشمی ساڑھیاں پہنیں۔ جنوبی ہندوستان میں غلغلہ مچ گیا، ان کا دعوے تھا کہ جنوبی ہندوستان کی چھپی ہوئی ریشمی ساڑھیوں کا کہیں جواب نہیں۔ رنگوں میں اندرا گاندھی کو نیلا، زرد شوخ سرخ، گہرا سبز اور ہلکا بادامی رنگ پسند ہیں۔

اندرا سیاسی اور سماجی مصروفیتوں میں پھنسی رہتی ہیں، لیکن پھر بھی وہ ماں کا منصب نہیں بھولتیں۔ جب ان کے دو بیٹے راجو (پیدائش: ۱۹۴۴) اور سنجے (پیدائش: ۱۹۴۶) دہرہ دون میں اسکول میں ہوتے ہیں تو ہر دوسرے تیسرے دن انہیں خط لکھتی ہیں، خیریت پوچھتی ہیں، ہدایتیں دیتی ہیں، ان کے مشغلوں سے آگاہی حاصل کرتی ہیں۔

جانوروں سے انہیں اور جواہر لال کو بڑی محبت ہے۔ تین شیر کے بچے، دو چیتے کے بچے اور دو بندر (ہمالیائی لنگور) پال رکھے ہیں۔ وہ ان کی نگہداشت بڑی توجہ سے کرتی ہیں۔ پچھلے دنوں ایک مرتبہ تمام رات سارا نہرو خاندان ایک جانور کی دیکھ بھال میں جاگتا رہا، جو بیمار ہو گیا تھا۔

ایسا بھی نہیں کہ وہ محض جواہر لال کی شخصیت کی پرچھائیں ہوں، ان کا اپنا وجود قطعی غیر اہم ہو۔ ان پر باپ کا بڑا اثر پڑا ہے، ان کے حوصلوں میں، آرزوؤں میں اس عظیم کردار کا بڑا ہاتھ ہے، لیکن اندرا گاندھی کا اپنا نرم و نازک، کومل اور دل کش وجود بھی ہے، اور یہ وجود بذاتِ خود دنیا کی عظیم شخصیت ہے۔

سنہ ۱۹۶۷ء میں کانگریس کی صدارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد اندرا گاندھی کی پہلی پریس کانفرنس

کرکے سولہ سنگار ـــــ گوری چلی پی کے دوار
راجپوت دور کی ایک تصویر

ظفر پیامی

سولہ سنگار

سوا دو ہزار برس پہلے پانی پت کے مشہور شاعر امارو نے مہاراج بندوسار کی موت پر لکھا:

"جب سے مہاراج سورگ سدھارے ہیں شہر کی حالت ایسی ہے جیسے بارش بغیر کھیتی، جیسے ہوا بغیر پرندہ، جیسے پانی بغیر دریا، جیسے روشنی بغیر سورج، اور جیسے سنگار بغیر ناری (عورت) ہو"

ساڑھے بائیس سو برس پہلے بھی ناری کے سنگار کی وہی اہمیت تھی جو کھیت کے لئے بارش، پرندے کے لئے ہوا، دریا کے لئے پانی اور سورج کے لئے روشنی کی ہے۔ عورت کو یہ لوگ کائنات کی حسین ترین تخلیق ہی نہیں اس کی "خالقہ" بھی سمجھتے تھے۔ خیال یہ تھا کہ کائنات کا ذرہ ذرہ عورت کے گرد گھومتا ہے۔ عورت کا یہ فرض ہے کہ ہیروں سے لے کر سنگریزوں تک کو اپنی شخصیت میں سمولے اور زندگی کا کوئی حسن ایسا نہیں جو عورت کی شخصیت میں سموئے جانے سے پہلے مکمل ہو سکے۔

اس طرح قدیم ہندوستان نے نظر کی وہ وسعت دکھائی جو ہزاروں برس بعد کی تہذیبوں کے حصے میں مشکل ہی سے آسکی۔ اس تہذیب میں عورت نے چھپ چھپ کر اور ڈر ڈر کر سنگار نہیں کیا، بلکہ اس کا یہ فرض تھا کہ وہ سنگار کرے تاکہ "دھرتی کی بیٹی" کہلانے کے قابل ہو سکے۔ اس فرض کو پورا کرنے کے لئے گرنتھوں پر گرنتھ لکھے گئے اور ایک مکمل علم وجود میں آیا جسے "سنگار شاستر" کہا جاتا ہے۔

خیال ہی نہیں بلکہ مسلمہ بات یہ ہے کہ یہ "سنگار شاستر" یعنی ہندوستانی علم جمالیات دنیا بھر میں جمالیات کے معاملے میں سب سے مکمل اور سب سے بھرپور انداز فکر پیش کرتا ہے، جس میں مختلف موقعوں پر مناسب ذہنی کیفیت کے بیان سے لے کر یہ ہدایتیں تک درج ہیں کہ فلاں سنگار میں گھر کی صورت اور رنگ روپ کیا ہونا چاہئے۔ لیکن ہندوستان کے اس سنگار شاستر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ آج ہزاروں برس بیتنے کے بعد سنگار کے نظریوں میں تو تبدیلی ضرور ہوتی ہے (اب اسے اتنا اچھا نہیں سمجھا جاتا جتنا کہ ہزاروں برس پہلے لوگ سمجھتے تھے) لیکن سنگار کے بنیادی اصول اب تک جوں کے توں قائم ہیں اس لئے ان کی بنیاد وقتی پسند یا فیشن پر نہیں بلکہ زندگی کے اٹل حقائق پر تھی ـــــ سنگار کی بنیاد ظاہری روپ ریکھا پر نہیں بلکہ باطنی بھاؤ اور طینت پر رکھی جاتی ہے۔ سنگار شاستر میں سب سے زیادہ زور جس چیز پر دیا گیا ہے وہ چہرے کا بناؤ سنگار نہیں بلکہ من کی شانتی، چہرے کی شگفتگی اور دل کی فیاضی ہے۔

جہاں تک ظاہری سنگار کا تعلق ہے اس میں دو باتیں مقصود ہیں۔ اوّل تو یہ کہ سچے سنگار کا مقصد جنسِ مخالف کے سفلہ جذبات کو اُبھارنا نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ اس سے عورت کی شخصیت کے وہ تمام پہلو نمایاں ہو جائیں جن کے لئے قدرت نے اس کی تخلیق کی تھی۔ عورت کا تخلیقی عمل کائنات کا حسین ترین رُخ ہے۔

اِس لئے سنگار میں بھی سب سے نمایاں اس کا جذبۂ مادری ہی ہونا چاہیئے۔ "سنگار ایسا نہ ہو جس کی بدولت اسے کرنے والی کی شخصیت کانٹے کی طرح آنکھوں میں کھٹکنے یا سورج کی طرح نگاہوں کو چُندھیانے لگے، بلکہ سچا سنگار وہ ہے جس سے عورت کی شخصیت ساری کائنات کا ایک ایسا حصہ دکھائی دے جس کے بغیر کائنات مکمل نہ ہو سکتی ہو اور جس کی موجودگی سے اس کے اپنے جسم ہی کا نہیں بلکہ آس پاس کی ہر چیز کا حُسن نکھر آئے۔"

شکنتلا کے کنوارے حُسن کا بیان کرتے ہوئے کالیداس نے کہا ہے "جب وہ

غسل کے بعد ـــــ ایک مغل شہزادی "سنگار گھر" میں۔ باندیوں کا اپنا سنگار بھی قابلِ غور اور قابلِ دید ہے

پودوں کو پانی دیتی تو بن کی لتائیں (بیلیں) اتراتی دکھائی دیتیں، ہرنوں پر فرشتوں کا گمان ہوتا۔ دھرتی سنہری ہو جاتی اور ساری فضا پر سورج کی پہلی کرن کی لالی (سُرخی) چھا جاتی" ـــــ شکنتلا کے حُسن کا بیان تو کالیداس ہی کی زبان تک محدود ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ سنگار کبھی اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا جو اپنے وقت اور ماحول سے ہٹ کر ہو۔ اس بات کا سہرا ہندوستان کے ماہرِ جمالیات ہی کے سر ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے یہ دریافت کیا کہ سنگار کو موسم کے ساتھ ہی ساتھ نہیں بلکہ دن اور رات میں بھی وقت کے مطابق بدلتے رہنا چاہئے۔ یہاں تک کہ تین ہزار برس پہلے کے ایک ماہرِ جمالیات نے دن اور رات کو سولہ حصوں میں تقسیم کر دیا تھا اور ہر حصے کے لئے سنگار کے جدا جدا روپ تجویز کئے تھے۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ زیادہ اہم اور قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں سنگار کا تصور عمر کے مطابق بدلتا ہے اور سات برس سے لے کر ستر برس تک (دادی اماں بھی پھیش کرتے تھیں) عمر کے سات مختلف حصے بنا کر ان کے لئے سنگار کا علیحدہ علیحدہ ڈھنگ بھی موجود تھا۔ ان سات حصوں کا بیان تو خیر ایک لمبی بحث میں الجھنا ہوگا، لیکن زیادہ اہم حصے تین ہی ہیں۔ یہ ہیں کنوارپن کا سنگار، جوانی یعنی بیاہتا کا سنگار اور عمر کے آخری حصہ کا سنگار۔ چونکہ پہلے دو حصے زندگی کے "نامکمل" روپ سمجھے جاتے ہیں، اس لئے زیادہ زور جوانی سنگار ہی پر دیا گیا ہے جس کے مختلف اجزاء کو ملا کر وہ رومانوی نام دیا گیا ہے، جو سینکڑوں ہزاروں شاعروں کے خوابوں کی معراج رہا ہے اور جس پر حُسن و جمالیات کے ہر شیدائی نہ جانے کتنی راتوں کی نیند صرف کی ہوگی۔

"سولہ سنگار" کے متعلق یاد رکھنے کی پہلی اہم چیز تو یہ ہے کہ اس کے بعد بھی سنگار کو مکمل نہیں سمجھا جاتا۔ اس لئے کہ یہ محض سنگار کا ظاہری روپ ہی ہے۔ باطنی سنگار کے یعنی مزاج سُبھاؤ اور رُوح میں حُسن پیدا کرنے کے لئے سولہ دوسرے لوازمات بھی ہیں جن کے بغیر کوئی سنگار سج نہیں سکتا۔ یہ سولہ لوازمات کیا ہیں ان کا ذکر تو پھر کبھی ہوگا لیکن فی الحال یہی جاننا کافی ہوگا کہ اگر مزاج میں حلیمی، روح میں بالیدگی اور طبیعت میں شگفتگی اور ذہانت ہو تو پھر جسم کے سنگار کے لئے جن سولہ سنگاروں کی ضرورت ہوتی ہے ان کا ذکر ظاہری لوازمات میں موجود ہے۔

یہ سولہ سنگار کیا ہیں، ان کے متعلق ایک دلچسپ انکشاف جو خود مجھ پر ہوا وہ یہ کہ یہ محض زیور ہی تک محدود نہیں ہیں، بلکہ ان میں دانتوں کی صفائی سے لے کر بھنویں بنانے تک ہر چیز شامل ہے۔ جسم کے ہر حصے پر زیور پہننا تو محض ان سولہ میں سے سنگار کی ایک ہی ہے۔ پندرہ حصے تو ایسے ہیں جن میں سے اکثر اب تک ہمارے روزمرہ کے معاشرے اور تہذیب کا حصہ رہے ہیں ـــــ ہاں تو یہ ہیں:

۱۔ صاف پانی سے اُبٹن مل کر غسل کرنا۔

۲۔ صاف ستھرے کپڑے پہننا، لباس کیا ہو یہ بذاتِ خود ایک سنگار ہے جس کا علیحدہ ذکر موجود ہے۔

۳۔ مانگ بھرنا اور بال سنوارنا۔

۴۔ پیروں کا سنگار کرنا۔

۵۔ تلک لگانا۔

۶۔ ٹھوڑی پر تِل بنانا۔

۷۔ جسم کے ہر حصے پر موزوں زیور پہننا۔

۸۔ مہندی لگانا۔

۹۔ دانتوں پر مسّی ملنا۔

۱۰۔ آنکھوں میں سُرمہ اور کاجل لگانا۔

۱۱۔ پان کھانا۔

۱۲۔ خوشبو لگانا۔

۱۳۔ گجرا پہننا۔

۱۴۔ بھنویں بنانا۔

۱۵۔ ہاتھوں اور بازوؤں پر نقش و نگار بنانا۔

۱۶۔ ہاتھ میں نیلے کنول کا پھول پکڑنا۔

یہ تمام سنگار اتنا اہم ہے کہ قدیم ہندوستان میں اسے انسانوں ہی تک نہیں بلکہ لافانی ہستیوں یعنی دیویوں اور اپسراؤں (حوروں) (دونوں کے سنگار میں کچھ فرق ضرور ہوتا تھا) پر بھی لازم سمجھا جاتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی پرانی تصویر دیکھ لیجئے، اس میں کوئی ایسی دیوی مشکل ہی سے ملے گی جس نے یہ سنگار نہ کئے ہوں۔

سنگار کا پہلا لازمہ غسل ہے۔ غسل بھی معمولی غسل نہیں بلکہ ایسا غسل جو جلد کو نکھار دے اور جسم کو چمکا دے۔ اس کے لئے سو طرح کے جتن کئے جاتے۔ خاص خاص جگہ کا پانی منگوایا جاتا (سیتا جی کے غسل عروسی کے لئے ایک ہزار ندیوں اور دریاؤں کا پانی آیا تھا۔ بالمیک) سو طرح کے پھولوں کو اس میں ڈالا جاتا۔ (اسی سے بعد میں نور جہاں نے عطر ایجاد کیا تھا) اُبٹن بنتے تو ہفتوں بلکہ مہینے اس کی تیاری میں بیت جاتے ـــــ لیکن عام ترین اور مقبول ترین اُبٹن وہی، بیسن، آنولے، دودھ کی بالائی اور زعفران کو ملا کر بنایا جاتا تھا اور بُرے دنوں کی نشانی یہ سمجھا جاتا جب جوان بیاہتا عورت کے پاس اُبٹن بنانے کی سکت بھی نہ رہے۔

غسل میں بھی نت نئی ایجادیں شامل ہوتی گئیں۔ مغلوں کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے تو غسل ایک مکمل فن کا روپ اختیار کر چکا تھا۔ شاہجہاں کے وقت میں آنے والے انگریز سیاح برنیر نے تو لکھا ہے کہ "مغل شہزادیاں سال بھر میں سات بار "غسلِ اعظم" کرتی ہیں، جس کے لئے سینکڑوں باندیاں خدمت پر مامور ہوتی ہیں اور جس میں کئی کئی گھنٹے تو درکنار کئی کئی دن گزر جاتے ہیں۔" وہ غسل تو خیر "کایا کلپ" کا غسل ہی ہوتا ہوگا لیکن عام عورتوں کے غسل میں بھی محض پانی سے نہانا ہی شامل نہیں تھا بلکہ دھوپ میں سُستانا، ورزش، مالش اور مختلف صفائیوں کا استعمال سب ہی کچھ ضروری سمجھا جاتا۔

غسل کے بعد سنگار کا دوسرا لازمہ موزوں لباس ہے۔ یہ ایسا ہونا چاہیئے کہ موقعہ اور ماحول کی مطابقت کے ساتھ ہی ساتھ صحت کے لئے نقصان دہ ثابت نہ ہو۔ اس لئے کہ صحت پر جتنا زور ہندوستانی جمالیات میں دیا گیا ہے شاید اور کسی ملک میں نہیں دیا گیا۔ صحت پر خوراک کے بعد لباس ہی کا سب سے زیادہ اثر ہوتا ہے۔ اس لئے کپڑے کی سردی گرمی اور تراش خراش سے لے کر اس کے رنگ تک اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اس کا صحت پر اچھا ہی اثر پڑے بُرا نہیں۔

لباس کے بعد سنگار میں پھولوں کا مقام آتا ہے۔ دراصل زیور کے معاملے میں بنیادی زیور پھولوں ہی کا سمجھا جاتا ہے ـــــ اس لئے جب پھولوں کے ساتھ ساتھ سونے اور چاندی کے زیور آ گئے تو بھی وہی ڈیزائن اب تک سب سے زیادہ مقبول ہیں جن میں

آج کا سنگار۔ پھول آج بھی سنگار میں داخل ہیں۔

پھولوں کی شکل بنی ہوتی ہے۔ جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں جس کے لئے پھولوں کا سنگار موجود نہ ہو۔ لیکن بالوں میں پھولوں کی بینی اور ہاتھوں میں پھولوں کا گجرا نہ پہنا تو بدترین قسم کی بدشگونی سمجھی جاتی جس کی اجازت محض ماتم ہی کے موقعہ پر ہو سکتی تھی۔

پھولوں کے ساتھ ہی ساتھ بالوں کو سنوارنا اور گوندھنا بھی بہت بڑا کام تھا اور اتنا پیچیدہ ہوتا کہ قدیم اور قرون وسطیٰ کا ہندوستانی ادب ایسی نائیکاؤں اور نائنوں کے بیان سے بھرا پڑا ہے جو گھر میں بال گوندھنے آتی تھیں لیکن نفاق اور فساد کی چنگاری پھینک کر چلتی بنتی تھیں۔ بی جمالو بھی کہتے ہیں کہ ان ہی کے خاندان سے تھیں۔

بالوں کے متعلق بنیادی نظریات دو تھے۔ ایک تو لمبے بال حُسن کی بہترین نشانی ہیں اور دوسرے یہ کہ سہاگن کو کھلے بال ہرگز نہیں رکھنے چاہئیں۔ محض نہا کر دھوپ میں سُکھاتے وقت بال کھولنے کی اجازت تھی ورنہ جتنی زیادہ محنت سے انہیں گوندھا جاتا اتنا ہی حُسن پرست انہیں گوندھنے والی کو کہا جاتا۔

بال گوندھنے ہی کے ساتھ سنگار کے دو اور لوازمات شامل ہو گئے۔ وہ تھے مانگ نکالنا اور سیندور بھرنا۔

ان میں سے مانگ نکالنا تو ہندوستان ہی نہیں بلکہ تقریباً سارے مشرق میں آرائشِ گیسو کا ایک حصہ بن چکی ہے لیکن سیندور ڈالنا خالص ہندو نظریہ ہے۔

سولہ تو نہیں، بارہ تیرہ سنگار تو اس کشمیری حسینہ نے اب بھی کئے ہوئے ہیں۔

قدیم ہندوؤں کے نزدیک مانگ میں سیندور ڈالنے کے کئی فائدے تھے۔ ایک تو یہی کہ سیاہ بالوں میں سُرخی بالوں کی چمک اور رُوپ میں اضافے کا باعث تھی۔ دوسرا یہ کہ اس کی بدولت کنواری اور بیاہتا میں ایک بنیادی تمیز ممکن تھی، اور ایک تیسرا دعوےٰ یہ ہے کہ سیندور میں ایسی طبّی خاصیت ہے کہ وہ دماغ کو ٹھنڈا رکھتی ہے اور بیاہتا عورت کو دماغ ٹھنڈا رکھنے کی ضرورت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

سیندور کے بعد کاجل اور سُرمہ کی باری آتی ہے اور اس کے ساتھ سنگار میں آنکھوں کی اہمیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ کاجل اور سُرمہ دونوں کی بنیادی خاصیت یہی ہے کہ وہ نہ صرف گورے چہرے پر کالی سیاہ آنکھوں کا حُسن نمایاں کرتے ہیں بلکہ آنکھوں کی صحت کے لئے بھی بہت زیادہ مفید سمجھے جاتے ہیں۔

سُرمہ بنانا (اور سُرمہ بھی بیسیوں قسم کا تھا) جُوئے شیر لانے سے کم تو تھا ہی نہیں لیکن اچھا کاجل تیار کرنا بھی آسان نہ تھا۔ سرسوں کے تیل کی سیاہی میں آنکھوں کو تازگی بخشنے والی خاصیت کا مقابلہ کئی جدید کیمیاوی مرکّب بھی آسانی سے نہیں کر سکتے۔

اسی کے ساتھ بھنویں بنانے کا ذکر آتا ہے۔ گو قدیم ہندوستان میں بھنویں اکھاڑنے کا رواج نہیں تھا اور محض سیاہ سُرمے کی سُوئی سے انہیں زیادہ لمبا اور باریک ہی کیا جاتا لیکن مغل دَور میں یہ چیز بھی فیشن میں داخل ہو گئی۔ بلکہ کہتے تو یہ ہیں کہ موٹی بھنویں جڑ سے اکھاڑ کر ان کی جگہ سُرمے کی پتلی لکیر لگانے کا رواج امریکہ کی فلم ایکٹرسوں کا نہیں بلکہ دہلی اور اکبرآباد کی شہزادیوں ہی کی دنیا کو دین ہے ـــــ اُن کے وقت تک تو بھووں کے عین اوپر ہیروں سے مرصّع سونے کی بھنویں پہننے تک کا رواج شروع ہو گیا تھا جو کئی پہاڑی علاقوں میں اب تک قائم ہے۔

آنکھوں کے بعد ناک کی باری آتی ہے۔ یہاں پر نتھ اور کیل کا استعمال لازمی تھا اور کانوں میں بُندے اور بالیاں تو اب تک چلتے ہیں۔ یہی حال ماتھے کی چندر مکھی اور گلے کے مختلف ہاروں اور گلوبند، سہاگ کی نشانی منگل سُوتر، پیروں کے بچھوؤں، ٹخنوں کی جھانجروں اور کمر کی طلائی پیٹی کا تھا۔ اس طرح سولہ سنگار کے ایک ہی لوازمے میں کُل ملا کر اکیاون زیور شمار ہوتے تھے۔ ان میں سے کم از کم گیارہ گردن، کلائیوں، پیروں، ٹخنوں، انگلیوں، کانوں اور ناک کے زیورات کا استعمال سہاگن پر لازم تھا اور ان کے بغیر کوئی سنگار مکمل ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ شرط ہرگز نہ تھی کہ زیورات سونے یا ہیروں ہی کے ہوں۔ بلکہ اگر ان کی گنجائش نہ ہو تو یہ سارے زیورات پھولوں، پتّوں اور خوبصورت پتھروں اور کانچ کے بھی ہو سکتے تھے، بلکہ اس قسم کے سنگار کو، چونکہ وہ بہت مشکل تھا، بہترین مذاقِ جمال کی دلیل سمجھا جاتا۔

زیور کے سنگار میں ڈیزائن وغیرہ کے علاوہ ایک بات جس پر بہت زیادہ زور دیا جاتا اس کا تعلق آواز سے تھا، بلکہ پاؤں اور بازوؤں کے زیوروں کا تو ایک بنیادی لوازمہ یہ بھی تھا کہ ان سے ایسی آواز پیدا ہو جو سننے میں خوش آئند ہو اور پہننے والی کی چال ڈھال اور جسم کی حرکات میں سُر تال بھر دے۔ پاؤں میں جھانجروں بدولت اگر چال بے ڈھنگی ہوئی تو اس کا خود بخود پتہ چل جائے گا۔ گویا آواز کا ایک حُسن تو یہ ہے کہ وہ انسان کی سننے کی قوّت کی تکمیل کرے اور دوسرا یہ کہ وہ چال ڈھال میں ترتیب پیدا کرنے میں مدد دے بلکہ ہندوستانی سنگار کا بنیادی نکتہ ہی یہ ہے کہ اس سے انسان کی پانچوں حسوں کی تکمیل ہو سکے، اور یہ تکمیل ہی دوسرے کے لئے ہی ضروری نہیں بلکہ خود سنگار کرنے والی کی اپنی خوشی کے لئے بھی لازم ہے۔ اس لئے آواز کے ساتھ ہی ساتھ خوشبو کا خیال رکھا گیا ہے جو سولہ سنگاروں میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے اور جس کی بدولت ہماری سونگھنے، دیکھنے اور سننے کی حسوں میں مطابقت پیدا ہوتی ہے۔

عطر تو خیر مغلوں کی دین ہے لیکن قدیم ہندوستان میں بھی پھولوں سے کچھ ایسے معجون ضرور بنائے جاتے تھے، جنہیں لگا لینے یا لباس میں چھپا لینے سے خوشبو اور عطر کا کام چل سکتا تھا۔ مقبول ترین خوشبوئیں، زعفران، کستوری، لوبان اور مختلف پھولوں ہی سے بنائی جاتی تھیں اور قدیم زمانے ہی سے ان کا اتنا شدید اثر بتایا گیا ہے کہ جب "اپسرائیں

آسام کے قبائل میں سارے سنگار (پان اور کنول کے سوا) آج بھی چلتے ہیں۔

رشیوں اور زاہدوں کی ریاست اور کسی طرح نہ تو ڑ سکتیں تو باس اور سوگندھ (خوشبو) کا سہارا لیتیں۔" قدیم وقتوں ہی سے ہمارے ہاں مختلف موقعوں کے لئے مختلف خوشبوؤں کے استعمال کا رواج رہا ہے اور میرا تو یہ خیال ہے کہ اس معاملے میں اب بھی ہم خود اور مغرب والے ہمارے ماضی سے اس سلسلے میں بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ خاص طور پر مغلوں کے زمانے سے جب سے کہ عطر ایجاد ہوئے، خوشبو سنگار باقاعدہ ایک فن کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

پان کھانے اور مسی لگانے کا تعلق بھی ایک تو اسی خوشبو کی ضرورت پورا کرنے سے تھا اور دوسرا ایک ایسی چیز سے تھا جس کی جانب ہندوستانیوں کے سوائے دنیا کی کسی اور تہذیب نے بہت ہی کم دھیان دیا ہے۔ وہ ہے دانتوں کی صفائی اور دیکھ بھال۔ پان سے بھی صحت اور حسن کے ان ہی دو متوازی تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی جاتی۔ جہاں تک حسن کا تعلق ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دنیا میں سُرخ لپ اسٹک کے سب سے پہلے استعمال کا فخر ہندوستان ہی کی مٹی کو حاصل ہے۔ ہزاروں برس پہلے مصر کی بیٹیاں ہونٹوں پر سفید اور زرد رنگ لگاتی تھیں اور بابل اور نینوا کی عورتوں کے سنگار میں ہونٹوں پر کیلے کے سبز پتوں کا رس لگانا بھی شامل تھا لیکن ہندوستان میں شاید گندمی رنگ کی مناسبت سے محسوس کیا گیا کہ ہونٹوں کی بہترین زیبائش سُرخ رنگ ہی سے ممکن ہے۔ اور مسی اور اخروٹ کے پیڑ کے چھلکے کی داتن سے گہرا سُرخ رنگ پیدا ہو سکتا تھا۔ تو سُنا آپ نے یہ جو بڑی بوڑھیاں اخروٹ کی داتون (یا دنداسہ) ملتی اور پان چباتی تھیں تو اس میں بھی مصلحت محض "نزلے"

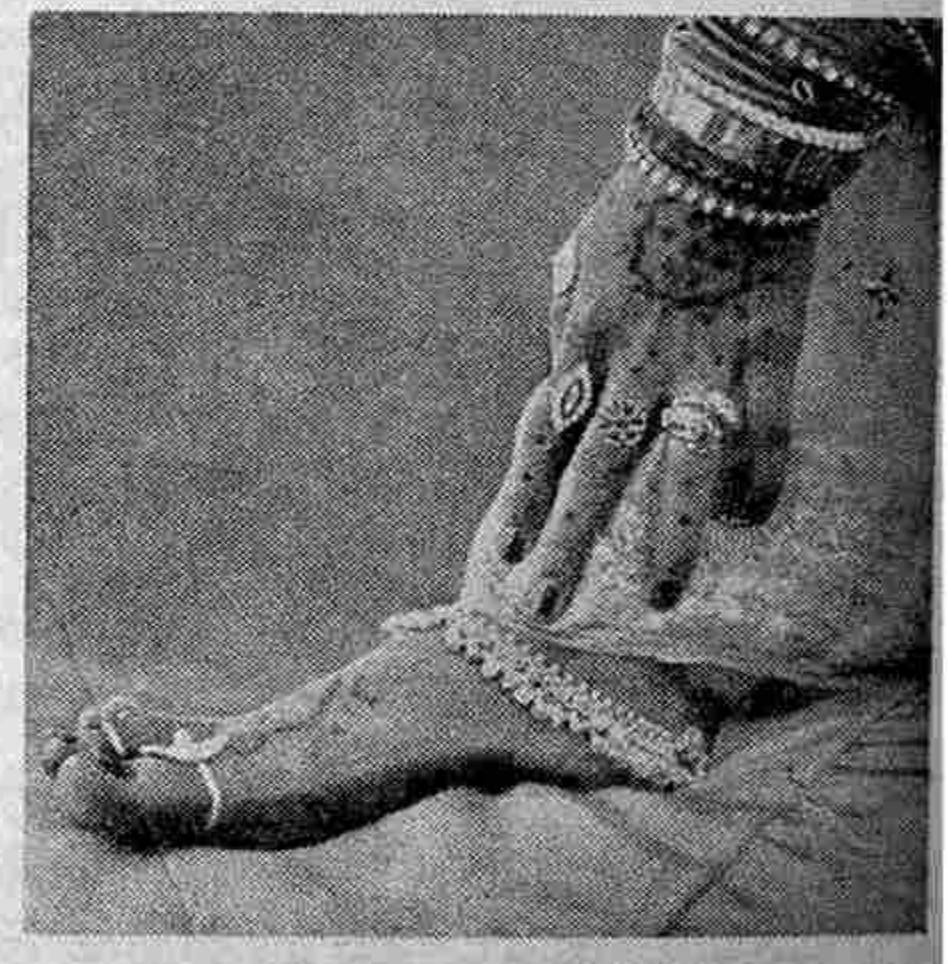

ہاتھ اور پاؤں کا سنگار۔

سے بچنے کی نہیں تھی بلکہ یہ بھی تھی کہ بڑی بوڑھیوں کی "بڑی بوڑھیوں" کو بھی کبھی آج کی طرح لپ اسٹک لگانے کا چاؤ رہا ہوگا۔

اور پھر جو پان کی گلوریاں بنتیں تو وہ محض ایک ہی طرح کی تو نہیں ہوتی تھیں۔ عمر، صحت، ماحول اور موقعہ کے مطابق اس کی بھی الگ الگ قسمیں تھیں۔ اور تو اور مشہور ہندوستانی حکیم اور ماہر جمالیات دھنونتری کے ہاں تو محض گھریلو استعمال کے پان بنانے ہی کے ایک سو ایک (یہ ایک سو ایک کی تعداد ہمارے قدما کی شاید خاص طور سے پسند تھی) نسخے درج ہیں۔

اب بتلایئے جس ملک میں فیشن اور سنگار کی روایتیں اتنی گہری اور بڑی ہوں وہاں دادی اماں کا یہ کہنا کتنا بڑا جھوٹ ہے کہ "میاں بس زمانے کو آگ لگ گئی ورنہ اپنے وقتوں میں تو... کاش دادی اماں جان سکتیں کہ ان کی دادی اماں کے وقت "زمانے" کو کتنے شدید طور پر آگ لگی ہوئی تھی۔

سراج انور

اللہ نے ملائی جوڑی....

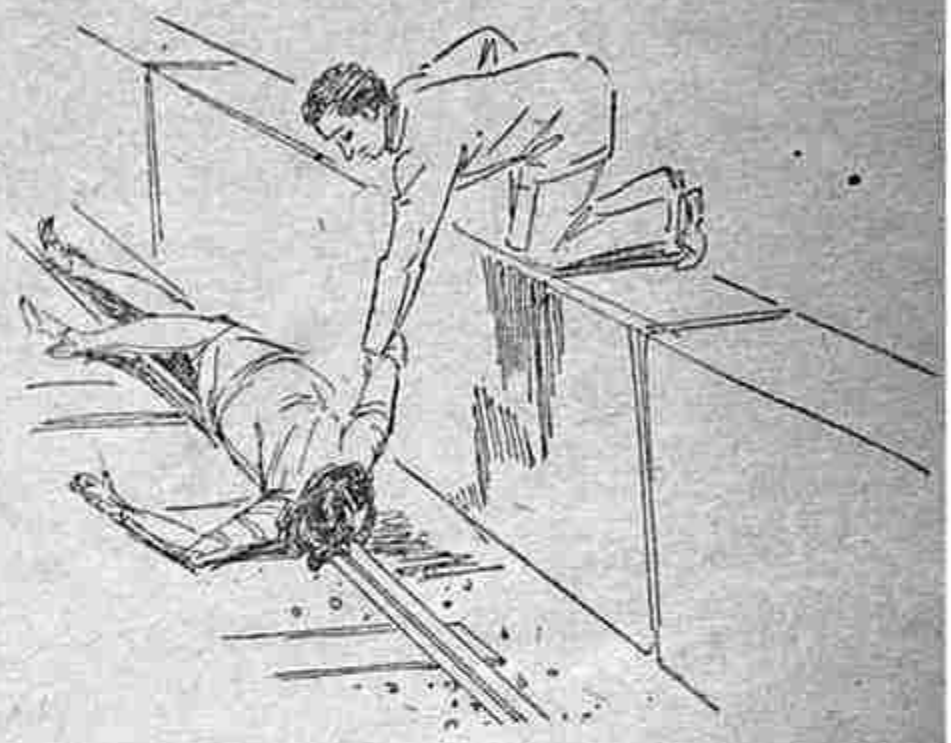

ایک زمانہ وہ تھا جب کہ ردمانی شاعر تصوراتی محبوبہ کی تعریف کرتے کرتے مرگئے۔ جب بھی کسی شاعر نے اپنے اشعار میں کسی سیم تن کے حسن جہاں سوز کے بارے میں کچھ لکھا، قد کو اُس نے سب سے مقدم سمجھا۔ محبوبہ کو ہمیشہ سرو سے تشبیہہ دی گئی سرو کی اونچائی کو ناکافی سمجھتے ہوئے تو کئی شاعر اور دو ہاتھ آگے نکل گئے۔ قد کو انہوں نے تاڑ کے برابر بنا دیا۔ جسم کے بارے میں کہا گیا کہ شاخ گل کی طرح لچکیلی اور نرم و نازک ہے۔ اس قسم کی محبوبہ کے تصور سے جو تاڑ کو شرماتی ہوا در حیقیقی ہو تو ہیں تو دہشت ہوتی ہے۔ لیکن شاعروں کو بنت حوا ہمیشہ اسی قسم کی پسند آئی۔ اور اُس کو ہی انہوں نے تختۂ مشق بنایا ـــــ مگر اب ایک زمانہ یہ ہے کہ شعراء کی وہ مفروضاتی محبوبہ حقیقت کا جامہ پہن کر لندن کی باربرا کے روپ میں ہمارے سامنے ہے۔ باربرا کا قد درحقیقت سرو کو شرماتا ہے۔ وہ سات فٹ دو انچ لمبی ہے اور یقین مانیئے کہ یہ طول شب فراق سے بھی زیادہ ہے۔

باربرا نے اخباری نمائندوں کے کچھ سوالوں کے جواب دیتے وقت جو کچھ بھی کہا ہے وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ پہلے وہ اکیلی تھی لیکن اب اُس نے اپنا چیون ساتھی بھی تلاش کر لیا ہے۔ اُس کے اِس چیون ساتھی کا قد بھی کچھ کم نہیں۔ باربرا سے نکلتا ہوا ہی ہے۔ اگر آپ یقین کر لیں تو اس کا ساتھی ہیری، باربرا سے ساڑھے پانچ انچ بڑا ہے۔ یعنی اس حساب سے اُس کا قد سات فٹ ساڑھے سات انچ ہے۔

باربرا جیسی خوش قد خاتون کو اپنے ہی جیسا خاوند تلاش کرنے میں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اُس نے کتنی تکلیفیں جھیلیں، کتنی صعوبتیں اُٹھائیں۔ یہ داستان سننے کے قابل ہے ـــــ اُس کی عمر جب چھ سال کی تھی تو اُسے اس بات کا ذرا سا بھی خیال نہ تھا کہ وہ اچانک اتنی لمبی ہو جائے گی۔ اپنی سہیلیوں میں وہ سب سے چھوٹے قد کی تھی۔ اسکول میں اگر کوئی سب سے ٹھگنی لڑکی نظر آتی تھی تو وہ باربرا تھی۔ لڑکیاں اُسے چھیڑتی تھیں اور اُستانیاں اُسے پک نک پر محض اس لئے نہیں لے جاتی تھیں کہ وہ اُن کی نظر میں بچی تھی۔ یہ صورت حال باربرا کے لئے بڑی تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ وہ پہروں تنہائی میں چھپ چھپ کر روتی تھی۔ کنواری مریم کے آگے ہاتھ جوڑ کر وہ بار بار ایک ہی دعا مانگتی کہ خدا اُسے بہت لمبا کر دے۔ اتنا لمبا کہ بگ بین بھی اُس کے آگے پانی بھرے۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ خدا اُس کی دعا قبول کرنے میں اتنا جلد باز واقع ہوا ہے۔ خدا نے اُس کی دعا میں چھپے ہوئے جذبے کو شاید محسوس نہیں کیا۔ اس نے الفاظ سُن لئے اور بس اُسی دن سے اُس کے قد میں نمایاں تبدیلی ہونے لگی۔ چودہ سال کی عمر میں اس کا قد اتنا بڑھ گیا کہ گھر کا قد آدم آئینہ بھی اُسے چھوٹا معلوم ہونے لگا۔ اب اس کا دل چاہنے لگا کہ اب کوئی اُسے کسی شکنجے میں کس دے تاکہ وہ لمبی نہ ہو سکے۔ رونا تو اُس کی قسمت میں لکھا تھا۔ جب وہ کوتاہ قد تھی تب بھی روتی تھی

اور اب سرو قد ہونے کے بعد بھی تنہائی میں اپنی قسمت پر دو آنسو بہا لینا اس کا معمول ہو گیا تھا۔ قد کا یہ بڑھاؤ اگر ایک جگہ رک جاتا تو کوئی بات بھی تھی، مگر یہ تو لگاتار بڑھے ہی جا رہا اور یہ بات باربرا کے لئے تشویش ناک تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ یا اللہ آخر اس کا انجام کیا ہوگا ——؟

اُس زمانے میں باربرا کی مالی حالت بہت کمزور تھی۔ اُس نے سوچا کہ اگر کہیں کوئی ملازمت مل جائے تو اس آڑے وقت میں کافی سہارا مل جائے گا۔ کئی جگہ اُس نے قسمت آزمائی کی مگر صاف جواب ملا۔ آخر بڑی پیر دوڑی کے بعد ایک ریستوران میں کاؤنٹر گرل کے بطور ملازم ہو گئی۔ اُس کا کام یہاں محض اتنا تھا کہ پیمانے بھر کر گاہکوں کو دیتی تھی۔ اگر ایسے موقع پر باربرا ہندوستان میں ہوتی تو کوئی گاہک یہ شعر ضرور پڑھتا۔

ساغر جو دیا ساقئے بالا قد نے
میں بادۂ انگور کو تاڑی سمجھا

مگر باربرا لندن میں تھی اور لندن میں تاڑی ہوتی ہی نہیں۔ اُس ریستوران میں ایک دن اُس کی ملاقات ایک عجیب و غریب ہنس مکھ نوجوان سے ہوئی۔ باربرا نے جب اُسے ایک ساغر بھر کر دیا تو پہلے تو وہ اُسے بغور دیکھتا رہا اور پھر بولا "آپ کا نام کیا ہے؟"

باربرا کے نام بتا دینے کے باوجود بھی وہ اُسے بڑی دیر تک دیکھتا رہا۔ باربرا نے ہنس کر پوچھا "آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟"

اُس نوجوان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "آپ کو سر سے پاؤں تک دیکھنے میں بہت وقت صرف ہوتا ہے!" باربرا یہ سن کر جھینپ گئی، اس پر وہ کہنے لگا "آپ واقعی اتنی لمبی ہیں یا آج ضرورت سے زیادہ اہتمام کر کے آئی ہیں؟"

یہ کہہ کر وہ بہت ہنسا۔ باربرا کچھ ناراض سی ہو گئی اور شاید نوجوان نے بھی یہ بات محسوس کر لی۔ فوراً بولا۔ "آپ ناراض مت ہوئیے، لیکن میں آپ کو ایک شخص کا پتہ بتاتا ہوں۔ وہ آپ سے بھی لمبا ہے۔ آپ اگر اُس کے ساتھ گھومیں گی تو آپ یقیناً چھوٹی نظر آئیں گی۔ دوسرے جس احساس کمتری کا شکار آپ اب ہیں، وہ پھر باقی نہ رہے گا۔"

بات پتے کی تھی۔ باربرا کو پسند آئی۔ اُس نے اُس شخص کا پتہ لے لیا اور اپنے گاہک کا شکریہ ادا کیا۔ دوسرے دن اُس نے لمبے شخص ہیری کو خط لکھا۔ خط کا مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

ہیری صاحب۔

میں پورے لندن میں سب سے لمبے قد کی عورت ہوں۔ باہر گھومنے جاتی ہوں تو لڑکے مجھ پر ہنستے ہیں۔ سینما میں جا نہیں سکتی کیونکہ پچھلی قطار میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے بچوں کی پتنگیں اگر درختوں میں اٹک جاتی ہیں تو لوگ مجھ سے چھڑا دینے کے لئے اصرار کرتے ہیں۔ میں جب بے کار تھی تو کارپوریشن نے مجھے ایک کام دینے کا وعدہ کیا۔ آپ سن کر مسکرائیں گے وہ کام بجلی کے کھمبوں پر رنگ کرنے کا تھا —— فوٹوگرافرز میری تصویر بناتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ وہ ڈرتے ہیں کہ انہیں دو نیگیٹیوز استعمال کرنے پڑیں گے۔ آدھا حصہ ایک نیگیٹو میں اور آدھا حصہ دوسرے میں۔ میں بڑے شش و پنج میں مبتلا ہوں۔ ایک صاحب نے آپ کا پتہ دیا کہ چشم بد دور آپ بھی آسمان کو چھونے کے درپے ہیں۔ یہ سوچ کر آپ کو مخاطب کر رہی ہوں کہ اگر آپ اپنا دست رفاقت میری طرف بڑھائیں تو میں اُسے نہایت گرم جوشی سے تھام لوں گی۔ کیا میں امید کروں کہ آپ جواب جلد دیں گے۔

آپ کی، باربرا

یہ خط لکھ کر اُس نے ڈاک میں ڈال دیا۔ ہر روز وہ جواب کا انتظار کرتی مگر خط آنا تھا نہ آیا۔ آخر ایک دن جب کہ وہ بالکل ناامید ہو گئی تھی۔ خلاف توقع خط آ گیا۔ پڑھ کر اُس کے دل کی کلی کھل گئی۔ خط میں لکھا تھا۔

اُونٹنی صاحبہ۔

اس اُونٹ کا سلام قبول ہو (حال آں کہ یقین ہے کہ اونٹ بھی ہم دونوں سے چھوٹا ہوگا!) یہ جان کر مسرت ہوئی کہ آپ بھی خادم سے قد میں بازی لے جا رہی ہیں۔ اگر ہم دونوں کے درمیان کسی موٹے سے آدمی کو کھڑا کر دیا جائے اور پھر اس گروپ کی تصویر لی جائے تو بخدا ہندوستان کے تاج محل کا نقشہ بن جائے گا۔ اپنی لمبائی کے بارے میں کیا عرض کروں؟ دریائے ٹیمز کو تیرنے کے بجائے، کھڑے کھڑے پار کر لیتا ہوں۔ میں ٹیلیفون کے محکمے میں ملازم ہوں اور میرا کام ٹیلیفون کے کھمبوں کے تاروں کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ مجھے سیڑھی کی ضرورت نہیں پڑتی اسی لئے مجھے یہ کام سونپا گیا ہے۔ بعض دفعہ تو میں اُڑتے ہوئے کبوتروں کو ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیا کرتا ہوں۔ آپ نے جب اپنی خوبیاں گنوائی ہیں تو میں بھی اپنے بارے میں بتا رہا ہوں۔ ویسے اب خط میں کیا۔

زبانی مل کر بتاؤں گا۔ میں آپ سے ہائیڈ پارک میں ملنا چاہتا ہوں۔ دو بڑوں کی کانفرنس، وہیں مناسب بھی رہے گی۔ آپ کل شام کو پانچ بجے مجھ سے وہاں ملیں۔

نیازمند: ہیری

باربرا کی خوشی کا اس وقت کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ آدمی بندلہ سنج معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے تہیہ کر لیا کہ وقت مقررہ پر ضرور ہائڈ پارک جائے گی۔ اپنے گھر کے قریبی زمین دوز ریلوے اسٹیشن سے وہ ریل میں سوار ہوئی۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وقت پر لگا کر اُڑ جائے اور وہ جلد سے جلد جائے ملاقات پر پہنچ جائے۔ جلد بازی اچھی چیز نہیں ہے۔ اس کا احساس اُسے اُسی دن ہوا۔ کیوں کہ جب وہ ریل سے اُترنے لگی تو اُس کا پیر پائے دان پر سے پھسل گیا اور وہ ریل کی چمکتی ہوئی پٹری پر جو پلیٹ فارم کی سطح سے کم از کم ساڑھے پانچ فٹ نیچی تھی، جا گری۔ یہ واقعہ اُس جگہ پیش آیا جب کہ وہ انجن سے کافی دور نکل آئی تھی۔ گرتے وقت چونکہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اس لئے اُس کے جسم کا تمام زور اُس کے ننھے سے پاؤں پر پڑا۔ پاؤں میں موچ آگئی۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر اُٹھ نہ سکی۔ بڑا نازک لمحہ تھا۔ ریل چل چکی تھی۔ انجن کے پہیے حرکت میں آگئے تھے۔ پٹری پر اُن کے آہستہ آہستہ چلنے کی آواز باربرا کو سنائی دے رہی تھی۔ اس آواز میں بتدریج تیزی پیدا ہو رہی تھی۔ باربرا لائن پر پڑی ہوئی خوفزدہ نظروں سے انجن کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ لوگ چلا رہے تھے مگر کسی کی ہمت نہ تھی کہ پلیٹ فارم سے نیچے کود کر اُسے بچا لیتا۔ بڑی ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ انجن کے ڈرائیور نے بھی باربرا کو دیکھ لیا تھا اور اُس نے بریک لگانے شروع کر دیئے تھے۔ حفاظتی دستہ بلانے کے لئے ریل کے پیشتر ملازم اِدھر اُدھر بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ مگر باربرا کو موت اپنے سامنے نظر آرہی تھی۔ کیونکہ پیشتر اس کے کہ کوئی اُسے بچائے انجن رکتے رکتے بھی اُسے روند کر ضرور آگے بڑھ جاتا۔ اس احساس سے باربرا کی پیشانی پر قطرے نمودار ہو گئے۔ وہ وقت بالکل قریب تھا کہ انجن باربرا کے اوپر سے گذر جاتا کہ یکایک کسی فرشتے کے ہاتھ نے اُسے اوپر پکڑ کر کھینچ — وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ بعد میں جب اُسے ہوش آیا تو یہ معلوم کر کے اُسے بے حد مسرت ہوئی کہ وہ فرشتہ کوئی اور نہیں دراصل ہیری تھا۔ ہیری نے پلیٹ فارم پر بیٹھے بیٹھے ہی اُسے اوپر کھینچ لیا تھا۔

اُسی وقت باربرا کو یہ احساس ہوا کہ یہ قدرت نے انہیں ایک دوسرے کے لئے ہی بنایا ہے۔ اس لئے بجائے ہائڈ پارک جانے کے وہ دونوں سیدھے گرجا گھر چلے گئے جہاں پادری صاحب نے انہیں ہمیشہ کے لئے ازدواجی بندھنوں میں جکڑ دیا۔

••

اُردو، انگریزی اور ہندی میں قابلیت بڑھانے کے لئے

تعلیمی تاش کھیلئے سے

یہ تاش عرصہ ۲۵ سال سے تمام ہندوستان میں مشہور ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کے طلبا، تعلیم یافتہ مرد اور عورتیں، وکیل اور پروفیسر سب ہی اس تاش کو کھیلتے ہیں اور لطف اٹھاتے ہیں۔ اس کے کھیلنے سے وقت ضائع نہیں ہوتا، بلکہ اُردو، ہندی اور انگریزی کی قابلیت بڑھتی ہے۔ کھیلنے کے قواعد بکس کے ساتھ مفت بھیجے جاتے ہیں۔

تعلیمی تاش اُردو: ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے۔ تعلیمی تاش اردو انگریزی: ۲ روپے۔
تعلیمی تاش ہندی: ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے۔ محصول ڈاک علاوہ

سول ایجنٹ: کھلونا بک ڈپو — آصف علی روڈ، نئی دہلی

کسی کے عیب نکالنا بُری عادت ہے
اور
کامیابی میں رکاوٹ بھی

جناب حامد اللہ افسر نے، بچوں کیلئے ایک نہایت کامیاب کتاب

کامیابی کی راہیں

لکھ کر ہمارے ساتھیوں کے لئے کامیابی کی نئی راہیں کھول دی ہیں، ایک دلچسپ کہانی اس لڑکے کی جو ہر وقت ہر ایک میں عیب نکالتا رہتا تھا۔ لیکن خالد طرزی ایک سلیقہ مند اور نیک خو لڑکا تھا، وہ شمیم کی زندگی میں کیسے انقلاب لایا اور اس نے شمیم میں کس طرح اچھی عادتیں داخل کیں، یہ ایک سبق آموز اور دلچسپ کہانی ہے، اسے ضرور پڑھئے، اور نیک اور اچھے انسان بن جائیے۔ حصہ اول ۵۰ نئے پیسے حصہ دوم ۵۰ نئے پیسے

کھلونا بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی

چار منزلیں

سلام مچھلی شہری

پہلی منزل

جب عورت بچی ہوتی ہے
تب وہ ایک کلی ہوتی ہے
رنگ اور خوشبو کے سانچے میں
موم سمان ڈھلی ہوتی ہے
اس کی ہر مسکان پہ قرباں
ہوتی ہیں جنت کی پریاں

دوسری منزل

جب عورت کا سن بڑھتا ہے
تب اس کی آتی ہے جوانی
پیار میں چاند کی کومل ٹھنڈک
غصے میں ساگر طوفانی
بادِ سحر بھی، موجِ بلا بھی
ہنستا ہے اس وقت خدا بھی

تیسری منزل

جب عورت بیوی ہوتی ہے
تب وہ اک نغمہ ہوتی ہے
گیت کے روپ میں بربطِ دل پر
شوہر کا سپنا ہوتی ہے
ایک تبسم ـــــ ایک ترنم
رہتی ہے جس میں وہ خود گم

چوتھی منزل

جب عورت اک ماں ہوتی ہے
تب وہ دھرتی بن جاتی ہے
اپنی گود میں پھول کھلا کر
خوش ہوتی ہے مسکاتی ہے
دورِ فلک بھی رک جاتی ہے
اس کے آگے جھک جاتی ہے

لیکن سوچ رہی ہے دنیا
کونسا روپ ہے بہتر اس کا؟

ایک ڈھلتی شام

بلونت سنگھ

میں آپ سے پوچھتا ہوں، کیا آپ نے کبھی محبت کی ہے؟ درست ہے محبت ایک گھسا پٹا ہوا لفظ ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ اس افراتفری کے زمانے میں محبت کرنے کی فرصت ہی کس کو ہے، اور اس سے بھی انکار نہیں کہ ہماری مادی دنیا میں انسان کی انسان سے توجہ ہٹ گئی ہے۔ روپیہ، صرف روپیہ ہی سب کچھ ہے، یہی ماں یہی باپ یہی بیوی بلکہ یہی بھگوان ہے۔ جو اسے جمع کر لیتے ہیں، موج اڑاتے ہیں جو اس سے تغافل برتتے ہیں وہ نہ صرف پچھتاتے ہیں بلکہ انہیں باعزت زندگی تک بسر کرنا دوبھر ہو جاتا ہے .... یہ سب کچھ تسلیم کر لینے کے بعد بھی اگر میں آپ سے کہوں کہ میں نے سچ مچ محبت کی ہے تو آپ اسے میرا پاگل پن تو نہ سمجھیں گے؟ اگر آپ ایسا سمجھیں بھی تو کیا فرق پڑتا ہے ـــــ محبت سے مراد ہوس نہیں ہے بلکہ محبت سے مراد وہ جذبہ ہے جس کے تحت آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کا اپنے محبوب کے بغیر گزر ممکن نہیں، جب آپ کا ساتھی آپ کے روئیں روئیں میں سما جاتا ہے، جب وہ آپ کی کائنات بن جاتا ہے .... آپ چاہیں تو اسے بجز اس محض کہہ سکتے ہیں۔ اور اس جذبے کی جس طرح چاہیں توہین کر سکتے ہیں لیکن مجھے تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میرا جذبہ محبت کچھ اسی قسم کا تھا۔

اب میں آپ کو اپنی محبت کا قصہ سنانے نہیں بیٹھوں گا۔ آپ مطمئن رہیے میں آپ کا قیمتی وقت ضائع نہیں کروں گا ـــــ میں اپنی محبت کی داستان کا انجام ایک فقرے میں بتا کر اس کے بارے میں اور کچھ نہیں کہوں گا اور وہ ایک فقرہ یہ ہے کہ مجھے اپنی محبت میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ محبوبہ کے والدین نہیں مانے اور میری دلنواز محبوبہ کی شادی اور جگہ طے ہو گئی۔ مجھے پتہ چلا کہ میری محبوبہ نے دل پر پتھر رکھ کر اس نئے رشتے کو منظور کر لیا ہے تو مجھے پہلے پہل یقین نہیں آیا۔ میں نے ملاقات کی صورت نکالی، آمنا سامنا ہوا تو میری ہر آہ، ہر سوال اور ہر نوحے کا جواب خاموشی اور آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں ملا تو میں ناکام نامراد واپس چلا آیا۔

اسی حالت میں میں نے طے کیا کہ میں چند ماہ کے لئے اس مکار دنیا سے الگ تھلگ کہیں چلا جاؤں گا۔ اپنے زخمی دل پر قدرتی نظاروں کا پھایا رکھوں گا۔ ممکن ہے اس ماہیٔ بے آب کو قرار آئے۔ زندگی تو جس طور بسر ہونی تھی سو ہونی ہی تھی، لیکن خودکشی کی نوبت تو نہ آنے پائے۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے گڑھوال میں مقیم اپنے ایک دوست کو دلی کیفیت اور اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ وہ شخص یونیورسٹی میں میرا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ میں نے بی اے پاس کرنے کے بعد اپنے والد مرحوم کا کاروبار یعنی پیٹرول کے چند پمپ جو مختلف شہروں میں ایستادہ تھے سنبھالا۔ میرے دوست نے لاپاس کیا اور پھر پریکٹس کیلئے

اپنے وطن واپس چلا گیا۔ لیکن وہاں اس کا کام جما نہیں تو کچھ ہی عرصہ پہلے اس نے مجھ سے اس سلسلہ میں خط و کتابت کی میں نے اپنے شہر کے وکلاء سے مل کر اور اِدھر اُدھر سے بھی وکالت کے بارے میں جو کچھ پتہ چل سکا، ان ساری معلومات سے دوست کو آگاہ کیا اور اسے یقین دلایا کہ اگر وہ آنا چاہے تو اُمید ہے کہ جلد ہی وہ کامیابی سے ہم کنار ہوگا ——— تمہید ذرا لمبی سی ہو گئی ہے، بتانا میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ میری اس حقیر خدمت کے لئے میرا شکر گزار تھا۔ چنانچہ اس نے میری دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس نے لکھا: "یار تم جانتے ہی ہو کہ میں اپنا سارا اثاثہ بیچ باچ کر تمہارے شہر آنے کو ہوں کیوں کہ بال بچوں اور والدین کو یہاں پر چھوڑ کر خود پردیس میں کام کرنا ناممکن ہے۔ اُدھر تم شہر سے فرار ہونا چاہتے ہو۔ . . . میں تم پر الزام نہیں دھروں گا، کیوں کہ جو حالات تم نے لکھے ہیں انہیں پڑھ کر تو خود میری آنکھوں میں آنسو آ گئے . . . . بہرکیف اب جو تم نے سوچی ہے وہ مستحسن ہے میں تم سے متفق ہوں۔ ادھر گڑھوال کے راستے میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کا نام باٹو ہے، اس مقام کا نام مشہور نہیں ہے۔ جگہ واقعی بڑی غیر معروف سی ہے لیکن تمہارے لئے بہترین مقام ہے، آؤ اور یہیں پر قیام کرو۔ سڑک سے چھ میل ہٹ کر ایک بنگلہ ہے . . . . اب بنگلے کے نام سے دھوکا نہ کھانا، کیوں کہ یہ شہر کے بنگلوں سے قطعاً مختلف ہے۔ دیواریں بڑے بڑے پتھروں کی چھت پر کھپریل اور فرش بھی سلوں کا بنا ہے، چاروں طرف ایک باغیچہ بھی ہے، لیکن محض نام کو۔ کیوں کہ یہاں سوائے لمبی لمبی گھاس دیگر جڑی بوٹیوں کے اور کچھ نہیں ہے ہاں برسات میں جو آج کل میں شروع ہوا ہی چاہتی ہے اگر یہاں کچھ نیلے پیلے جنگلی پھول سر مٹکاتے نظر آ جائیں تو مجھ پر الزام نہ دھرنا۔ آٹا، دال، نمک ایندھن وغیرہ بازار میں مل جاتا ہے جو تم نوکر بھیج کر منگوا سکو گے اپنی آمد و رفت کے لئے تمہیں ایک ٹٹو رکھنا ہوگا۔ موٹر سائیکل، سائیکل یہاں قطعاً بے کار ہے، ایک باورچی اپنے ہمراہ ضرور لیتے آنا کیوں کہ اس جگہ اچھے باورچی کا ملنا ناممکن ہے، البتہ دیگر ملازم کافی تعداد میں اور کم تنخواہ پر مل سکتے ہیں۔ باقی جو کچھ تم چاہتے ہو یہاں موجود ہے، یعنی قدرتی مناظر، خاموشی اور سکون۔ شغل کے طور پر قریب کے نالے میں مچھلیاں پکڑنے کے لئے جا سکتے ہو، لیکن ذرا سنبھل کر کیوں کہ ——— مائی ڈیر! ہمارے پہاڑ کی پہاڑن لڑکیوں میں سے بعض تو بڑے غضب کے دانے ہوتے ہیں . . . . خیر چھوڑو، میں اس بات کو زیادہ طول نہیں دوں گا، کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت مناسب موڈ میں نہیں ہو، مگر میرا پختہ یقین ہے کہ وہاں کچھ دن قیام کرنے کے بعد تم خود ہی

مجھے ان کافر ادا الھڑ لیکن کامل جادو گرنیوں کے بارے میں لکھا کرو گے . . . .
سب حالات سے تمہیں آگاہ کر دیا ہے۔ اگر تمہیں میری تجویز پسند آئے تو لکھو کیوں کہ تم جانتے ہی ہو میں خود یہاں سے ڈیرہ ڈنڈا اٹھا لے جانے کی فکر میں ہوں، تمہارا جواب آتے ہی کل انتظام ٹھیک کر کے یہاں سے نکلوں گا۔"

مجھے اس کی تجویز پسند آئی گو پہاڑن لڑکیوں کے بارے میں اس کے خیالات معلوم کر کے میرے لبوں پر زہر خند ان پیدا ہوا، سچ مچ تماشائی عاشق کے جذبۂ صادق کو بازیچۂ اطفال سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ خیر اس باب میں میں چپ رہا، البتہ اسے مطلع کر دیا کہ چھٹی ملتے ہی بنگلہ کرائے پر لے کر دو ماہ کا کرایہ پیشگی ادا کر دے، مجھے فوراً اطلاع دے دے تاکہ میں روانہ ہو سکوں۔

چنانچہ اس طرح سے میں نے اپنے ماحول سے دل برداشتہ ہو کر مانند مجنوں کے گھر سے نکل کر دیرانے کا رُخ کیا۔

چونکہ کچھ معلوم نہیں تھا کہ آئندہ زندگی کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے، اس لئے کپڑے لتے اور دیگر ضروری و غیر ضروری سامان کا معقول انتظام کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ریل اور لاری کے سفر کے بعد جب ٹٹوؤں کا سفر شروع ہوا تو میرے سامان کی وجہ سے خاصہ بڑا کارواں سا بن گیا۔ تماشائی بھی سمجھے کہ کوئی خاندانی رئیس ہے۔

راہنمائی کے لئے ایک گائیڈ کی خدمات حاصل کیں، جو بذات خود عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ عجیب و غریب سے میرا مطلب یہ نہیں کہ اس کی شخصیت پراسرار تھی بلکہ میری مراد کچھ اور ہے مثلاً یہی کہ وہ خاصہ رسیدہ تھا لیکن مونہہ میں دانت اور پیٹ میں آنت سلامت تھی، سرو قد تھا، مسلمان ہونے کی وجہ سے شرعی داڑھی پال رکھی تھی لیکن ساتھ ہی اس میں کالجیٹ لڑکوں کا سا البیلا پن بھی تھا۔ طبیعت حسن شناس تھی اور دل . . . . معشوق کی جانب پھینکے جانے کے لئے بے تاب تھا۔ باتوں باتوں میں یہ بھی پتہ چلا کہ میدانوں میں بھی کافی رہ چکا تھا۔ شرطیہ لڑکا پیدا ہونے کی دوا مجمع لگا لگا کر بیچنے سے لے کر ہوٹلوں کی گائیڈی تک ہر قسم کے پاپڑ بیل چکا، بڑا چرب زبان اور باتونی تھا۔ مجھے اس کی اس ایک عادت سے بڑی کوفت ہوئی ـــــ پہلے پہل جب وہ میرے روبرو آ کر کھڑا ہوا تو اس کی صورت ذرا عجیب سی لگی۔ سر پر بے پھندنے کی ترکی ٹوپی، لمبی داڑھی، آنکھوں میں کاجل، مسوڑھوں پر پان کی سُرخی، پہاڑی ٹائپ کا تنگ نہ کھلا پائجامہ، تمیص گھٹنوں سے ایک انچ اوپر تک لمبی اور کالا کوٹ تمیص سے نصف ہاتھ چھوٹا۔ بغل میں دبا ہوا کسی پہاڑی لکڑی کا ڈنڈا۔ صورت سے سنجیدگی ٹپکتی تھی اور یہ تو بالکل معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ حضرت جب بات کرنے پر آئیں گے تو سلاست و بلاغت کے دریا بہا دیں گے، دریا بھی ایسے جن کا آغاز نہ انجام۔ اُلجھن کے باوجود دل پر پتھر رکھنا پڑا، کیوں کہ تین دن کا سفر تھا، اور وہ بزرگ سفید ریش خضرِ راہ۔ اس لئے کانوں کو اُن کی آواز سے مانوس کر لینے کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں تھا۔

میں یہ بات تو بتانا بھول ہی گیا کہ اس بوڑھے گائنڈ کو جس کا نام حنیف تھا شعر پڑھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ سب سے پہلے اس کے اشعار ہی سے میرا دل اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ کوئی عالم یا ادیب تو نہیں تھا شاید اس کی تعلیم بھی معمولی تھی، اسی لئے وہ اکثر آسان اور عام فہم شعر ہی پڑھتا تھا لیکن با موقعہ اشعار پڑھنے میں اسے مہارت حاصل تھی۔

چھ ٹٹوؤں کے کارواں کے آگے آگے میں ایک مضبوط ٹٹو پر سوار حنیف کی رہنمائی میں بڑھتا تھا اور میرے ہمراہ وہ پیدل چلتا تھا۔ اس عمر میں اس کی ہمت اور قوت پر مجھے تعجب ہوتا تھا۔ پہلا دن کچھ بے کیف سا گزرا، میری روح کی گہرائیوں میں ناکامیٔ محبت کا غم سر چھپائے سسکیاں بھر رہا تھا۔ البتہ دن بھر میں جب کبھی حنیف شعر پڑھتا تو دل میں لذت انگیز کسک کا احساس ہوتا۔

ہم پہاڑوں کے لامتناہی سلسلوں میں داخل ہو چکے تھے۔ آڑی ترچھی پگڈنڈیوں پر سے ہمارا قافلہ مستِ خرام تھا۔ جب کبھی حنیف کی باتوں کا سلسلہ ختم ہوتا تو فضا کے روح پرور سکون کا احساس ہونے لگتا۔ محض ٹٹوؤں کے گلے سے بندھی ہوئی گھنٹیوں کی ٹناٹن سے یہ خوابناک دنیا مترنم سی ہو کر رہ جاتی۔ دیکھتے دیکھتے پہاڑوں کی اوٹ سے دیو نما گھٹاؤں نے سر اٹھایا اور دامن افق پر اپنے علم لہرانے لگیں۔ ہوا بھی تیز تند چلنے لگی۔ اور پھر یکایک بادلوں کی وہ بھرمار ہوئی کہ تاریکی سی چھانے لگی۔ حنیف نے مشورہ دیا کہ مناسب جگہ دیکھ کر کسی بڑے پیڑ کے نیچے قیام ہونا چاہئے۔ اس نے بتایا کہ خوش قسمتی سے قافلہ ایک مندر کے قریب پہنچ چکا ہے جس پر ایک بہت قدیم بڑ کے پیڑ کا سایہ ہے وہاں قیام کرنا مناسب ہوگا، اس پر مزدور اور ٹٹو قدم تیز کر کے آگے بڑھے اور ہم بارش پڑنے سے پہلے ہی برگد کے نیچے جا پہنچے۔ ٹٹوؤں کو قریب قریب کھڑا کر کے اُن پر ایک لمبی چوڑی برساتی ڈال دی، تاکہ بارش کی صورت میں سامان خراب نہ ہونے پائے۔

ان چھوٹے موٹے کاموں سے فارغ ہو کر میں اس مندر کے سامنے بنے ہوئے چبوترے پر جا بیٹھا۔ کچھ دیر بعد حنیف بھی آیا، اس نے انگوچھے سے اپنی لمبی داڑھی کو پونچھا اور پھر مجھ سے دس بارہ فٹ پرے بیٹھ گیا۔ اتنے میں آسمان

میں زور کا دھماکہ ہوا اور پھر اک دھڑاکے کے ساتھ پانی ٹوٹ کر برسا۔ یہاں تک کہ آسمان سے زمین تک دھواں دھار ہوگیا۔ رنگ برنگی پہاڑیاں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے بوندوں کی چادر کے پیچھے پریاں غسل کر رہی ہوں — یہ دل فریب منظر دیکھ کر اگر کوئی اور زمانہ ہوتا تو میرا دل ناچ اٹھتا یا شاید میں خود بھی اُٹھ کر رقص کرنے لگتا۔ لیکن اب تو ذہن پر مردنی ہی چھائی تھی۔ چُپ چاپ اس لگاتار بارش کو دیکھتا رہا جیسے میرے سارے غم اسی میں دُھل جائیں گے۔

تھوڑی دیر بعد محسوس ہوا کہ اس منظر نے مجھی کو مسحور نہیں کر رکھا خود حنیف بھی اس سے بُری طرح سے متاثر نظر آتا تھا۔ اس نے حسب معمول اپنے جذبات کے اظہار پر کوئی پابندی نہیں لگا رکھی تھی۔ چنانچہ اس نے ایک ہاتھ کان پر رکھا اور دوسرا ہوا میں اٹھا کر ایک شعر پنجابی طرز پر گا کر پڑھا۔

زلفیں بادل نے لہرائی ہیں لو ہونے لگی برسات
بوندوں کے جل ترنگ میں یاد آنے لگی اک بات

شعر معمولی تھا، لیکن اس فضا میں وہ ترنم کانوں کو کتنا بھلا لگا اس کا بیان نہیں ہوسکتا۔ اس وقت شعر نے جادو کا کام کیا۔ اور پھر مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ حنیف اس قدر خوش گلو واقعہ ہوا ہے۔ مجھ سے نہ رہا گیا ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے میں نے پوچھا:

"بھئی تم نے تو گلا بھی غضب کا پایا ہے!"

"آداب عرض ہے.... جناب لعل کی قدر جوہری ہی جان سکتا ہے!"

"لیکن یہ پنجابی طرز کہاں سے سیکھی؟"

"اجی جہاں کی چیز سیکھنے کو من چاہا بذاتِ خود وہاں پہنچ کر ہی سیکھی۔ آپ جانتے ہی ہیں، میں نے پنجاب میں بھی عمر عزیز کا کافی حصہ گزارا ہے!"

اس کے بعد حنیف نے مزے لے لے کر اپنی زندگی کے دل چسپ واقعات سنانے شروع کئے۔ اس نے بتایا کہ کس طرح اپنی خوش الحانی کے باعث اسے ایک لڑکی کی محبت حاصل ہوئی، اور پھر اس عشق نے ایسا طول پکڑا کہ نوبت شادی کی بات چیت تک پہنچی لیکن لڑکی کے والدین اگرچہ مسلمان ہی تھے لیکن وہ ایک غیر پنجابی کے ساتھ لڑکی کی شادی کرنے پر رضامند نہیں ہوئے، چنانچہ شادی نہیں ہوسکی۔

میں نے پوچھا "اس ناکامی کا تمہاری زندگی پر بہت بُرا اثر پڑا ہوگا۔"

"آپ کا خیال بہت حد تک درست ہے لیکن دنیا میں کئی چیزیں ایسی ہیں جو ہم حاصل نہیں کر سکتے۔ کس کس کو روئیں کس کس کے لئے سینہ کوبی کریں.... صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔ کیوں کہ اللہ کی حکمتیں اللہ ہی جانے...."

"یہ ٹھیک ہے لیکن بھئی بعض اوقات تو بھگوان کے نام کا سہارا بھی کمزور ثابت ہوتا ہے۔ انسان کے دل اور روح پر ایسا غبار چھا جاتا ہے کہ کچھ بس نہیں چلتا۔ نہ کامیابی سے ہم کنار ہوتے ہیں اور نہ دل کو چین ہی آتا ہے...." نہ جانے میں یہ سب الفاظ کیوں کر کہہ گیا۔

کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی۔ بارش موسلہ دھار ہو رہی تھی۔ مندر برگد کے گھنے اور پھیلے ہوئے پیڑ کے تلے تھا اور جس چبوترے پر ہم بیٹھے تھے اس کی چھت بھی تھی۔ اس لئے ہم بارش سے محفوظ تھے۔ البتہ ہمارے ٹٹو بُری طرح سے سکڑے کھڑے تھے۔ ٹٹو ہانکنے والے بھی مندر کے ایک پچھلے تلے دبکے ہوئے تھے۔ آس پاس کی پہاڑیوں سے پانی کا شور عجب کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ پھر مجھے حنیف کی ذرا گہری سی آواز سنائی دی۔

"صاحب اگر بُرا نہ مانیں تو کچھ کہوں؟"

میں نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے تاہم میں نے جواب دیا "بُرا ماننے کی کیا بات ہے کہو بے کھٹکے کہو.... بھئی تم بھی پڑھے لکھے انسان ہو۔ دُنیا گھومے ہو۔ تم کوئی غیر معقول بات تو کہہ نہیں سکتے...."

اس پر اس نے پھر کچھ تامل کیا اور پھر بولا "سرکار بھی دل پر کچھ چوٹ کھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں!"

میں چونکا۔ مجھے قطعاً اس بات کا خیال نہیں تھا کہ ہماری گفتگو ایسی کروٹ لینے کو ہے۔ لیکن اس میں کسی کا کیا قصور؟ میں نے ہی اس قسم کی باتیں کہیں کہ وہ اصلیت کو بھانپ لینے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے سوال سے میں چونکا ضرور، لیکن جلد ہی سنبھل گیا۔ کچھ موسم کی رنگینی اور کچھ دل کی غمناک کیفیت نے بے اختیار سا کر دیا۔ جواب دیا "تمہارا اندازہ ٹھیک ہے بھائی!"

"کیا لڑکی کے ماں باپ نے رکاوٹ ڈالی؟"

"ہاں!"

"کیا لڑکی کی شادی اور جگہ ہو چکی ہے؟"

"ہوئی نہیں، ہونے کو ہے!"

"کیا لڑکی نے بے وفائی کی؟"

"کیسے کہوں —— ہمارے یہاں لڑکیوں کی مجبوریاں بھی تو بہت ہوتی ہیں...."

"لڑکی تو بالغ ہی ہوگی!"

"ہاں بالغ ہے۔"

"وہ چاہتی تو آپ کا ساتھ دے سکتی تھی۔ کیوں کہ وہ پڑھی لکھی بھی تو ہوگی۔"

"ہاں پڑھی لکھی بھی ہے۔"

"یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے، لڑکی کو ہمت سے کام لینا چاہیئے تھا.... میرا مطلب ہے کہ اگر اس کے عشق میں کچھ بھی صداقت تھی تو...."

"لیکن ایسا ہوا نہیں۔"

"کتنے دکھ کی بات ہے اگر پڑھی لکھی لڑکیاں بھی اپنی پسند کے مرد کو چھوڑ سکتی ہیں تو پھر ان پڑھی لڑکیوں کا کیا ٹھکانہ ہے...."

میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ پھر بولا۔

"آخر ان لوگوں کو اعتراض کیا تھا آپ پر...."

"یہ قصہ بہت لمبا ہے.... کیا کہوں...."

"نہیں رہنے دیجئے مت بتایئے.... کیوں کہ اس طرح ہر تلخ واقعہ کی یاد تازہ ہو جائے گی ـــــ معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ عرصے کا واقعہ نہیں ہے۔"

"نہیں۔"

"اگر میں غلطی نہیں کرتا تو آپ اپنا غم بھلانے کے لئے ہی اس ویرانے میں چلے آئے ہیں۔"

"ہاں۔"

"ہائے ہائے.... ذرا اندازہ لگایئے، اگر ان حسین وادیوں میں اور اس برسات میں وہ آپ کے ہمراہ ہوتیں تو کیا خوب ہوتا۔"

میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا "بھئی اب دل کو چرکے مت لگاؤ.... جانے زندگی کے کیا کیا پروگرام تھے، سب دھرے کے دھرے رہ گئے ـــــ بھئی برا نہ ماننا ـــــ اب اتنے پر صبر کرو۔ مجھ سے اور سوال مت پوچھو۔"

"بہتر ہے میں آپ سے آپ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کروں گا ـــــ مگر آپ کے اطمینان کے لئے یہ ضرور کہوں گا کہ آپ ذرا کرید کر دیکھیں تو آپ کو زندگی میں ایک سے ایک بڑھ کر دردناک واقعات دکھائی دیں گے.... جب میں ایسے لوگوں کے حالات سنتا ہوں جن پر اس سلسلہ میں مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تو میرے دل کو ایک گونا تسکین سی حاصل ہوتی، بے اختیار آسمان کی جانب ہاتھ اٹھ جاتے ہیں کہ خدایا! تیری حکمت اور مصلحت کو سمجھنا ہم خاکی انسانوں کی محدود عقل کے بس کی بات نہیں.... اب آپ جہاں جا رہے ہیں وہیں ایک ایسا عجیب و غریب اور دردناک واقعہ پیش آچکا ہے کہ جو سنے خون کے آنسو روئے۔"

میں نے گفتگو کا رُخ بدلتے دیکھ کر قدرے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا "کیوں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟"

اس پر حنیف نے ایک سگریٹ کا سوال کیا جو میں نے فوراً پیش کر دیا۔ اس نے دھواں اُڑاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"صاحب کوئی پینتالیس برس ادھر کی بات ہے کہ بھلے گھر کا ایک نوجوان نہ جانے کہاں سے اِدھر آنکلا۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اُن دنوں ان پہاڑیوں کی طرف بہت کم لوگ آتے تھے۔ یہی پہاڑی لوگ روزگار کی تلاش میں میدانوں کو جاتے اور پھر وہاں کچھ روپیہ پیدا کر لیتے تو واپس چلے جاتے ـــــ ان مٹی مٹی سی پگڈنڈیوں پر صرف ان پہاڑی لوگوں ہی کے قدم پڑتے تھے...."

"تم اس نوجوان کی بات کر رہے تھے۔"

"ہاں جی، تو صاحب وہ نہ جانے کیسے اِدھر آنکلا، اس بات کا تو آج تک پتہ نہ چلا لیکن ان پہاڑیوں میں آنا اس کے لئے بڑا منحوس ثابت ہوا...."

"کیوں کیا ہوا؟"

"بس وہی ـــــ عشق۔"

"کس سے؟"

"یہیں ایک پہاڑی لڑکی سے۔ آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ اِدھر حُسن نہیں ملتا اجی صاحب کبھی کبھی تو ایسی صورتیں نظر آجاتی ہیں کہ آپ ان کا مونہہ دیکھتے رہ جائیں حلق سوکھ جائے، آواز تک نہ نکلے۔ قدرت کا وہ رنگ و روغن ان چہروں پر دکھائی دیتا ہے کہ شہروں کے رُوژ اور لپ اسٹک پھیکے پڑ جاتے ہیں...."

"تو کیا لڑکی کو بھی اس سے محبت ہوئی کہ نہیں...."

"ہوئی صاحب، خوب ہوئی.... لیکن پہلے پہل نہیں۔"

"وہ کیسے؟ کیا پہلی نظر کا پیار نہیں تھا....؟"

"ہو سکتا ہے جی کہ پہلی نظر کا ہی پیار ہو.... مگر آپ جانتے ہی ہیں کہ محبت بھی تو کئی صورتیں اختیار کرتی ہے۔ کبھی محبت نفرت اور حقارت کے بھیس میں آتی ہے اور بعد میں یہ چولا اُتار کر اصلی حالت میں آجاتی ہے یہی قصہ یہاں پیش آیا۔"

یہ کہہ کر اس نے سگریٹ کے پے در پے تین چار کش لئے اور پھر کہنا شروع کیا "کہتے ہیں کہ پہلے پہل ان کی آنکھیں چار اس وقت ہوئیں جب کہ لڑکی تنِ تنہا گاؤں سے کچھ دُور ندی میں نہا رہی تھی۔ نوجوان گھومتا پھرتا ادھر جا نکلا۔ اس نے جھاڑیوں پر کچھ کپڑے دیکھے وہ یہ پہچان بھی نہیں پایا کہ کپڑے زنانہ ہیں کہ مردانہ کہ دفعتاً وہ لڑکی لاعلمی میں ندی سے نکلی اور اسے دیکھتے ہی شعلے کی طرح لپک کر اس جھاڑی کے پیچھے چھپ گئی جس پر کہ اس کے کپڑے پڑے تھے۔ جلدی جلدی ہانپتے کانپتے اس نے کپڑے پہنے اور پھر وہ اس نوجوان کی طرف بڑھی اور زن سے

اس کے مونہہ پر طمانچہ مارا اور خود آگے بڑھ گئی۔

"پہلی ملاقات تو بہت خطرناک رہی۔"

"جی ہاں ـــــ لیکن اس کے بعد لڑکی جدھر جاتی نوجوان اس کے راستے پر نظریں بچھائے دکھائی دیتا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی بولی تو سمجھتے نہیں تھے۔ لڑکی اکثر اسے ڈانٹ ڈپٹ دیتی۔ آخر بڑی مشکل سے لڑکے نے اسے ٹوٹی پھوٹی زبان میں سمجھایا کہ وہ کوئی بدمعاش آدمی نہیں تھا اتفاقاً ادھر جا نکلا، جہاں وہ نہا رہی تھی اور پھر اس کو روبرو دیکھا تو اس کے اوسان ہی خطا ہو گئے۔ اسے اس بات کا ہوش تک نہ رہا کہ وہ خود کون ہے کہاں کھڑا ہے، اسے کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے بالآخر بہ ہزار خرابی اس حسین بُت کا دل موم ہوا، اور اپنے عاشق کے عشق کو صادق دیکھ کر اس کے دل میں بھی محبت کی چنگاری بھڑکی اور ایک روز انہیں پہاڑیوں کی کسی کنج میں اس نے اپنے پیارے کا سر سینے سے لگا کر اسے اپنی محبت کا یقین دلایا۔۔۔۔ اور اس مہ رو قاتل کے اس پیار نے عاشق کو اور کسی کام کا نہ چھوڑا۔۔۔۔"

"میرے خیال میں ان کے عشق کا بھانڈا جلد ہی پھوٹ گیا ہوگا۔"

"جی ہاں ـــــ ایک بار جب دونوں کے دل میں محبت کی کلی چٹکی تو پھر صبر کا دامن ہاتھ سے جاتا رہا۔ دونوں نے ہر ممکن لمحہ ایک دوسرے کے بازوؤں میں گزارنا شروع کر دیا۔ لازمی بات تھی کہ لوگوں کو بھی ان کی محبت کا علم ہو ـــــ جب ذرا بات پھیل نکلی تو لڑکی نے لڑکے سے کہا کہ وہ اس کے ماں باپ سے اس سے شادی کی بات کرے۔ نوجوان نے ایسا ہی کیا تو ماں باپ نے معمولی حیل و حجت کے بعد اجازت دے دی۔"

"اچھا تو اجازت ملنے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ جب کوئی حریف نہ تھا اور نہ کوئی رکاوٹ تو پھر۔۔۔۔؟"

"اجی صبر تو کیجئے۔۔۔۔ شادی طے ہو جانے پر نوجوان نے کہا کہ وہ اپنے گھر جائے گا اور باپ سے اپنے حصے کی جائداد لے لے گا اور پھر اسے بیچ باچ کر کل روپیہ اور اپنا سامان لے آئے گا اور زندگی کے باقی دن انہیں پہاڑیوں کے دامن میں گزار دے گا ـــــ یہ کہہ کر وہ اپنے وطن کو لوٹا اور وہ پہاڑی حسینہ اس کے پیچھے پیچھے دُور تک بھاگی بھاگی گئی لیکن جدائی ناگزیر تھی۔ آخر بصد آہ و بکا اسے محبوب سے الگ ہونا پڑا ـــــ ادھر قصہ یہ ہوا کہ ماں باپ نے لڑکے کی شادی اور جگہ طے کر رکھی تھی۔ لڑکے سے کسی نے پوچھا تک نہیں۔ جب لڑکے کو اس بات کا علم ہوا تو وہ پٹیا یا اور اس نے شادی سے صاف انکار کر دیا ادھر جس لڑکی سے ماں باپ نے اس کی شادی طے کی تھی، اس کے گھر والوں پر یہ بھید کھل گیا کہ حضرت کہیں اور نظر لڑا کر آئے ہیں اس پر باہمی تلخی اور بڑھی لڑکی والوں نے اس میں اپنی انتہائی ذلت سمجھی۔ آپ سمجھئے کہ وہ زمانہ کون سا تھا۔ بالآخر مایوس ہو کر لڑکی والوں نے کسی ترکیب سے لڑکی کا خون کر کے الزام اس کے منگیتر پر جڑ دیا۔ قتل کی وجہ بتائی گئی یہ کہ اس نے کسی اور لڑکی سے شادی رچانے کا تہیہ کر لیا تھا۔۔۔۔"

"حد ہے بدمعاشی کی۔۔۔۔"

"اجی بس اپنا اپنا دماغ ہے۔"

"اچھا تو پھر کیا ہوا؟"

"خدا آپ کا بھلا کرے پھر ہوا یہ کہ مقدمہ چلا۔ طویل قانونی بحثوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ نوجوان کو طویل مدت کے لئے قید سخت کی سزا ملی۔۔۔۔"

"سزا ملی؟"

"جی ہاں ـــــ اب سارے حقائق کا کسے علم ہے؟ سنی سنائی بات بتا رہا ہوں۔"

"ادھر پہاڑن لڑکی کا کیا بنا۔۔۔۔؟"

"ادھر یہ غریب شب و روز پیا کے انتظار میں گھڑیاں گنتی رہی۔ نوبت ہفتوں، مہینوں سے گزر کر سالوں تک پہنچی۔ پیا نے آنا تھا نہ آیا ـــــ جسم آخر گوشت پوست کا لوتھڑا تھا کہاں تک صعوبتیں سہ سکتا۔ آخر ایک روز عین عالم شباب میں موت کو لبیک کہا لیکن آنکھیں اس حالت میں بھی منتظر تھیں۔۔۔۔"

"بھئی یہ تو بہت ہی دردناک کہانی ہے۔۔۔۔ اس بے چاری کو عاشق کی مجبوری کا علم ہی نہیں ہوا ہوگا۔۔۔۔"

"ہوتا بھی تو نتیجہ وہی نکلتا۔۔۔۔"

میں نے اداسی میں سر نیچے جھکا لیا۔ ہم دونوں کچھ دیر تک خاموشی سے بارش کا شور سنتے رہے پھر حنیف نے کہا "میں نے جو یہ قصۂ محبت آپ کو سنایا تو اس کی دو وجوہ تھیں۔"

"وہ کیا؟"

"ایک تو یہ کہ آپ کے دل کی کچھ تو ڈھارس بندھے۔ آپ کو معلوم ہو جائے کہ راہِ عشق کس قدر پُرخار ہے۔ آپ جان جائیں کہ اس راہ میں کیسے کیسے دُکھ سہنے پڑ جاتے ہیں اور دوسرے اس لئے کہ آپ جس مکان میں قیام کریں گے اس سے ایک آدھ فرلانگ پرے ایک چھوٹی سی سمادھی بنی ہوئی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسی جگہ اس نامراد لڑکی کا جسم سپردِ آتش کیا گیا تھا۔۔۔۔"

اس سے میرے دل میں ایک ہوک سے اٹھی۔ حنیف نے پھر کہنا شروع

کیا" ادھر تین چار برس سے ایک بوڑھا ان پہاڑیوں میں گھومتا پھرتا نظر آتا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ اپنا زیادہ تر وقت اسی سمادھی کے قریب گزارتا ہے کبھی کبھار کسی غرض سے چند منٹ کے لئے اِدھر اُدھر چلا جائے تو بات اور ہے ... مشہور ہے کہ یہ وہی پُرانا عاشق ہے جو جیل سے چھوٹنے کے بعد زندگی کے آخری سال محبوبہ کی سمادھی کی قربت میں گزار رہا ہے۔"

میرے دل کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی میں نے دریافت کیا "کیا تم نے اس سے بات چیت نہیں کی کبھی؟"

"وہ گونگا بھی ہے اور بہرہ بھی .... صرف اداس آنکھوں میں قوتِ بینائی باقی ہے ورنہ محبوبہ کی سمادھی کے ہر دم کے دیدار سے کبھی محروم رہتا .... آپ اسے اکثر دیکھا کریں گے آپ کے مکان سے چند قدم پر ایک پیڑ تلے بیٹھا رہتا ہے وہ .... اس کی موجودگی سے کوفت تو نہ ہوگی آپ کو؟ بیچارے پر رحم کیا جائے وہ قطعاً بے ضرر انسان ہے۔"

"نہیں بھائی میں اس سے کچھ نہیں کہوں گا۔ آخر بچارا میرا کیا لے لیگا۔"

بارش تھمی تو ہمارا قافلہ پھر روانہ ہوگیا۔

سفر کا باقی حصہ اکثر اس قصۂ محبت کے مختلف پہلوؤں پر تبادلۂ خیال کرنے میں گزرا۔

بالآخر ہم منزل تک جا پہنچے۔ مجھے وہ مقام بہت پسند آیا۔ فی الحقیقت اردگرد کے قدرتی مناظر اس قدر حسین تھے کہ بہشتِ بریں کا دھوکہ ہوتا تھا۔

وہاں اپنے وکیل دوست سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ چند دن میرے پاس رہنے کے خیال سے وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ حنیف دوسرے دن رخصت ہوا تو بھی میرے دل کو کچھ دھکا سا لگا کیوں کہ انجانے میں اس سے بھی لگاؤ پیدا ہوگیا تھا۔ میں نے کہا "حنیف تم ادھر کبھی کبھار آتے ہی ہوگے جب آؤ مجھ سے ضرور ملنا۔"

اس نے گرم جوشی سے جواب دیا "انشاءاللہ ضرور ملاقات ہوگی۔ خود میری یہی تمنا ہے اچھا آداب۔"

یہ کہہ کر وہ رخصت ہوگیا۔

میرا دوست چند دن میرے ساتھ رہا۔ ہم دونوں نے اس سمادھی کو بھی دیکھا جہاں اس وقت سوائے چند ٹوٹے پتھروں اور خاردار جھاڑیوں کے اور کچھ نشان باقی نہیں تھا۔ بوڑھے والی بات بھی سچ نکلی۔ میں نے اسے اکثر دیکھا لیکن قریب جانے کی کوشش نہیں کی، کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ وہ گونگا ہے اور بہرا بھی۔ اس لئے ملاقات اداس نظروں کے تبادلے کے سوا اور کچھ نہ ہوگی

مجھے وہاں آئے دس دن بیت چکے تھے۔ میرا دوست بھی رخصت ہو چکا تھا، کیوں کہ اسے اپنا پروگرام پورا کرنا تھا۔ ادھر میں بالکل تنہا رہ گیا۔ آس پاس چھوٹے موٹے دیہات تھے۔ مجھے انہیں لوگوں میں اپنا من بہلانا تھا لیکن برسات کی وہ شدت تھی کہ اِدھر اُدھر جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ تنہائی میں مجھے اپنی شوبھا کی یاد اور شدت سے ستانے لگی۔

دل بہلانے کے لئے میں نے گھر کے کاموں میں دلچسپی لینی شروع کی۔ باورچی خانے میں صرف باورچی پُرانا نوکر تھا۔ میں نے کھانا پکانے کی کتابوں کو دیکھ دیکھ کر اس سے کچھ نئے کھانے پکوائے۔ میرے پاس باغبانی پر چند کتابیں تھیں ان کا مطالعہ شروع کر دیا۔ تاکہ اس خیال کو عملی صورت دی جا سکے۔

میرے دوست نے پہاڑی لڑکیوں کے بارے میں جو اشارے کئے تھے وہ بھی بہت حد تک درست ثابت ہوئے۔ بعض پہاڑی عورتیں اور لڑکیاں کبھی کبھی ہمارے مکان کا چکر لگاتی تھیں، وہ لکڑیاں، کوئلہ یا کچھ سبزیاں وغیرہ لے کر آتی تھیں۔ لیکن یہاں تو دل ہی بجھ چکا تھا۔ اس قسم کی چہل بازی کی گنجائش ہی کہاں تھی۔

ایک دوپہر ـــــ کہنے کو دوپہر، لیکن آسمان بادلوں سے اٹا پڑا تھا اور بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ میں اردگرد کے حسین نظاروں کا احساس رکھتے ہوئے بھی دل کی اداس نگری میں گم تھا۔ پھر میں نے بصد کوشش اپنے آپ کو اس کیفیت سے نکالنے کی کوشش کی۔ میں نے باورچی کو آواز دے کر چائے لانے کے لئے کہا۔ اور پھر سوچنے لگا کہ میں اپنا باغ کیسے تیار کروں گا۔

سامنے ایک چھوٹے سے پیڑ تلے وہی بوڑھا بیٹھا تھا۔ سوچا وہاں بھیگ رہا ہوگا۔ اسے بلا کر برآمدے تلے لے آؤں۔ ایک آدھ گلاس چائے پی لے گا .... میں اب تک اس کے قریب نہیں گیا تھا نہ جانے میں اپنے آپ میں اتنی ہمت کیوں نہیں پاتا تھا۔

چھتری تانے میں وہاں پہنچا تو قریب سے اس کی صورت نظر آئی۔ وہ یوں بھی عمر رسیدہ تھا، لیکن ان دکھوں نے تو اس کے چہرے کے خطوط کو اور گہرا کر دیا تھا۔ آنکھوں میں بے رونقی اور بے چینی کے سوا زندگی کے آثار تک مفقود تھے ـــــ میں نے چاہا کہ وہ میری طرف متوجہ ہو لیکن وہ تو ایک بے جان بُت کی طرح بیٹھا۔ پیڑ کی شاخوں سے بوندیں ٹپک رہی تھیں اور تنے

کی نمی اس کی پیٹھ کو گیلا کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ کبھی وہ بھی حسین جوان رہا ہوگا اس کے پہلو میں تڑپتا ہوا دل ہوگا ——— اس سے بات کرنا لاحاصل تھا۔ چنانچہ یہ سوچ کر کہ اسے چائے کا گلاس اسی جگہ بھجوا دوں گا واپس چلا آیا۔

نوکر اسے چائے دے آیا ——— اس وقت میں برآمدے میں آرام کرسی پر نیم دراز تھا، بارش کا زور کم ہو رہا تھا، رنگ برنگے پہاڑ عظیم الجثہ جانوروں کے مانند دکھائی دے رہے تھے۔ ڈھلانوں پر لمبی ہری گھاس بارش کی بوندوں کے تھپیڑے کھا کھا کر رقص کر رہی تھیں ——— اسی اثنا میں دُور سے ایک آدمی آتا دکھائی دیا۔ وہ ادھر ہی کو آ رہا تھا۔ قریب پہنچا تو میں نے پہچانا کہ وہ حنیف تھا۔

اسے دیکھ کر مجھے قدرے خوشی محسوس ہوئی، کیونکہ میں بے حد تنہائی کا احساس کر رہا تھا۔ اس نے برساتی اوڑھ رکھی تھی، اور سر کے اوپر ٹوپ کے بجائے پتوں کا چھتر تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے ہنستے ہوئے آداب عرض کی۔ میں نے قریب پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے برساتی اُتار کر الگ رکھ دی اور بولا "کہئے! مزاج اچھا تو ہے نا؟"

"مزاج کی بھلی پوچھی .... تم اپنی کہو"

"میرا وہی حال ہے دس دن کے بعد حاضر ہوا ہوں۔ ایک سواری کو ادھر لانا تھا .... ارے صاحب عجیب بات یہ کہ وہ بھی مریضِ عشق ہیں۔"

میری دلچسپی بڑھی۔ بھیگی بھیگی شام۔ خوابناک فضا میں ایک اور داستانِ عشق!

میں نے سر گھما کر نوکر کو آواز دی "دو پیالے چائے لانا بھئی!"

میرے مونہہ سے یہ الفاظ ادا ہوئے ہی تھے کہ میں نے فرش پر دو زنانہ پاؤں دیکھے ——— میں دم بخود ہو کر رہ گیا ——— سر سے پاؤں تک پہلے تو ایک جھنجھلاہٹ پیدا ہوئی اور پھر گرم گرم سی کیفیت .... یہ پاؤں تو میرے جانے پہچانے پاؤں تھے ....

سر اُٹھا کر اوپر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی .... یہ پاؤں یہاں کیسے پہنچے سب رشتے، سب ناطے توڑ کر .... میری تنہائی دُور کرنے ....

گورے گورے پاؤں سنہرے سینڈلوں میں جھلک رہے تھے، حسین، غیر متحرک، دردناک امید و بیم کی کیفیت لئے ہوئے ....

حنیف کی دبی دبی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ اور پھر وہ بلند آواز میں پکار کر بولا "اے باورچی! دو نہیں تین کپ چائے لانا ...."

نئی نئی کتابیں

کتاب کی کہانی	۵۰ نئے پیسے	اور مقدمہ چلتا رہا	۳۷ نئے پیسے	حکایاتِ گاندھی	۵۰ نئے پیسے	فرشتہ کا انعام	۳۱ نئے پیسے
مکانوں کی کہانی	۵۰ نئے پیسے	امتحان	۵۶ نئے پیسے	سرکس	۳۱ نئے پیسے	دوست کی تلاش	۳۱ نئے پیسے
لال بجھکڑ	۶۲ نئے پیسے	پیارے نبی	۶۲ نئے پیسے	نصیب کھُلے پھُول کھِلے	۵۰ نئے پیسے	حسنہ کی مرغی	۲۵ نئے پیسے
کے بجے ہیں	۷۵ نئے پیسے	چار ستارے	اردو پیہ ۵۰ نئے پیسے	ہم آمر ہیں	اردو پیہ ۵۰ نئے پیسے	کھٹملوں کا اعلانِ جنگ	۳۱ نئے پیسے
سبا کی شہزادی	۳۰ نئے پیسے	جادو منسری	۳۱ نئے پیسے	جاسوس لڑکے	۲۵ نئے پیسے	خزانہ کی واپسی	۳۰ نئے پیسے
تاریخی کہانیاں حصہ اوّل	۳۷ نئے پیسے	چور لڑکا	۳۷ نئے پیسے	جواری	۲۵ نئے پیسے	لاٹھی والا جن	۳۰ نئے پیسے
تاریخی کہانیاں حصہ دوم	۳۷ نئے پیسے	سورج اور اس کا خاندان	۷۵ نئے پیسے	جادو کی کرسی	۳۷ نئے پیسے	معراجِ سخن	ایک روپیہ
باؤلا گاؤں	۳۷ نئے پیسے	ماؤنٹ ایورسٹ:		دولتی	۳۷ نئے پیسے	نیا کھلونا	۳۰ نئے پیسے
بنیادی حق	۶۲ نئے پیسے	حصہ اوّل	۳۱ نئے پیسے	دھن کی پوری سون چڑیا	۳۷ نئے پیسے	دیوان غالب صاحب	۳۷ نئے پیسے
ایک بچے کی کہانی	۴۴ نئے پیسے	حصہ دوم	۳۱ نئے پیسے	عقل مند وکیل	۳۱ نئے پیسے	یاقوت	۲۵ نئے پیسے

کھلونا بک ڈپو — آصف علی روڈ — نئی دہلی

پاگل

محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے، اور جس دل کو محبت اپنا نشیمن بنا لیتی ہے تو پھر وہاں سے اپنا ڈیرا نہیں اٹھاتی اس لئے محبت کرنے والوں کو دنیا والے دیوانہ یا پاگل کہتے ہیں۔ رئیس احمد جعفری نے ایک ایسے ہی محبت کرنے والے پاگل کی داستان کو ناول کے رُوپ میں پیش کیا ہے۔ قیمت ۶ روپے

جانے والے

ایک ایسی لڑکی کی کہانی جو محبت کی ایک بے قرار لہر بن کر ایسی چٹان سے جا ٹکرائی جہاں اس کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے، لیکن جس نے زندگی میں سب کچھ کھو کر بھی بہت کچھ پا لیا۔ اختر عادل روپ کا لکھا ہوا ایک حد دل چسپ ناول۔ قیمت ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے

اندھیرے

اُس دلہن کی کہانی جس کی مانگ سیندور کی بجائے ارمانوں کے خون سے بھری گئی اور جسے دنیا نے اتنا کچلا کہ وہ تڑپ کر بغاوت پر آمادہ ہو گئی۔۔۔۔ اگر آپ ان اندھیروں کو اُجالوں میں دیکھنا چاہیں تو اختر عادل روپ کا یہ ناول پڑھئے۔ قیمت ۲ روپے

ایک پیار ایک دھوکا

ایک نوجوان جاسوس کی کہانی جس نے محبت کے جال میں پھنس کر اپنی جان کی بازی لگا دی، ایک ایسی دوشیزہ کی کہانی جو جاسوس کو قتل کرنے کی بجائے خود اُسے زندگی دینے پر مجبور ہو گئی۔ رام سرن شرما کا سنسنی خیز ناول۔ قیمت ۳ روپے ۲۵ نئے پیسے

پہلی لڑکی

ایک ایسی ایکٹریس کی کہانی جو بھیڑ کی کھال میں چھپے ہوئے بھیڑیئے ڈائرکٹروں کے چنگل میں پھنس گئی۔ یہ ایک انوکھا، دل چسپ ناول ہے جسے اداکاراؤں کے رازدار، رازدان ایم اے، نے لکھا ہے اور بے حد مقبول ہوا ہے۔ قیمت ۲ روپے ۹۵ نئے پیسے

کانٹے

ایک ایسی بزدل اور ڈرپوک دوشیزہ کی کہانی، جس کے آنچل میں کلیاں نہیں کانٹے تھے، جس کے دامن میں آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ یہ کانٹے پھول کب بنے؟ یہ شعلے کب بجھے۔ رضیہ سجاد ظہیر کا ایک انوکھا ناول۔ قیمت ۳ روپے ۹۵ نئے پیسے

وعدہ

ایک ایسے ہرجائی قسم کے مرد کی داستانِ عشق جس نے بیک وقت تین عورتوں سے محبت کی۔ رادھا آن پڑھ تھی، میرا تیز و طرار اور اوشا اس کے خوابوں کی رانی۔ مہندر ناتھ کا لکھا ہوا عجیب و غریب ناول۔ قیمت ۴ روپے ۷۵ نئے پیسے

(SBD-1)

شمع بک ڈپو کی مکمل فہرست کتب مفت منگائیے۔

شمع بک ڈپو آصف علی روڈ۔ نئی دہلی

شاہدہ سعید

عورتیں بناؤ سنگار کیوں کرتی ہیں؟

کسی نے کہا ہے "اگر کوئی مرد کسی ڈوبتی ہوئی عورت کو، سمندر یا دریا سے اپنی جان پر کھیل کر بھی بچا لائے، تو کنارے آنے کے بعد شکریہ ادا کرنے سے پہلے وہ اپنی لپ اسٹک ٹھیک کرے گی!" کچھ لوگ کہیں گے کہ یہ بات یورپ کے متعلق تو صحیح ہو سکتی ہے، لیکن ہندستان کے بارے میں صحیح نہیں — مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر ملک اور ہر دور میں بناؤ سنگار کا عورت کی جذباتی زندگی سے گہرا تعلق رہا ہے۔ کچھ پرانے خیال کی عورتیں آج کل کی چھوکریوں کو کوستی ہیں کہ ان کے دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے، اور یہ بن سنور کر "خصم" کی تلاش میں دیدے مٹکاتی گھومتی ہیں، نہ انہیں خاندان کی عزت کی فکر ہے، نہ آگے پیچھے کا لحاظ۔ جب یہ موئی لپ اسٹک نہیں تھی تو کیا قیامت آجاتی تھی۔ ارے ہم لوگ بھی تو تھے . . . .

لیکن جب یہ موئی لپ اسٹک نہیں تھی، اس وقت بھی عورتوں کو اپنے بناؤ سنگار، اور رکھ رکھاؤ کی اتنی ہی فکر ہوتی تھی، جتنی ان بیچاری لڑکیوں کو ہوتی ہے۔ یہی بوڑھی عورتیں جب اپنا زمانہ یاد کرتی ہیں، اور اپنے مانجھے بیٹھنے افشاں، گوٹے لچکے، لباس، ابٹن، اور ہر عضو کے زیور، ان ساری چیزوں کا مزے لے کر بیان کرتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آنکھوں میں گذری ہوئی زندگی دلہن بن کر آ بیٹھی ہے، اور وہ ڈھولک پر اپنے سہاگ کے گیت سن رہی ہیں۔

جب سرخی، پاؤڈر، کریم، لپ اسٹک، یہ ساری چیزیں نہیں تھیں اس وقت عورتیں گلاب کی پنکھڑیاں چباتی تھیں، چقندر کے عرق سے اپنے ہونٹوں پر رنگ لاتی تھیں، انگوروں کو یا لیمو کو چوس کر اپنے لبوں پر تازگی لاتی تھیں۔ جو عورتیں زیادہ ہوشیار ہوتی تھیں وہ اپنے بناؤ سنگار کے لئے رنگ، ابٹن، لیپ، اور موم روغن خود بنا لیا کرتی تھیں۔ خوب سے خوب تر بننے کی خواہش ہمیشہ سے عورت کی زندگی اور عمل کی خاص تحریک رہی ہے، آج یورپ، اور امریکہ میں اربوں ڈالر، نئی وضع، نئے سنگار، لپ اسٹک اور پاؤڈر کے نئے رنگ، اور نئی کریموں کی ایجاد پر خرچ ہوتے ہیں۔ ہر آن بدلتی ہوئی دنیا میں فیشن اور وضع کا ساتھ دینا آنکھ مچولی سے کم نہیں ہوتا۔ سورج کے ساتھ چلتی ہوئی پرچھائیں کی طرح ایک وضع ایک لہر بن کر آتی ہے، اور اپنی مختصر مدت حیات پوری کر کے دوسری لہر میں کھو جاتی ہے۔ اس آنکھ مچولی میں عموماً مرد کی جیب ہلکی ہوتی جاتی ہے تو اس کا ذہن اس کی وجہ تلاش کرنا چاہتا ہے، آخر یہ سب کیوں؟ اور کس لئے؟

اس مسئلے کے بارے میں عورتوں کی رائے زیادہ تر ایک ہی پائی گئی ہے "بناؤ سنگار سے عورت خوبصورت نظر آتی ہے، اور خوبصورتی کا یہ احساس اس کی نظر میں زندگی کو حسین بنا دیتا ہے۔"

مرد کی سب سے بڑی کمزوری شک ہے۔ اکثر وہ عورت کی پیش کی ہوئی دلیلوں پر مشکل سے یقین کرتا ہے۔ جیسے آدم کے جنت سے نکلنے سے اور آج تک عورت اس کے خلاف کوئی بڑی خفیہ سازش کر رہی ہے۔

بات نفسیات، اور انسانیات کے ماہرین تک جا پہنچی۔ اصولوں اور نظریوں کے محل بنائے جانے لگے۔ اور ہر محل میں دلیلوں کے چراغ روشن کئے گئے۔ عورت کی فطرت کا یہ رخ بھی مرد کے لئے ایک پہیلی بن گیا۔

مرد کی شکی فطرت نے کہا "عورت مکار ہے، اور یہ بھی اس کی مکاری اور عیاری کا ایک ہتھیار ہے۔ عورت صرف مرد کو ریجھانے اور فریب دینے کے لئے بناؤ سنگار کرتی ہے۔"

مردوں نے اس دعوے کے حق میں دلیلوں کے دفتر کھول دیئے۔

اگر کوئی مرد کسی ڈوبتی ہوئی عورت کو بچا کر کنارے لے آئے تو اس کا شکریہ ادا کرنے سے پہلے وہ لپ اسٹک ٹھیک کرے گی۔

انگلستان کی ملکہ الزبتھ اوّل کے دور میں ایک انگریز مصنف نے اپنے دل کا بخار اس طرح نکالا "بنتِ حوّا نے خدا کی بنائی ہوئی صورت بگاڑ لی ہے۔ جس طرح فاحشہ اپنی سیرت مسخ کر لیتی ہے، اسی طرح رنگ اور غازے سے عورتیں اپنی صورت مسخ کر لیتی ہیں۔ یہ اصلیت کو مسخ کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟"

اسی صدی میں فرانس کے ایک ادیب نے لکھا — "جب رات کو عورت کے چہرے سے یہ مصنوعی رنگ اتر جاتا ہے، اس وقت وہ گناہ کی طرح کریہہ نظر آتی ہے" خیریت ہوئی وہ حضرت یہیں تک لکھ کے رہ گئے — آگے چل کر انہوں نے مردوں کو بڑا پرخلوص مشورہ دیا کہ کسی عورت سے محبت کرنے یا اس سے شادی کرنے سے پہلے اسے اچھی طرح دیکھ بھال لینا چاہئے۔

مرد جب صاحبِ اقتدار تھے تو انہوں نے اپنی جنس کو فریب کاری سے بچانے کے لئے قانون تک بنا ڈالے۔ ۱۷۷۰ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک قانون منظور کیا، جس کا اطلاق امریکی نوآبادیات پر بھی تھا۔ اس قانون کے مطابق شادی منسوخ ہو سکتی تھی، اور عورت سزا کی مستحق قرار دی جا سکتی تھی، اگر کوئی عدالت کے سامنے یہ ثابت کر دے کہ اس عورت نے خوشبو، رنگ، سنگار، مصنوعی دانت، بناوٹی بال یا اون، اونچی ایڑیاں یا ایسی کوئی اور چیز استعمال کر کے ملک معظم کی رعایا کے کسی مرد کو ریجھا کر اسے شادی کے بندھن میں لانے میں کامیاب ہو گئی۔

اس الزام کے جواب میں عورتیں کیا کہتی ہیں؟

ان کا جواب یہ ہے "عورت مرد کو فریب دینے کے لئے سنگار کرتی ہے، یہ کہنا مردوں کی سراسر ہٹ دھرمی اور ناانصافی ہے۔ ہمیں یہ آزادی کب ملی ہے کہ ہم اپنی مرضی پر چلیں۔ مرد نے صدیوں سے عورتوں کو اپنی مرضی، اپنے خیالات اور اپنی خواہشات کا پابند بنا رکھا ہے۔ ہمیں وہی کرنا پڑتا ہے جو مرد چاہتا ہے۔ اور اس مجبوری کے خلاف ہماری خوبصورتی ہی ہماری سب سے بڑی طاقت ہے اور اسی کے بل پر ہم مردوں کے دل پر حکومت کر سکتے ہیں، اور اسی قوت کی بدولت مرد ہمارے لئے مر مٹتا ہے۔ اسی کے لئے مرد نے لڑائیاں ہاری اور جیتی ہیں، اور اسی کی بدولت حکومتوں کے نقشے بدل گئے ہیں۔ اگر ہم اپنی خوبصورتی کی حفاظت نہ کریں تو مرد کی آنکھ کب وفادار ہے؟ وہ کہیں اور اپنی منزل اور مقصود نظر تلاش کر لیتی ہے۔"

اس لئے ایک نظریہ یہ پیدا ہوا کہ عورتیں دوسری عورتوں کو دکھانے کے لئے اور ان پر اپنی برتری ظاہر اور ثابت کرنے کے لئے سنگار کرتی ہیں۔ آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ اگر کسی عورت کو شادی، بیاہ یا کسی اور تقریب میں شریک ہونا ہے اور فرض کر لیجئے کسی پریشانی یا شوہر کی بے روزگاری کی وجہ سے اس کے زیور فروخت ہو چکے ہیں، یا رہن رکھے ہیں۔ ایسے موقعوں پر اسے اپنی ننگی کلائی، خالی گردن، اور دوسرے زیورات کی کمی بہت بری طرح کھلتی ہے۔ کسی سے زیورات مانگ کر پہننے میں وہ اپنی سبکی محسوس کرتی ہے اور جو عورتیں دینے پر رضامند ہوتی ہیں، وہ دل ہی دل میں فخر کا احساس پاتی ہیں۔ آپ نے اکثر عورتوں کو یہ کہتے بھی سنا ہوگا ——

بعض قبیلوں کی بالغ لڑکیاں اپنے بالائی ہونٹ، رخسار، ناک اور ٹھوڑی پر سانپ کی سی لہریں بناتی ہیں۔

"فلاں کی بہو تو سونے سے بالکل پیلی ہو رہی تھی" یہ بات صرف قدیم ماحول پر ہی موقوف نہیں، نئی روشنی کی لڑکیاں بھی اس کمزوری سے محفوظ نہیں۔ وہ بھی دوسری لڑکیوں کے لباس، فیشن، بالوں کے ڈیزائن، چپلیں، کوٹ، ان سب چیزوں سے متاثر ہوتی ہیں، اور دوسروں کو متاثر کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

ایک زمانہ وہ تھا جب بناؤ سنگار اور لباس، حیثیت، اور رتبہ کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ ورنہ اس کے سوا ان طویل پائچے دار پاجاموں کی کیا وجہ ہو سکتی تھی جنہیں بیگم صاحبہ خود سنبھال نہیں سکتی تھیں۔ ملازمہ ساتھ اٹھا کر چلتی تھی جب بناؤ سنگار کے لوازمات قیمتی تھے تو صرف امیر عورتیں ہی انہیں مصرف میں لا سکتی تھیں۔ یہ بات صرف ہندوستان تک محدود نہیں تھی۔ نوآبادیاتی امریکہ میں بھی امیر پاؤڈر، کریم، اور خوشبو استعمال کرتے تھے، اور اسے اپنا طرۂ امتیاز سمجھتے تھے۔ فرانس کے انقلاب میں بھی جو سر قلم کیے گئے، ان میں زیادہ تر ان رؤسا کے تھے جو آٹے کو پاؤڈر کی طرح اپنے سروں پر لگایا کرتے تھے جب کہ غریب اسی آٹے کے لئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اور سسک سسک کر جان دیتے تھے۔

آج کے دور میں جب بناؤ سنگار کی چیزیں بہ افراط کم قیمت پر مل جاتی ہیں، اور برنئی وضع اخباروں اور رسالوں کے صفحات سے اٹھ کر گھروں اور بازاروں میں آجاتی ہے، ایسی صورت میں یہ کہنا کہ عورتیں دوسری عورتوں کو دکھانے کے لئے سنگار

جب موئی لپ اسٹک نہیں تھی تو عورتیں انگور یا بیر چوس کر ہونٹوں پر تازگی لاتی تھیں۔

قدیم مصر میں عورتیں صرف اپنی آنکھیں ہی نہیں اپنے پیروں کے تلوے بھی رنگتی تھیں۔

کرتی ہیں، محض خام خیالی ہے۔

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ عورتیں کسی پراسرار نسائی تحریک کے تحت بناؤ سنگار کرتی ہیں۔ ماہرین نفسیات نے یہ مشاہدہ کیا ہے کہ بناؤ سنگار کا عورت کی دماغی صحت، اور جذباتی زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے۔ نسائی نفسیات پر کام کرنے والوں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ عورتیں اس وقت بناؤ سنگار کرتی ہیں، جب وہ بہت زیادہ خوش ہوتی ہیں اور اس وقت بھی جب ان کی طبیعت بہت زیادہ مضمحل ہوتی ہے۔ پہلے ہندستان میں جب ستی کا رواج تھا، اس وقت سہاگن اپنے شوہر کی چتا میں بیٹھنے سے پہلے سولہ سنگار کرتی تھی۔ بعض ایسی خودکشی کی وارداتوں میں بھی، جب دو چاہنے والوں نے مشترکہ خودکشی کی ہے، یہ دیکھا گیا ہے کہ عورت نے جان دینے سے پہلے سنگار کیا ہے۔ نفسیاتی امراض میں ایک پیچیدہ مرض یہ بھی ہے کہ بعض عورتوں کو بناؤ سنگار کے بعد بند کمروں سے ڈر لگتا ہے۔

اس لئے ماہرین نفسیات اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ بناؤ سنگار کا کسی پُراسرار نسائی تحریک سے گہرا تعلق ہے۔ بعض عورتیں بناؤ سنگار اس لئے کرتی ہیں کہ ان کی اصل شخصیت ظاہر نہ ہو، لیکن زیادہ تر عورتیں بناؤ سنگار اس لئے کرتی ہیں کہ ان کی شخصیت طبیعت، پسند اور مذاق کا مکمل اظہار ہو، اور یہی رویہ دماغی صحت اور جذباتی توازن کی علامت ہے۔

جن ماہرین انسانیات نے تہذیبی زندگی کے ارتقا اور اس سے بناؤ سنگار کے تعلق کا مطالعہ کیا ہے، ان کا انکشاف یہ ہے کہ قدیم ابتدائی سماج کی رسموں میں چہرے

قدیم یونان میں جہاں مردوں کی بالادستی تھی عورتوں کا سنگار نہ ہونے کے برابر تھا۔

کورنگنا لڑکی کے بالغ ہونے کی مقدس رسم سے تعلق رکھتا ہے۔ بورنیو کے ایک قبیلے کی یہ رسم ہے کہ جب کوئی لڑکی بالغ ہوتی ہے تو ایک عام دعوت ہوتی ہے، اور اس تقریب میں اس لڑکی کا چہرا ایک غلام کے خون سے رنگا جاتا ہے۔ جنوبی امریکہ میں مشرقی کولمبیا اور وینزویلا کے قدیم امریکی ہندستانیوں کی لڑکیاں جب شادی کے سن و سال تک پہنچتی ہیں، تو اپنے بالائی ہونٹ، رخسار، ناک ٹھوڑی پر چمکدار سرخ رنگ کے لیپ سے سانپ کے شکل کی لہریں بناتی ہیں۔ جس طرح اتر پردیش (یوپی) کے دیہاتوں، اور کم پڑھی لکھی عورتوں میں گدنا، کرانے کا رواج ہے، اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عورتیں اس طرح بلاؤں سے محفوظ رہتی ہیں کیلی فورنیا یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کا خیال ہے کہ امریکی لڑکیاں جب سن بلوغ کے قریب آتی ہیں تو لپ اسٹک لگانا شروع کر دیتی ہیں۔ اس طرح وہ اپنے بالغ ہونے کا اظہار کرتی ہیں، اور خود کو سماجی زندگی میں ایک نئے رتبہ کا حقدار سمجھتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نسائی فطرت بناؤ سنگار سے اپنے جوہر لطیف کو ظاہر کرتی ہے، اور اسے اپنے بالغ ہونے کا حق سمجھتی ہے، لیکن اگر آپ تاریخ پر نظر ڈالیے، تو آپ یہ دیکھیں گی کہ بناؤ سنگار کا عورتوں کی آزادی سے بہت گہرا اور قریبی تعلق ہے۔ جس دور میں عورتوں کو آزادی حاصل تھی، وہ اپنی خوبصورتی کا بڑا اہتمام کرتی تھیں۔ قدیم مصر میں عورتوں کو کافی آزادی حاصل تھی تو مصری عورتیں اپنی بھویں، پلکیں، ناخن اور دیگر اعضا کے ساتھ ساتھ اپنے پیروں کے تلوے بھی رنگتی تھیں۔ مہندی کے علاوہ دوسری اشیا بھی اس کے سنگار کے اہتمام میں شامل ہوتی تھیں۔ اس کے برعکس قدیم یونان میں جہاں مردوں کی بالادستی تھی، عورتوں کا سنگار تقریباً نہیں کے برابر تھا۔ قدیم روم میں عورتوں کو کافی معاملات میں آزادی حاصل تھی، اس لئے وہاں کی عورتیں بناؤ سنگار میں کافی آگے بڑھی ہوئی تھیں۔ وہ کریم، خضاب، رنگ، پالش، ایسی اشیاء کے استعمال سے واقف تھیں، جن کا اس دور کے شاعروں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کے برعکس یورپ کے تاریک دور میں جب عورتیں بند رکھی جاتی تھیں، اور نائٹ (بہادر شرفا) اپنی بہیں سرکرنے میں سرگرداں رہتے تھے۔ اس دور میں بھی عورتیں بناؤ سنگار سے بے نیاز اور بیگانہ تھیں۔

یہ سب اس دور کی باتیں ہیں جب عورت کی زندگی کامیابی یا ناکامی صرف مرد کی خوشنودی پر منحصر تھی۔ عورت کا دائرۂ عمل محدود تھا۔ لیکن آج کے دور میں جب کہ مرد اور عورت ان کا دائرۂ عمل ایک دوسرے کے قریب آرہا ہے۔ فاصلے اور امتیاز ختم ہو رہے ہیں۔ عورتیں مرد کے دوش بدوش کام کر رہی ہیں، ان کی زندگی میں نئی سمتیں، نئی اڑانیں شامل ہو چکی ہیں، ان باتوں کا عورت کی سج دھج لباس، اور اس کے بناؤ سنگار پر بھی گہرا اثر پڑا ہے۔ عورتیں مردوں کی وضع اور لباس کو اپنا رہی ہیں، اور آج کا مرد بھی اپنے بالوں کی وضع، لباس، اور چہرے کی شگفتگی کے بارے میں بہت حساس ہے۔ بات یہ ہے کہ مروجہ قدروں کی بساط الٹ چکی ہے، اور آج کے دور میں یہ ضروری نہیں کہ عورت ہی مرد کی محبت کی طلبگار ہو۔ جنسی مساوات کی لہر نے مرد کو بھی اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ عورت کی محبت حاصل کرنے کے لئے ہر زاویہ، اور ہر کوشش کام میں لائے ورنہ اس کی زندگی ادھوری، تشنہ اور اکارت رہ جائے گی۔

بناؤ سنگار ہر دور میں عورتوں کی آزادی کی علامت رہا ہے۔

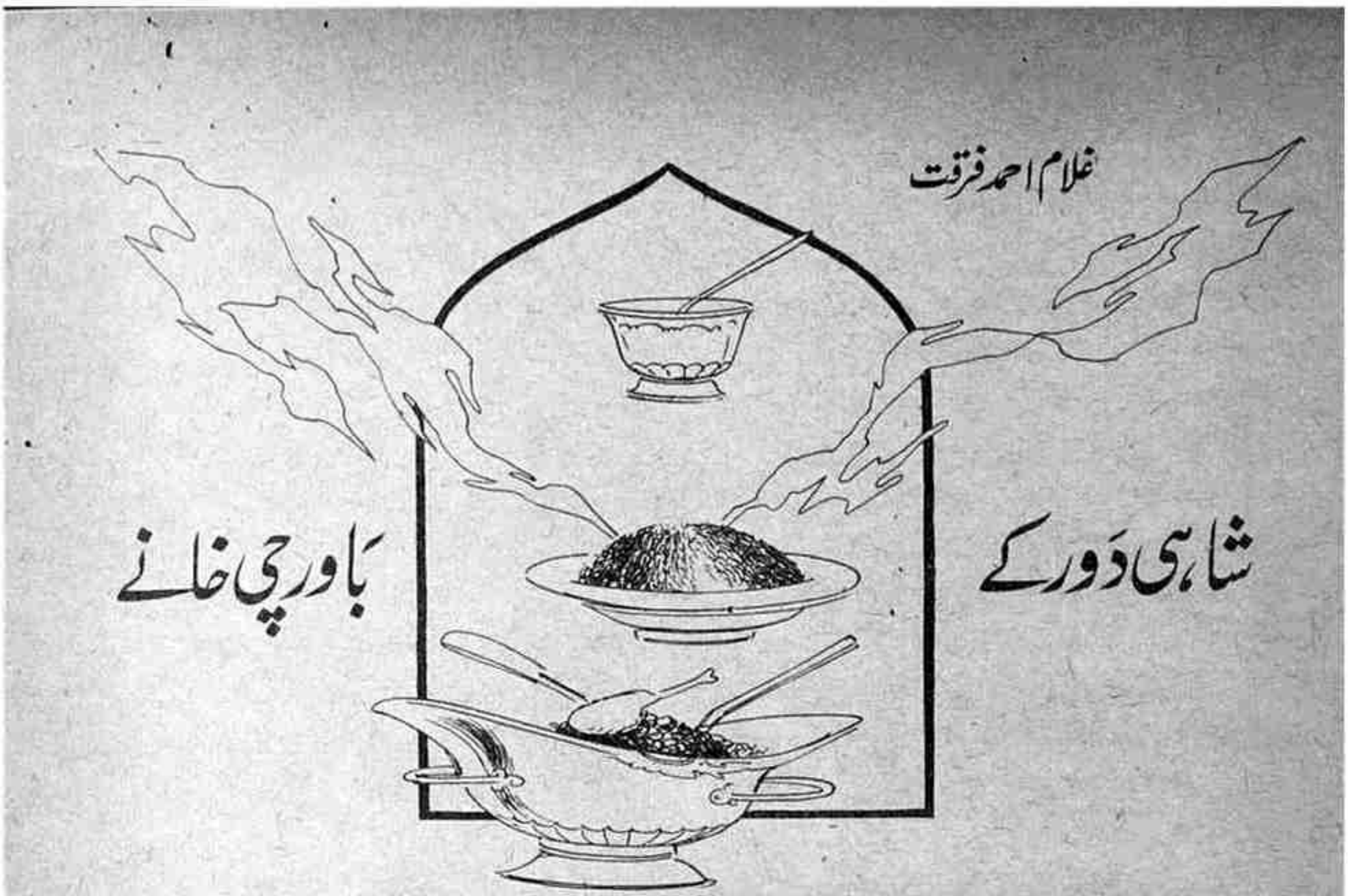

شاہی دَور کے باورچی خانے

غلام احمد فرقت

اس ڈالڈا کے دَور میں جب دورِ شاہی کے باورچی خانوں کا تصور دماغ میں گشت کرتا ہے تو زبان آپ ہی آپ چٹخارے لینے لگتی ہے اور کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے تھوڑی دیر کے لئے ہم دیوؤں اور پریوں کی دنیا میں پہنچ گئے ہیں اور اُن کے مفروضہ دسترخوانوں پر چنی غذاؤں اور کھانوں پر بیٹھے طبع آزمائی کر رہے ہیں حالانکہ یہ سارے کے سارے دسترخوان کسی زمانے میں مشرقی تہذیب و تمدن کا ایک جزو تھے اور اب بھی اگر آپ تاریخ کی ورق گردانی کریں تو جگہ جگہ وضاحت سے ان کا ذکر ملتا ہے، بلکہ بعض مورخین نے تو نہ صرف اُن ڈیوڑھیوں اور باورچی خانوں کی تفصیل دی ہے بلکہ باورچیوں کے نام ان کے تیار کئے ہوئے کھانے اور اُن خاوماؤں تک کے نام دیئے ہیں جو ڈیوڑھیوں پر کھانے لے جاتی تھیں۔ نوابین اودھ میں نواب شجاع الدولہ اور ان کے امراء اپنی نفاست پسندی میں خاص شہرت کے مالک رہے ہیں۔ اُسی زمانے میں اودھ کے شاہی باورچی خانے کے مہتمم حسن رضا خاں عرف مرزا حسنو تھے جن کے نائب مہتمم اور شاگرد ایک شیخ زادے مولوی فضل عظیم نامی تھے جو ضلع اناؤ کے رہنے والے تھے اور خاصے کے خوان اپنی نگرانی میں لے کر ڈیوڑھی پر حاضر ہوتے تھے، جہاں سے مہریاں خوانوں کو محل کے اندر لے جاتی تھیں ان مہریوں میں پنیا بینا اور دھنیا بہری خاص طور پر مشہور رہیں۔

نواب شجاع الدولہ کے دَور میں یوں تو ہر امیر کا دسترخوان انواع و اقسام کی مرغن غذاؤں سے آراستہ ہوتا تھا۔ لیکن نواب شجاع الدولہ کے دسترخوان کی بات ہی اور تھی۔ ان کے زمانے کے چھ باورچی خانے بہت مشہور تھے۔ اول خود نواب شجاع الدولہ کی محل خاص بہو بیگم کا باورچی خانہ جس کا یومیہ خرچ دو ہزار روپے تھا یعنی ساٹھ ہزار روپے مہینہ یا سات لاکھ بیس ہزار روپے سال، نواب کے دسترخوان کی خصوصیت یہ تھی کہ علاوہ اس کھانے کے جو خود بہو بیگم کے باورچی خانے میں تیار ہوتا تھا، پانچ دوسرے باورچی خانوں کے اچھے اور لذیذ کھانے بڑے بڑے خوانوں میں چن کر آیا کرتے تھے اور نواب کے دسترخوان پر پیش ہوتے تھے۔ یہ پانچوں باورچی خانے شاہی باورچی خانے کے ہم پلّہ تھے۔ چھوٹے باورچی خانوں کے نام سے موسوم تھے۔ اور جس کے مہتمم اور نائب مہتمم بھی علیحدہ ہوتے تھے مثلاً ایک باورچی خانے کے مہتمم مرزا احسن علی تھے جن کی جگہ پر بعد میں عنبر علی خاں خواجہ سرا کو مقرر کر دیا گیا تھا اور اس باورچی خانے کا یومیہ خرچ تین سو روپے یعنی ایک لاکھ آٹھ ہزار روپے سال تھا۔ دوسرا باورچی خانہ شجاع الدولہ کی والدۂ محترمہ کا تھا جو نواب بیگم صاحبہ کے نام

سے مشہور تھیں تیسرا باورچی خانہ مرزا علی خاں کا تھا اور چوتھا سالار جنگ کا اور پانچواں اور چھٹا شجاع الدولہ کے برادرِ نسبتی یعنی بہو بیگم کے بھائیوں کا تھا۔

جس نفاست پسندی کے ساتھ کھانے تیار کئے جاتے تھے وہ تو خیر اُس دَور کی خصوصیت ہی تھی مگر شاہی دسترخوان کی صورت یہ تھی کہ چونکہ نواب شجاع الدولہ بہو بیگم کے ساتھ کھانا تناول فرما تو تھے اس لئے کھانا چننے میں بھی بڑے اہتمام سے کام لیا جاتا تھا، بہو بیگم صاحبہ پہلے سے دسترخوان پر موجود رہتی تھیں اور جو جو خوان دسترخوان پر آتے جاتے تھے انہیں میں سے یہاں بہو بیگم کے سامنے کھولتی جاتیں اور ان میں جو جو پسندیدہ چیزیں مرغوب ہوتیں وہ دسترخوان پر نکال کر رکھ لیتیں۔ سب کھانے متنظمین مطبخ دیکھ کر اور ان کی باقاعدہ جانچ کر کے بھیجتے تھے کہ ان کے ذائقہ میں کوئی فرق تو نہیں ہے۔

باورچیوں کے ملازم رکھنے میں بھی بڑی چھان بین سے کام لیا جاتا تھا دلی یا دوسری جگہوں سے کوئی صاحب کمال باورچی پہنچ جاتا تو اس کا امتحان لینے کے بعد اسے پروانۂ تقرری عطا ہوتا۔ صرف ایک چیز اچھی تیار کرنے والے باورچی کی بھی وہ قدردانی اور حوصلہ افزائی ہوتی کہ اس کا دل خوش ہو جاتا۔ چنانچہ نواب آصف الدولہ کے دَور میں ایک نیا باورچی پیش ہوا جو صرف ماش کی دال پکاتا تھا۔ اس سے شاہرہ دریافت کیا گیا تو بولا پانچ سو روپے ماہانہ لوں گا مگر چند شرائط کے ساتھ اور وہ یہ کہ جب سرکار میرے ہاتھ کی پکی دال نوش فرمانا چاہیں تو ایک روز پہلے حکم دیدیں دوسرے جوں ہی اطلاع دوں کہ خاصہ تیار ہے اسی وقت تناول فرمالیں۔ نواب نے شرطیں منظور کرلیں اور باورچی ملازم ہوگیا۔ چند ماہ بعد باورچی کو دال پکانے کا حکم ہوا۔ چنانچہ اس نے دال تیار کی اور نواب کو خبر کی۔ نواب اس وقت کچھ ضروری باتوں میں مصروف تھے چنانچہ انہوں نے کہلا بھیجا کہ دسترخوان بچھاؤ میں آتا ہوں۔ مگر اس کے بعد بھی جب نواب کو دیر ہوئی تو باورچی نے تیسری بار اطلاع دی کہ حضور خاصہ نوش فرمالیں، مگر پھر بھی نواب کو کسی قدر تاخیر ہوگئی۔ اس پر باورچی اس قدر ناراض ہوا کہ اس نے دال کی ہانڈی چولھے پر سے اتار کر ایک سوکھے درخت کے تھالے میں انڈیل دی اور خود استعفےٰ دے کر چلتا ہوا۔ کہتے ہیں کہ دوسرے روز وہ درخت جو بالکل سوکھا تھا سرسبز ہوگیا۔ نواب کو اس کے جانے کا بڑا قلق ہوا مگر باوجود تلاش کے اس کا سراغ نہ مل سکا۔

یہ واقعہ ہے کہ جیسے باکمال باورچی تھے ویسے ہی ان کی قدر اور عزت افزائی کرنے والے بھی۔ چونکہ دولت کی فراوانی تھی اس لئے باورچیوں سے جو فرمائشیں کی جاتیں تھیں ان پر مصارف کا خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ بلکہ بادشاہ، امرا اور روسا میں کھانے پکوانے میں اکثر مقابلے ہوتے تھے چنانچہ اس سلسلہ کے دو تین واقعات ملاحظہ ہوں۔

ایک مرتبہ مرزا فرخ بخت کے صاحبزادے مرزا آسمان قدر لکھنؤ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کے مہمان ہوئے تو دسترخوان پر ایک مربہ ایسا لاکر رکھا گیا جو بظاہر اس درجہ لطیف اور مرغوب معلوم ہوا کہ شہزادہ آسمان قدر نے مربہ سمجھ کر اس کا لقمہ کھایا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مربہ نہیں بلکہ تورمہ ہے۔ اس پر واجد علی شاہ مسکرادئے اور شہزادے کو بڑی ندامت ہوئی۔ کچھ عرصے بعد شہزادے نے بادشاہ کو دعوت دی اور وہ یہ سمجھ کر اس دعوت میں شریک ہوئے کہ شہزادہ ضرور ان سے انتقام لے گا اس لئے دسترخوان کی ہر چیز کو وہ سوچ سمجھ کر اٹھاتے۔ مگر اس کے بعد بھی وہ دھوکے پر دھوکے کھاتے رہے کیونکہ آسمان قدر کے مشہور باورچی شیخ حسین علی نے تمام کھانے جن میں پلاؤ، زردہ، بریانی، تورمہ، کباب، ترکاری چٹنیاں غرض تمام الوانِ نعمت حتیٰ کہ اچار، روٹیاں، پراٹھے اور شیرمالیں شکر سے تیار کی تھیں حد یہ ہے کہ دسترخوان پر جتنے برتن تھے وہ سب اور ان کے علاوہ پیلھی اور لوٹا تک شکر کا بنایا تھا۔ واجد علی شاہ جس چیز کو اٹھاتے دھوکہ کھاتے۔

جب امن اور سکون کی فضا ہوتی ہے تو لوگوں کے دماغ بھی طرح طرح کی جدت طرازیوں پر اُتر آتے ہیں۔ چنانچہ باورچیوں نے بھی بڑی بڑی جدتوں سے کام لیا۔ ہندوستان میں جو پلاؤ انار دانہ مشہور ہے وہ اُسی دور کی باورچیوں کی جدت پسندی کا نتیجہ ہے۔ اس پلاؤ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ چاول کا ہر دانہ آدھا یاقوتی رنگ کا ہوتا اور آدھا سفید اور جب اُسے قابوں میں رکھ دیا جاتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ قابوں میں ہیرے جواہرات چن کر رکھ دیئے گئے ہیں۔ اُسی دور کی ایجاد نورتن پلاؤ بھی ہے جس میں نو رنگ کے چاول ملے ہوتے تھے اور چاولوں کو ایسی صفائی اور نفاست کے ساتھ رنگا جاتا تھا کہ کہیں سے اس کا شبہ نہ ہوتا تھا کہ وہ چاول ہیں یا ہیرے جواہرات کے ٹکڑے۔

اسی دور کے ایک مشہور رئیس نواب عبدالقاسم خاں تھے جن کے یہاں ایک نئی قسم کا پلاؤ پکتا تھا جو بھاری پلاؤ کہلاتا تھا۔ اس پلاؤ کے پکانے میں سب سے پہلے چوتھائی سیر گوشت کی یخنی مقطر کرلی جاتی تھی اور اس کے بعد اس یخنی میں چاول دم کئے جاتے تھے یہ چاول موہنہ میں رکھتے ہی اس طرح پگھل جاتے تھے کہ کھانے والے کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ چاول کھانے کی بجائے کوئی شوربہ پی رہا ہے۔ اس سلسلے کا ایک بڑا لطیفہ سننے کے قابل ہے۔

اودھ کے آخری دور میں جب لکھنؤ تقریباً لٹ چکا تھا، ایک حکیم بندہ مہدی تھے جن کے یہاں ایک دن ایک پہلوان کو کھانے پر مدعو کیا گیا۔ اس پہلوان کی یومیہ غذا بھی عجیب تھی وہ روز صبح کو بیس سیر دودھ پیتا تھا اس کے بعد ڈھائی تین سیر بادام

اور پستوں کی شکار کرتا تھا۔ دوپہر اور رات کے کھانے میں ایک بکرا اور دو ڈھائی سیر آٹے کی روٹیاں کھاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کی دعوت کرنا کوئی آسان بات نہ تھی مگر اُس دور میں چونکہ پیسے کی تنگی نہ تھی اس لئے لوگ اس قسم کی تفریحوں کے عادی تھے پہلوان نے حکیم صاحب کے یہاں پہنچ کر کھانے کا انتظار کرنا شروع کیا لیکن حکیم صاحب ٹالتے رہے جب پہلوان کی بھوک اس کی برداشت سے باہر ہوگئی تو حکیم صاحب نے اندر سے ایک مُہری کے ہاتھ خوان بھیجا۔ پہلوان خوان کو دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ لیکن جب اس نے خوان پوش اٹھا کر دیکھا تو اس میں کم و بیش چھٹانک بھر پلاؤ کے دانے تھے۔ وہ بے حد ناراض ہوا، اس نے طشتری اٹھا کر موہنہ میں انڈیل لی۔ ظاہر ہے کہ چھٹانک بھر پلاؤ کی بساط ہی کیا اونٹ کے موہنہ کو زیر اتھا، لیکن چند ہی منٹ بعد پہلوان کو شدت سے پیاس لگی اور بے تاب ہو کر اس نے تین چار بار پانی پیا اور ڈکار لی۔ اتنے میں باقاعدہ دسترخوان بچھا اور حکیم صاحب نے پہلوان کو کھانے کی دعوت دی۔ مگر پہلوان اس قابل نہ تھا کہ وہ ایک لقمہ بھی کھا سکتا وہ کہتا تھا کہ مجھے ایسی توانائی محسوس ہو رہی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔

بعض شوقین اور دولت مند امیر بڑے اہتمام سے مرغ پلاؤ پکواتے تھے اور یہ مرغ پلاؤ اس طرح تیار کیا جاتا تھا کہ مرغ مشک اور زعفران کی گولیاں کھلا کر پالے جاتے تھے اور جب وہ اچھے تن و توش کے ہو جاتے اور مشک اور زعفران ان کے رگ و ریشے میں اس طرح سرائت کر جاتی کہ ان کے جسم سے خوشبو آنے لگتی تو مرغ کی یخنی نکال کر اس میں چاول دم کر لئے جاتے۔

اسی زمانے میں پلاؤ کی ایک قسم موتی پلاؤ کہلاتی تھی اور یہ موتی پلاؤ جب قاب میں رکھا ہوتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے سچے اور آبدار موتیوں کو پلیٹ میں لاکر رکھ دیا گیا ہے اس کے تیار کرنے کی ترکیب یہ تھی کہ تولہ بھر چاندی کے ورق اور ایک ماشہ سونے کے ورق انڈے کی زردی میں ملا کر زردی کو حل کر لیا جاتا۔ اس کے بعد اس حل کی ہوئی زردی کو مرغ کے نرخرے میں بھر کر نرخرے کے ہر ہر جوڑ پر باریک تاگا کس کے باندھ دیا جاتا اور اس کے بعد ایک معمولی جوش دے کر چاقو سے نرخرے کی کھال چاک کر دی جاتی اور سڈول آبدار موتی نکل آتے جو پلاؤ میں گوشت کے ساتھ دم کر دیئے جاتے۔ بعض باورچی پنیر کے موتی بناتے اور اس پر چاندی کا ورق چڑھا دیتے۔ غرض سیکڑوں ہزاروں طرح کے کھانے اُس دور میں ایجاد ہوتے اور ان کے پکانے میں نئی نئی جدتوں سے کام لیا جاتا۔ ان شاہی کھانوں میں جو دسترخوان پر ہوتے تیس چالیس قسم کے پلاؤ اور بیس بائیس قسم کے سالن ہوتے مگر اب زمانے کے ساتھ ساتھ ان کھانوں کے بارے میں اگر غور کیجئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ سب خواب و خیال کی باتیں ہیں۔ اب نہ وہ قدردان رہے اور نہ باورچی۔ —

حیاتِ سرورِ کائنات

رسول اللہ صلعم کے حیات مبارک کا مفصل بیان، حضور کے اخلاق اور زندگی پر مکمل کتاب ملّا واحدی کا اندازِ بیان، یہ کتاب نہ صرف مسلمانوں کو ہی بلکہ ہر فرد کو پڑھنی چاہئے۔
قیمت: ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے

آخرت کا سفرنامہ

قبر میں داخل ہونے سے لے کر روزِ قیامت تک کے پیش آنے والے واقعات کا مفصل بیان۔ عالم ارواح کی سیر کرنی ہو تو مولانا وحید الزماں قاسمی کی لکھی ہوئی یہ کتاب پڑھیں قیمت: ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے۔

شہید اعظم

شہادتِ امام حسین کا بیان اور پھر امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی زبان، اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ یہ کتاب کس معیار کی ہوگی۔ قیمت: ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے۔

قرآن اور عورت

قرآنِ کریم نے عورت کو قعرِ مذلت سے نکال کر کس طرح بامِ عروج پر پہنچا دیا، کن کن فرائض کی ادائیگی کے لئے اس کو تنبیہ کی، اسلام نے عورت پر کیا کیا احکام صادر کئے۔
قیمت: ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے۔

شاہنامہ اسلام

یہ تاریخِ اسلام کی منظوم کتاب ہے جس میں ایسے واقعات درج ہیں جن کو پڑھ کر آپ کی رگِ حمیت پھڑک اٹھے گی اور اسلام کی صحیح روح تازہ ہو جائے گی۔ شاہنامہ اسلام حفیظ جالندھری کا بیش بہا کارنامہ رف گلیز فی جلد ۲ روپے۔ مکمل چاروں حصے ۸ روپے
گلیز سفیدی جلد ۳ روپے، مکمل چاروں حصے ۱۲ روپے

مجدّدِ اعظم (الف ثانی)

۱۹۷۱ء میں جب کہ ہندوستان پر شرک و کفر اور بدعت و ضلالت برس رہی تھی، سرہند میں شیخ احمد کی ولادت باسعادت ہوئی۔ آپ نے اپنے روحانی کمالات سے ظلمت کدۂ ہند کو کس طرح لقۂ نور بنا دیا ایک روح پرور کتاب۔ قیمت: ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے۔

مکتبہ دینیات، آصف علی روڈ، نئی دہلی

واپسی

"رات گذری، ستاروں نے اپنے
اوس گرتی رہی وادیوں پر

اب تو پچھلے پہر کی ہوائیں
کہکشاں گردِ رہ بن گئی ہے

مجھ کو سناٹے دیتے ہیں تسکیں
پھر بھی رہ رہ کے فطرت میں میری

عیشِ رفتہ کی کب تک گدائی
آگ کے کھیت کی نصل شعلے

یوں جو دیکھوں تو ہیں پاس میرے
ان کے چھوٹے سے مٹی کے گھر میں

میری آزاد فطرت کا سیلاب
وسعتیں کائناتوں کی تسخیر کر

اس گھروندے کی قیمت ہی کیا ہے
ایک ساتھی اگر چھوٹ جائے

اور پھر گھر کی بنیاد کانپی
چھت سے گاڑھا دھواں پھوٹ نکلا

اک سہاگن کہ تھا نام جس کا
درگذر تھا ستوں جس کے گھر کا

اپنے چھوٹے سے مٹی کے گھر کو
سونپ دی ناؤ اپنی بھنور کو

ٹمٹماتے دیے سب بجھائے
رات گزری مگر تم نہ آئے

لا رہی ہیں سندیسہ سحر کا
چاند نے رخت باندھا سفر کا

مجھ کو تنہائی چمکارتی ہے
کوئی ناگن سی پھنکارتی ہے

میں ہوں دھرتی کی خوددار جائی
بے وفائی کا پھل بے وفائی

ان سے بڑھ کر دغا کے بہانے
مجھ پہ گزرے ہیں کیا کیا زمانے

گھٹ رہا ہے کناروں میں اس کے
کھو گئی ہیں حصاروں میں اس کے

اس سے آگے جہاں اور بھی ہیں
راہ میں کارواں اور بھی ہیں"

ہر ستوں کے قدم ڈگمگائے
طاق و دیوار و در لڑکھڑائے

آسماں کے ستاروں کو پیارا
اور وفا جس کے دل کا سہارا

چھوڑ کر رہگذاروں میں آئی
اور طوفاں سے کی آشنائی

اس نے دیکھے امڈتے اندھیرے
اس نے پہروں سنا رعد کا راگ

پُر ہجوم اور آباد سڑکیں
تھام لینے کو پُر شوق بازو

اس کے احساس کو راس آئی
راہ گم کرنے کی سرخوشی اور

وہ بھٹکتی رہی بے ارادہ
اپنی نظروں میں کچھ رنگ رکھے

اس نے دیکھے گرجتے سمندر
اس کے دل سے اٹھا شورِ محشر

جگمگاتی ہوئی شاہراہیں
خیر مقدم کو تشنہ نگاہیں

خارزاروں میں بڑھنے کی لذت
سنگلاخوں پہ چڑھنے کی لذت

اپنے رہوار کی باگ تھامے
اپنے سینے میں کچھ راگ تھامے

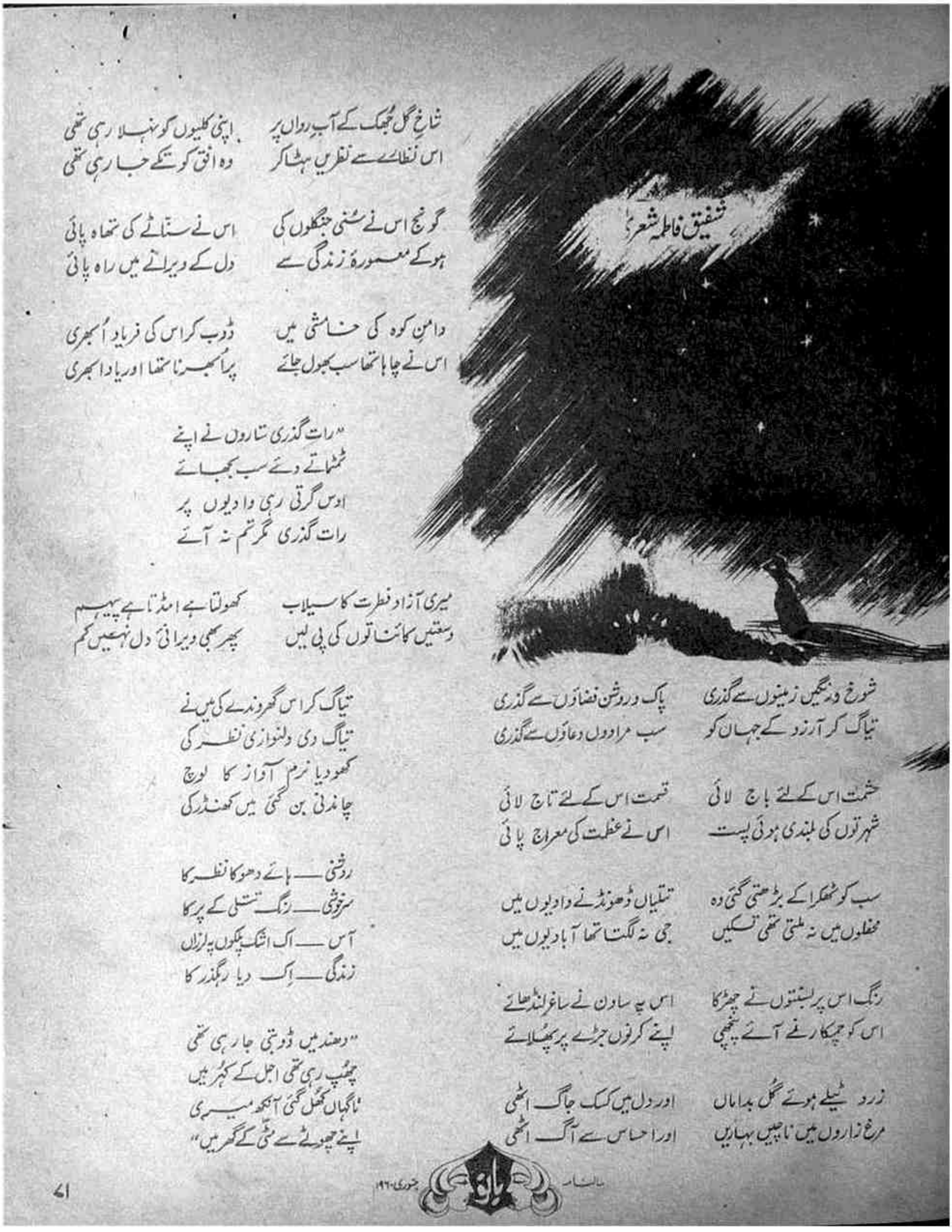

شفیق فاطمہ شعریٰ

شاخِ گل جُھک کے آبِ رواں پر
اپنی کلیوں کو نہلا رہی تھی
اس نظارے سے نظریں ہٹا کر
وہ افق کو تکے جا رہی تھی

گونج اس نے سُنی جنگلوں کی
اس نے سناٹے کی تھاہ پائی
ہو کے معمورۂ زندگی سے
دل کے ویرانے میں راہ پائی

دامنِ کوہ کی خامشی میں
ڈوب کر اس کی فریاد اُبھری
اس نے چاہا تھا سب بھول جائے
پر اُبھرنا تھا اور یاد اُبھری

"رات گذری تاروں نے اپنے
ٹمٹماتے دیئے سب بجھائے
اوس گرتی رہی وادیوں پر
رات گذری مگر تم نہ آئے"

میری آزاد فطرت کا سیلاب
کھولتا ہے امڈتا ہے پیہم
وسعتیں کائناتوں کی پی لیں
پھر بھی ویرانیٔ دل نہیں کم

شوخ و رنگیں زمینوں سے گذری
پاک و روشن فضاؤں سے گذری
تیاگ کر آرزو کے جہان کو
سب مرادوں دعاؤں سے گذری

حشمت اس کے لئے باج لائی
قسمت اس کے لئے تاج لائی
شہرتوں کی بلندی ہوئی پست
اس نے عظمت کی معراج پائی

سب کو ٹھکرا کے بڑھتی گئی وہ
تتلیاں ڈھونڈنے وادیوں میں
محفلوں میں نہ ملتی تھی تسکیں
جی نہ لگتا تھا آبادیوں میں

رنگ اس پر لبستوں نے چھڑکا
اس پہ ساون نے ساغر لنڈھائے
اس کو چمکارنے آئے پنچھی
اپنے کرنوں بھرے پر پھُلائے

زرد ٹیلے ہوئے گُل بداماں
اور دل میں کسک جاگ اٹھی
مرغ زاروں میں ناچیں بہاریں
اور احساس سے آگ اٹھی

تیاگ کر اس گھروندے کی میں نے
تیاگ دی دلنوازی نظر کی
کھو دیا نرم آواز کا لوچ
چاندنی بن گئی میں کھنڈر کی

روشنی — ہائے دھوکا نظر کا
سرخوشی — رنگ تتلی کے پر کا
آس — اک اشک پلکوں پہ لرزاں
زندگی — اک دیا رہگذر کا

"دھند میں ڈوبتی جا رہی تھی
چھُپ رہی تھی اجل کے کہر میں
ناگہاں کھُل گئی آنکھ میری
اپنے چھوٹے سے مٹی کے گھر میں"

ستم

جب بھی اس نے کسی کو چاہا، دھوکا کھایا۔ کبھی کسی نے اسے پیار کے دو بول نہ دئے۔ اور اگر کبھی کسی نے اس سے محبت بھی کی تو عارضی۔ یہ زمانے کا رمیش پر ستم نہیں تو اور کیا تھا؟ اور پھر رمیش نے بھی اس ستم کے بدلے گن گن کر اوشا سے لئے۔ رمیش کی محبتوں، ناکامیوں حسرتوں اور لاچاریوں کی داستان کرشن گوپال عابد کے نئے ناول ستم میں پڑھئے۔ قیمت: ۴ روپے ۷۵ نئے پیسے

باون پتّے

ان نوجوان لڑکیوں کی داستان جو گھروں سے ہیروئن بننے کی تمنا لے کر آتی ہیں مگر اپنا سب کچھ گنوا کر ایکسٹرا لڑکیوں میں بھی مشکل سے جگہ پاتی ہیں۔ اس دلچسپ ناول میں مشہور ادیب کرشن چندر نے فلمی دنیا کے سچے اور گھناؤنے حالات قلم بند کئے ہیں۔ قیمت: ۵ روپے ۹۵ نئے پیسے

ایک گدھے کی سرگزشت

ایک ایسے گدھے کی سرگزشت، جو بولنا، تقریر کرنا اور پڑھنا لکھنا جانتا تھا جس نے پنڈت نہرو سے ملاقات کی اور جس سے ایک کروڑ پتی کی حسین لڑکی شادی کرنے کو تیار ہو گئی، کرشن چندر کا ایک طنزیہ ناول؛ قیمت: ۳ روپے ۹۵ نئے پیسے

داماد

شوکت تھانوی قہقہے بکھیرنے میں مشہور ہیں۔ ایک دفعہ ان کی ایک کتاب پڑھتے پڑھتے ایک آدمی ہنستے ہنستے مر گیا اور یہ قتل کے الزام میں گرفتار ہوتے ہوتے بچے۔ ان ہی شوکت صاحب کا بے حد دلچسپ مزاحیہ ناول "داماد" قیمت: ۲ روپے ۹۵ نئے پیسے

بیگم صاحبہ

بیگم صاحبہ کا گھر خاصہ پریم نگر تھا، حویلی کے لڑکے کسی نہ کسی لڑکی کے لئے آنکھوں میں پیغام لئے پھرتے، اور لڑکیاں کسی نہ کسی لڑکے کو کن انکھیوں سے دیکھا کرتیں اور بیگم صاحبہ ان سب کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچاتیں۔ شوکت تھانوی کا قہقہوں بھرا ناول۔ قیمت: ۳ روپے ۹۵ نئے پیسے

دو پھول

بیلا نے لیش پال سے بے پناہ محبت کی، مگر جب لیش پال نے اسے ماں باپ کو چھوڑ کر بھاگ چلنے کو کہا تو وہ اپنے باپ کی عزت کے سامنے اپنی محبت کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ ان دو پھولوں پر آئی ہوئی بہاروں اور خزاؤں کی کہانی عادل رشید کا نیا ناول۔ قیمت: ۳ روپے ۹۵ نئے پیسے

ساحل

جب وہ جوان ہوئی تو اس نے اپنے کو مصائب کے سمندر میں گھرا ہوا پایا، اس سے محبت بھی کی گئی اور نفرت بھی لیکن وہ طوفان سے کھیلتی اور موجوں سے ٹکراتی ایک دن ساحل پر جا کھڑی ہوئی۔ عشرت رحمانی کا ایک انوکھا اور دل چسپ ناول۔ قیمت: ۳ روپے ۴۵ نئے پیسے

نیما جو بک گئی

فلمی دنیا کی جگمگاہٹ، شاندار بنگلوں اور چاندی کی چمک نے نیما اور اس کی ماں بہنوں کی آنکھوں کو چندھیا دیا اور نیما کو فلمی دلالوں کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ بمبئی کی فلمی دنیا اور اس کے دلالوں کے گھناؤنے کارناموں کی سچی تصویر شوکت ہاشمی کے قلم سے۔ قیمت: ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے

بے غیرت

ایک ایسی بے غیرت بہن کی کہانی، جو اپنے بھائی کے ہاتھوں کا کھلونا بنتے بنتے، اپنے کام میں طوائف سے بھی زیادہ ماہر ہو گئی۔ ایک ایسے بے غیرت سماج کی کہانی، جہاں ایک عورت کے حسن کے متوالے سرکاری افسر ایک دوسرے کے رقیب بن گئے۔ مضطر ہاشمی کا انوکھا ناول۔ ۴ روپے ۷۵ نئے پیسے

شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ۔ نئی دہلی

شمع بک ڈپو، شاہ عالم گیٹ۔ لاہور

صالحہ عابد حسین

سماج کی اصلاح خود کیجئے

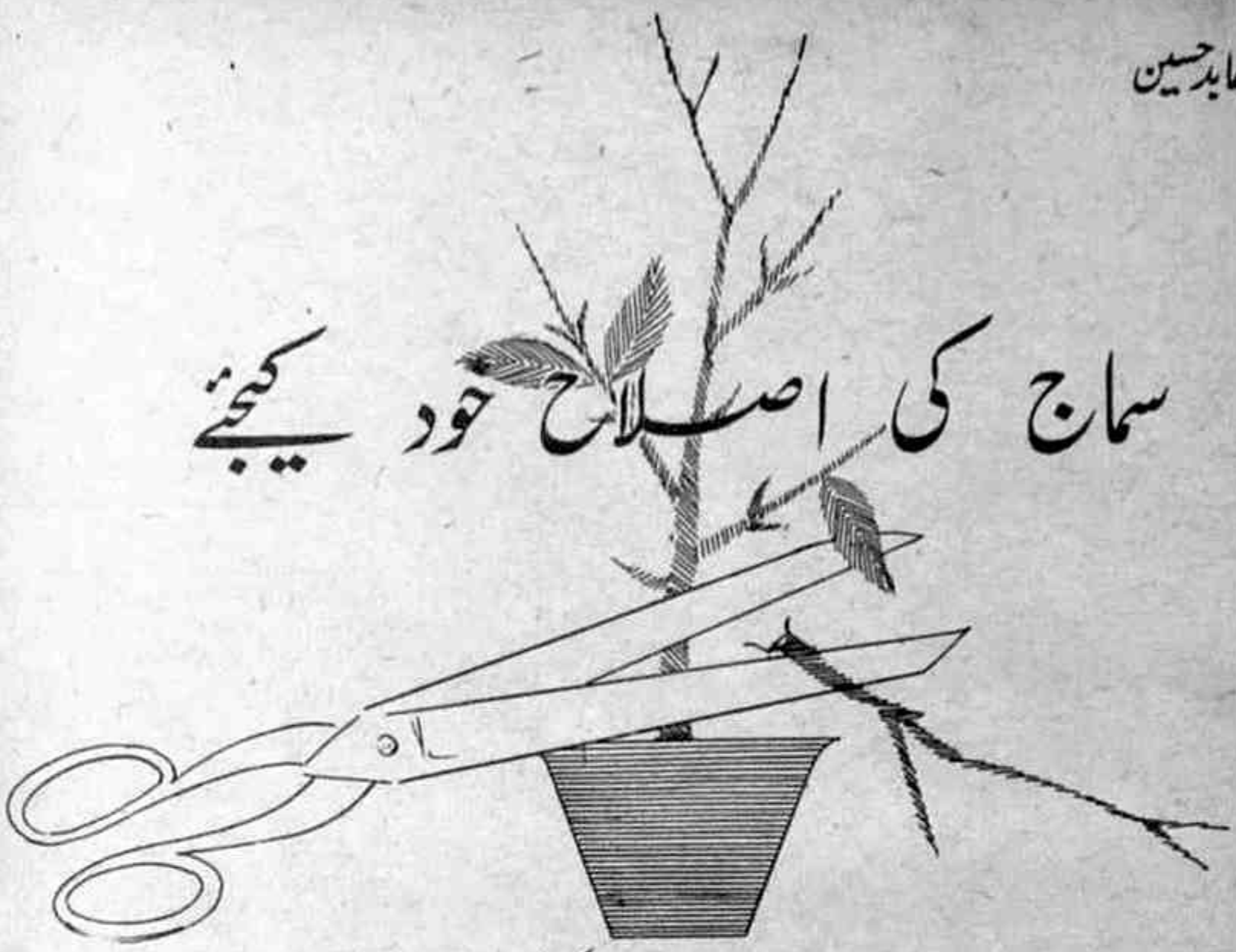

سرسیّد اور ان کے رفیقوں نے اب سے تقریباً پون صدی پہلے مذہبی اصلاح اور تعلیمی جد وجہد کا کام شروع کیا تھا۔ لیکن انہوں نے اسی پر بس نہ کی بلکہ ساتھ ہی ساتھ سماجی اصلاح کی تحریک بھی اٹھائی اور فضول اور نقصان دہ رسم و رواج کے خلاف مہم چلائی۔ سرسیّد، حالی اور ان کے ساتھیوں کے بعد خواجہ غلام الثقلین مرحوم اور ان کے ہم خیالوں نے اس تحریک کو اپنے ہاتھ میں لیا، تقریر و تحریر کے ساتھ ساتھ عملی طور پر بھی مذموم رسموں کو مٹانے اور فضول خرچیوں کو ختم کرنے کی ان تھک کوششیں کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک خاصے بڑے حلقے میں اصلاحِ معاشرت کی یہ تحریک مقبول ہوئی اور بہت سے رسوم میں، جنہوں نے اس وقت مذہبی ارکان کی سی اہمیت اور تقدس حاصل کر لیا تھا، ترمیم کی گئی تاکہ قوم کا وقت، ذہانت، پیسہ اور قابلیت کا ان فضولیات پر صرف بیجا نہ ہو۔

مگر کچھ عرصے بعد اصلاحی تحریکیں پس پشت پڑ گئیں اور سیاسی تحریک کی گرم بازاری ہو گئی۔ اگرچہ مہاتما گاندھی کے پیشِ نظر ہمیشہ سیاسی جد وجہد کے ساتھ ساتھ سماجی اصلاح کا مسئلہ بھی رہا انہوں نے اس میدان میں بڑی قابلِ قدر خدمات انجام دیں، لیکن متوسط طبقے، خاص کر مسلمانوں میں اصلاحِ معاشرت کی تحریک قریب قریب ختم ہو گئی اور اب تو یہ حال ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی آزادی حاصل کرنے کے بعد نہ اکابرین قوم کے لئے کچھ کرنے کو رہا ہے اور نہ معاشرے کو کسی خاص اصلاح کی ضرورت باقی ہے۔ حالانکہ حالت یہ ہے کہ ابھی ہمارے دیس کو غریبی، نابرابری، جہالت، بے روزگاری، جیسے سخت دشمنوں سے جنگ کر کے ملک میں ایک صحت مند سوشلسٹ سماج قائم کرنی ہے، اور اس کے لئے ساری قوم میں جد و جہد، قربانی اور جاں کاہی کی وہی اسپرٹ ہونی ضروری ہے جو سیاسی آزادی کی تحریک کے وقت بروے کار آئی تھی۔ اور ان بڑے اور اہم مسائل کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے مسئلے ہیں جن کے بارے میں صرف سوچنا ہی نہیں ان کو حل کرنے کی کوشش بھی کرنی ہے۔ سماجی اصلاح کا کام حکومت یا سیاسی پارٹیوں کا نہیں بلکہ خود ہمارا۔ ساری سماج کا۔ اسی کے ہر فرد کا ہے کہ سماجی اصلاح کا کام خود اپنے گھر سے شروع کرے اور اپنے حلقے، اپنے گاؤں، شہر جہاں تک بھی اُسے پھیلا سکتا ہے پھیلائے۔ کسی مسئلہ کو بھی حقیر یا جھوٹا سمجھ کر نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ان ہی چھوٹے چھوٹے مسئلوں کے تانے بانے سے ہمارا معاشرہ بُنا ہوا ہے۔ ان کی خرابی سارے معاشرے کو کمزور کرتی

ہے اور ان کی اصلاح سارے سماج کی بھلائی کا کام انجام دیتی ہے۔

لیکن سماج کی اصلاح یا دوسرے لفظوں میں رسم و رواج کی اصلاح کوئی آسان کام نہیں۔ مدتوں سے جو رسوم ہمارے ہاں رائج ہو گئے ہیں، ان کو ختم کرنا تو خیر محال ہے، ان میں ترمیم کرنا بھی کچھ کم مشکل نہیں اس کے نام ہی سے لوگ بھڑک جاتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ ہمیشہ مسرت کی تلاش میں سرگرداں رہتا اور ہنگاموں کو پسند کرتا ہے۔ سچی مسرت تو زندگی میں کبھی کبھار ہی نصیب ہوتی ہے۔ اس لئے اس نے اپنے کو بہلانے اور خوشی منانے کے طرح طرح کے ڈھنگ ایجاد کر لئے ہیں۔ تہواروں، میلوں ٹھیلوں، جلسوں اور جلوسوں، محفلوں اور شادیوں اور طرح طرح کی دوسری تقریبوں میں وہ اپنے اسی جذبہ کو تسکین دینے کی کوشش کرتا ہے، تاکہ اس وقتی جوش اور مسرت میں زندگی کے دکھ درد کو ذرا دیر بہلانے میں کامیاب ہو جائے۔ مگر ہوتا عام طور پر یہ ہے کہ ـــــ کم سے کم ہمارے دیس میں ـــــ کہ یہ خوشی بڑی مہنگی پڑتی ہے اور بعض وقت یہ وقتی مسرت بڑی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

اس وقت میں ایک بہت بڑے سماجی مسئلے کا ذکر کرنا چاہتی ہوں جو ہماری معاشرت میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور جس کی اصلاح کی ہماری گھریلو اور سماجی زندگی کی بہتری کے لئے اشد ضرورت ہے ـــــ یعنی شادی۔

شادی کے لفظی معنی ہی خوشی کے ہیں۔ ہمارے ہاں شادی بیاہ کے موقع پر جو چہل پہل، رونق، گہما گہمی اور مسرت نظر آتی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم دو انسانوں کی زندگی کے اس اہم موڑ کو کس قدر اہمیت دیتے ہیں۔

لیکن اگر ہم غور کریں تو پائیں گے کہ اس زمانے میں اس "شادی" سے بڑھ کر مصیبت شاید ہی کوئی اور ہو۔ جس تقریب کے خیال سے دلوں میں مسرت کی کلیاں کھلنی چاہئیں، اس کا تصور آج خوف و پریشانی کے کانٹے چبھونے لگتا ہے لیکن افسوس ہے کہ ہم نہ سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کرتے ہیں اور نہ اس کی اصلاح کی کوئی کوشش کرتے ہیں کسی کو خیال آیا بھی تو وہ یہ سوچ کر چپ ہو جاتا ہے کہ اکیلا چنا بھلا کب بھاڑ پھوڑ سکتا ہے؟ جب تک ساری سماج یہ طور طریقے نہ بدلے ہم کیسے نکو بن سکتے ہیں؟ لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ سماج کو بنانے اور بگاڑنے والے افراد ہی ہوتے ہیں اور ایک یا دو چار آدمیوں کی مثال رفتہ رفتہ پورے سماج پر اثر ڈال سکتی ہے۔

شادی کے مسئلے کے بھی کئی پہلو ہیں (۱) لڑکے یا لڑکی کی تلاش (۲) جہیز و بری اور تحائف (۳) شادی کے سلسلے کی مہمان داری اور دعوت وغیرہ۔

نمبر ایک اور دو پر پھر کبھی بحث کر لیں گے۔ اس وقت نمبر تین پر میں اپنے خیالات پیش کرنا چاہتی ہوں جو اگرچہ سب سے زیادہ پریشان کن ہے مگر سب سے زیادہ اسی کی اصلاح آسان ہے اس لئے کہ اس کا تعلق صرف آپ کی ذات اور ارادے سے ہے۔

ہمارے ہاں اتنی زیادہ تقریبیں ہوتی ہیں کہ شاید ہی کسی دوسرے ملک میں ہوتی ہوں اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ پہلے زمانے میں ہماری عورتوں کی ساری دلچسپیاں اور مصروفیتیں گھر تک محدود تھیں اور باہر کی زندگی میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا، اس لئے انہوں نے گھروں کے اندر ہی اپنی تفریح، دل چسپی اور رنگینی کا انتظام کر لیا۔ لاشعوری طور پر یہ خوف بھی ہوگا کہ مردان میں روکاوٹ نہ ڈالیں۔ اس لئے انہوں نے ان رسموں کو قریب قریب مذہبی اہمیت دے دی۔ اس زمانے میں ـــ علاوہ موسمی اور مذہبی تہواروں کے اور بھی بیسیوں قسم کی تقریبیں ہوتی تھیں۔ بچہ کی پیدائش کے پہلے سے جو سلسلہ شروع ہوتا تو چھٹی، مونڈن، ختنہ، کن چھیدن، بسم اللہ، سالگرہ، منگنی، بیاہ، چوتھی، چالے کے مراحل سے گزرتا کہیں سوئم، چہلم اور برسی پر جا کر ختم ہوتا تھا اور ان سب موقعوں پر مہینوں تقریب والے گھر میں مہمان داری چہل پہل، ہنگامہ اور دلچسپی رہتی، گانا بجانا، کھانا کھلانا، ہنسی دل لگی، اور چہلیں ہوتیں۔ جھگڑے لڑائیاں ہوتیں۔ سنگار و آرائش، نمود و نمائش کے سارے حوصلے نکالے جاتے سماجی مراحل بھی بڑی حد تک ان میں طے ہو جاتے۔ لڑکی کے لئے بر اور لڑکے کے لئے دلہن چن لی جاتی لڑکے لڑکیاں چوری چھپے ایک دوسرے کو دل دے بیٹھتے، ساس، بہو کے جھگڑے چکائے یا روتے روتے جاتے۔ غرض اس طرح عورتیں انہیں بے رنگ اور غیر مصروف زندگی میں مصروفیت، رنگینی اور روحانیت پیدا کر لیتیں۔

اگرچہ اس وقت بھی ان رسم پرستیوں کی وجہ سے صرف بے جا ہوتا اور پریشانیاں اٹھانی پڑتی تھیں لیکن پھر بھی اس وقت اتنی الجھنیں اور مشکلیں پیدا نہ ہوتی تھیں، جتنی آج ان کی بدولت ہو رہی ہیں۔ رسم و رواج تو ہر قوم اور ہر دیس میں ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ لیکن زمانہ کے ساتھ ساتھ، حالات کے مطابق ان میں ترمیم و تنسیخ و اصلاح کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر ہمارا زمانہ تو بہت ہی تیزی سے بدلا ہے۔ پندرہ بیس سال کے اندر اندر اتنا انقلاب ہوا جو عام طور پر سیکڑوں سال کی گردش میں رونما ہوتا ہے۔ لیکن جس تیزی سے زمانہ بدلا اس طرح ہم نہ بدل سکے۔ حالات کے پیش نظر ہمیں اپنے رہن سہن، رسم و رواج، اور زندگی کے معیاروں میں جو تبدیلی کرنی چاہئے تھی وہ ہم نہ کر پائے۔ یا یوں کہیں تو زیادہ صحیح ہوگا کہ ہم بدلے تو مگر عجب انداز سے۔ ہم نے پرانی رسموں کو بھی سینے سے لگائے رکھا اور نئے فیشن کے رواجوں کو بھی سمیٹ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دہری دہری مشکلوں کا سامنا ہمیں کرنا پڑ رہا ہے پہلے عورت کا دائرہ گھر تک محدود تھا اور مصروفیتیں بہت کم اس لئے وہ ان

تقریبوں پر وافر وقت اور پیسہ صرف کر سکتی تھی۔ آج اس زندگی کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا ہے۔ اس کی مصروفیتیں اور دلچسپیاں اب گھر کی چار دیواریوں تک محدود نہیں ہیں پکنکیں ہیں، پارٹیاں اور دعوتیں ہیں۔ تھیٹر، فلم، ڈرامے، جلسے اور جلوس ہیں۔ اور اسی قسم کی اور بہت سی دلچسپیاں۔ نیز گھر داری کے کاموں کے علاوہ اب اُسے اور بھی بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کو گھر پر یا اسکول و کالج میں پڑھانا ہوتا ہے۔ عورتوں میں سے بعض کو پڑھانا پڑتا ہے۔ بعض عورتیں اور محکموں میں ملازمتیں کرتی ہیں، یا ڈاکٹر، نرس وغیرہ کا کام کرتی ہیں کچھ پارٹ ٹائم کام بھی کرتی ہیں۔ بعض علمی اور ادبی خدمت انجام دیتی ہیں۔ کچھ سیاست میں حصہ لیتیں یا سوشل سروس کے کام دیکھتی ہیں۔ اس نئے دور میں عورت مشین کا ایک بے کار پرزہ نہیں بلکہ زندگی کی گاڑی کا ایک پہیہ ہے۔ خانہ داری کے فرائض بھی پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئے ہیں بہت سے نوکروں کا دور خدا کا شکر ہے کہ ختم ہو چکا۔ اب تو متوسط درجے کے گھرانوں میں ایک ملازم بھی مشکل ہی سے ہوتا ہے۔ اس صورت حال میں اگر تقریبوں کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہے یا کسی بھی تقریب میں ہفتوں پہلے مہمان داری شروع ہو جائے تو اس کے لئے وقت کہاں سے آئیگا ایک اور بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ پہلے قصبوں اور دیہاتوں ہی میں نہیں، شہروں میں بھی لوگوں کے پاس بڑے بڑے گھر ہوتے تھے۔ خاندان میں کچھ لوگ ایسے ہوتے تھے جن کا اس کے سوا کوئی کام ہی نہ ہوتا تھا کہ شادی بیاہ کا انتظام و اہتمام کریں (اور اسی طرح اپنے وجود کی اہمیت ثابت کریں) بہت سے ملازم پیر جا وغیرہ ہوتے تھے جو مہینوں پہلے ان موقعوں پر خدمت کے لئے جمع ہو جاتے تھے۔ چنانچہ خاندان میں پڑوس میں، قصبے میں کوئی شادی ہو تو گھر والے ہی نہیں دوسروں کے لئے بھی دلچسپی اور مصروفیت کا موقع فراہم کرتی تھی۔ یہ لوگ مدد بھی کرتے تھے اپنے گھر براتیوں اور مہمانوں کے لئے خالی کر دیتے، ہر کام میں ہاتھ بٹاتے اور خوب دعوتیں بھی اڑاتے آج یہ حال ہے کہ چھوٹے شہروں تک میں لوگوں کے پاس چھوٹے چھوٹے گھر ہیں (ان رئیسوں اور اعلیٰ سرکاری افسروں سے یہاں بحث نہیں جو اچھے خاصے محلوں میں رہتے ہیں، اور نہ یہ مضمون ان کے لئے ہے) جس میں اپنا اور اپنے بال بچوں کا گزارہ ہی مشکل سے ہوتا ہے۔ بڑے شہروں میں تو اکثر ایک ایک کمرے میں پورے پورے خاندان بسر کرتے ہیں۔ نوکر نہ ہونے کے برابر ہیں۔ محلے پڑوس والوں کے پاس خود ہی کافی جگہ نہیں، دوسروں کے لئے کیا خالی کریں گے۔ نہ انہیں اتنی فرصت ہے کہ آپ کی تقریب میں ہاتھ بٹائیں، اب بتایئے کہ پہلے جیسی شادی کیسے کریں گی آپ؟ اور پھر سب سے مشکل، سب سے اہم مسئلہ ہے پیسہ کا۔ ضروریات زندگی اتنی گراں ہو چکی ہیں کہ ان کا فراہم کرنا ہی محال ہے۔ فضولیات کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا؟ پہلے سستا سماں تھا۔ زمینداریاں باقی تھیں۔ بقول شخصے "دودھ اور شہد" کی نہریں بہتی تھیں (میں اس وقت اس مسئلے میں الجھنا نہیں چاہتی کہ یہ "نہریں" اسی لئے رواں تھیں کہ محنت کش کسانوں اور گوالوں کو دودھ کا گھونٹ اور گیہوں کا ایک نوالہ بھی میسر نہ ہوتا تھا ایک چھوٹا سا طبقہ ان کی خون پسینے کی کمائی پر قابض تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ صورت اب تیزی سے بدل رہی ہے) بہرحال صورت یہ ہے کہ سو دو سو ماہوار آمدنی والے کا ذکر نہیں، ہزار یا نسو والے کے لئے بھی مہینہ پورا کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اب بال بچوں کا پیٹ پالا جائے، ان کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ یا شادی اور دوسری تقریبوں میں فضول خرچی کر کے نام و نمود کی تمنا، نمائش پسندی اور رواج پسندی باقی رکھی جائے؟

ان حالات کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہم قدیم رسموں کو زیادہ سے زیادہ سادہ بناتے اور جدید زمانے کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے نئے فیشن کو بس اتنا ہی اپناتے جو ہماری معاشرت میں کھپ سکتے اور ہماری حیثیت جن کو آسانی سے سہار سکتی، لیکن ہو یہ رہا ہے کہ پہلے کی رسمیں بھی باقی ہیں اور نئے رواجوں نے بھی دخل پا لیا ہے۔ شادی میں دعوت بھی ہو اور ایٹ ہوم بھی، براتیوں کو کئی کئی دن ٹھیرایئے بھی اور مدارات کیجئے نئے زمانے کے مطابق، جہیز میں بھاری بھاری زیور، برتن اور قیمتی جوڑے بھی ہوں اور نئے فیشن کے دیگر لوازمات بھی۔ دراصل پیسے والے لوگ یہ بدعت شروع کرتے ہیں۔ حاجت مندوں کو دینے، قومی ضرورتوں پر خرچ کرنے اور مستحق طالب علموں کی مدد کرنے کے بجائے وہ ان تقریبوں کو دھوم دھام سے بنا کر اور نئے اور پرانے ہر قسم کے فضول خرچوں پر روپیہ صرف کر کے اپنی نمود و نمائش اور داد تحسین کی خواہش پوری کرتے ہیں اور ان کی دیکھا دیکھی متوسط درجے کے لوگ بھی وہی کرنے لگتے ہیں بغیر یہ سوچے کہ اس نقالی کا انجام ان کے لئے کس قدر خطرناک ہے۔

پھر پہلے کے دستوروں میں کچھ خرابیاں تھیں تو خوبیاں بھی تھیں۔ شادی میں عزیز اور دوست اگر پہلے سے آتے تھے تو اپنا گھر سمجھ کر رہتے تھے۔ ہر تکلیف کو خندہ پیشانی سے جھیل لیتے تھے۔ اس لئے کہ ایک کی بیٹی سب کی بیٹی اور ایک کی عزت سب کی عزت سمجھی جاتی تھی۔ ان کے لئے نہ ٹھیرنے کے لئے الگ الگ کمروں کی ضرورت تھی نہ بہت سے غسل خانوں کی۔ کہیں جگہ نہ ملی تو سب نے فرش پر بستر جما لیا۔ جو پکا وہ ہنسی خوشی کھا لیا۔ گھر کے ہر کام میں اس طرح ہاتھ بٹایا کہ گھر والی کا بوجھ بیچ بیچ ہلکا ہو گیا۔ لین دین میں بھی اس کا خیال رکھا جاتا کہ ایسی چیزیں دیں جس کی جہیز میں کمی رہ گئی ہے جو زیور کپڑا وغیرہ دینے پہلے سے ماں باپ سے پوچھ کر طے کر کے دیتے تھے۔ اس لئے کہ مقصود سہارا لگانا ہوتا تھا، نام اور نمائش کرنا نہیں۔ اور آج اس کے برعکس عام طور پر مہمانوں میں وہ رواداری اور جفاکشی رہی ہے نہ میزبانوں میں وہ سادگی پسندی اور اپنایت کا احساس۔

بہرحال وہ زمانہ تو اب واپس آ نہیں سکتا۔ اُس دور کی خوبیاں ختم ہو رہی

ہیں برائیاں بڑی حد تک باقی ہیں۔ لیکن اگر ہم غور کر کے، سمجھداری سے کام لے کر ایک منصوبے کے ماتحت اپنے ہاں کی تقریبوں کو اس طرح منانے لگیں کہ ان کی دلچسپی اور دل کشی باقی رہے اور مشکلیں اور پریشانیاں کم ہو جائیں، تو یہ کوئی ایسی ناممکن بات نہیں۔ ایسے اصول بنائیے کہ نہ میزبان کو زیادہ مصیبت، زحمت اور زیرباری اٹھانی پڑے نہ مہمان کو پریشانی اور الجھن۔

اس سے یہ مطلب نہ سمجھئے کہ میں چاہتا ہوں شادی کے موقع پر ہم اپنے عزیزوں کو پوچھیں نہیں، یا جشن و خوشی نہ منائیں۔ انسان اپنی فطرت کیسے بدل سکتا ہے، اور کیوں بدلے؟ یہی تقریبیں اور موقعے تو ہماری بے رنگ زندگی میں رنگ بھرتے ہیں۔ اگر کوئی آپ سے یہ کہے کہ اگر آپ کے پاس کافی پیسے نہیں ہیں تو چپ چپاتے بیٹی کے ہاتھ پیلے کر کے تین کپڑوں میں رخصت کر دیجئے تو مجھے یقین ہے کہ سو میں سے ایک بھی اس پر تیار نہ ہوگا۔ بلکہ الٹی صلواتیں سنائی جانے لگیں گی۔ مگر ٹھیرئیے صلواتیں تو آپ ہر حال میں دل بھر کر سنا سکتی ہیں، کیونکہ زبان بلا شرکت غیرے آپ کی ہے، لیکن برا بھلا کہنے کے بعد پھر ذرا ٹھنڈے دل سے اس پر بھی غور کر لیجئے گا کہ کہنے والی جو کہہ رہی ہے وہ کیوں کہہ رہی ہے؟ آیا اس کا اپنا کوئی اس سے بھلا ہوگا یا آپ کا؟ جو حل وہ اس مسئلے کا پیش کر رہی ہے وہ قابلِ قبول ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو آپ اس پر عمل کیوں نہ کریں؟

ان تقریبوں میں کچھ باتیں تو ہم اپنی خوشی سے کرتے ہیں۔ کچھ نقالی میں کچھ زبانِ خلق کے خوف سے اور کچھ نمود و نمائش، خود نمائی اور خود ستائی کے تحت، لیکن حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان گھٹیا جذبوں کو ٹھکرا کر بس اس انداز سے یہ جشن مسرت منائیں کہ چہل پہل، رنگینی اور کیف تو ضرور پیدا ہو مگر اس کا مقصد سچی مسرت کی تلاش اور محبت کے رشتوں کو استوار کرنا ہو۔ تجھ پر بار کر مونہہ لال کرنا نہیں۔

ہاں تو ــــ ممکن ہے اگلے مہینے، یا اگلے سال، آپ کے ہاں شادی کی تقریب ہونے والی ہے۔ لڑکی کی شادی ہے نا؟ یہی تو زیادہ کٹھن کام ہے۔ اچھا تو لائیے قلم اور کاغذ اور بنائیے بجٹ۔ پہلے یہ بتائیے کہ آپ اس تقریب سعید پر زیادہ سے زیادہ کیا خرچ کر سکتی ہیں۔ لیکن دیکھئے یہ خیال رہے کہ نہ آپ کو بنئے سے سود ہی قرض لینا ہے اور نہ گھر اور زمین گروی رکھ کر شادی کرنا ہے۔ یہی ایک بیٹی تو نہیں اور بھی تو بچے ہیں نا جن کی تعلیم، ضروریات، بیاہ شادی آپ کو کرنا ہوگا پھر خود آپ دونوں کا بڑھاپا سامنے ہے ــــ یہ نہ کیجئے کہ جو کچھ ملے، جہاں سے ملے جس قدر ملے بس اس شادی میں خرچ کر ڈالئے اور پھر خالی ہاتھ ہو کر پریشانیاں اٹھائیے۔

فرض کیجئے کہ آپ صرف ایک ہزار کا انتظام کر سکتی ہیں کچھ آپ کے پاس جمع ہے کچھ کسی ایسے دوست سے قرض لے سکتی ہیں جو سود نہ لے اور قسط وار آپ ادا کر دیں یا تنخواہ پر سرکاری دفتر یا پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ سے قرض لے لیجئے۔ ایسا ہی قرض جس کو آپ قسط وار ادا کر دیں (روپیہ کی کمی بیشی آپ کی حیثیت اور حالات پر بھی منحصر ہے) آپ نے کچھ نہ کچھ زیور کپڑا برتن لڑکی کے لئے پہلے سے جمع کر رکھا ہوگا۔ اب آپ سب سے پہلے یہ اندازہ لگائیے کہ اسی ایک ہزار میں سے کتنا روپیہ جہیز وغیرہ کی تکمیل میں خرچ ہوگا۔ یاد رکھئے اسی ہزار میں آپ کو اور بھی تمام اخراجات پورے کرنے ہیں اس لئے جہیز میں بھی یہ لحاظ رکھنا پڑے گا کہ صرف ضروری اور کارآمد چیزیں دیجئے جو آپ کی بچی کے کام آئیں۔ اب اگر آدھا یا دو تہائی اس مد میں نکل گیا تو آپ کو باقی روپے میں سے ہی سارا خرچہ پورا کرنا ہے۔ فرض کیجئے کہ چار یا پانچسو روپے آپ کے پاس اس مد میں بچ رہے ہیں۔ اب اگر اس میں باجے گاجے، روشنی اور سجاوٹ وغیرہ کی گنجائش نہیں، تو ذرا بھی جی برا نہ کیجئے۔ گھر کی آرائش پھول پتیوں سے ہو سکتی ہے۔ روشنی کے لئے اندر باہر چند بڑے بڑے بلب گھر کو روشن اور بارونق بنا دیں گے۔ سو ڈیڑھ سو روپے کی قلیل رقم میں سے اس پر خرچ کرنا گھر پھونک تماشا دیکھنا ہے باجے گاجے کی ایسی کیا ضرورت ہے؟ لڑکی کی سہیلیاں کیا کم ہیں۔ سریلے رس بھرے گانے گانے کو نہیں تو کسی دوست سے دو تین دن کے لئے گراموفون مانگ لیجئے۔

اب برات کا مسئلہ ہے۔ ہے تو سخت مسئلہ مگر اس میں آپ کو دبنا یا پریشان ہونا نہیں چاہئے۔ اوّل تو آپ سمدھیانے والوں پر یہ بات واضح کر دیجئے کہ آپ دو چار دن بارات نہیں ٹھیرائیں گی۔ شہر کی بارات ہے تو دن کے دن بیاہ کر لے جائیں، باہر کی ہے تو زیادہ سے زیادہ ایک رات ٹھیر سکتے ہیں۔ آدمی جتنے کم وہ لائیں گے آپ ہی کے لئے نہیں ان کے لئے بھی اچھا ہوگا۔ انہیں بھی تو براتیوں کا کرایہ دینا اور ان کے نخرے اٹھانے پڑتے ہیں۔ آپ کے شہر کی سیر کی ساری حسرتیں وہ اس وقت پوری نہ کریں تو وہ اچھا ہے یہ تو سمجھ داری اور احساس کی بات ہے کہ جب ہم کسی کے ہاں ایسی تقریب میں جائیں تو اس پر کم سے کم اپنا بار ڈالیں۔ یہ نہیں کہ ہماری سیر، شاپنگ وغیرہ کے لئے بھی وہ انتظام کرتا پھرے جب کہ اس پر پہلے ہی کاموں اور خرچوں کا بے پناہ بوجھ ہے۔

اس خیال کو اب دل سے دونوں فریقوں کو نکال دینا چاہئے کہ لڑکی ایک بوجھ ایک مصیبت ہے جو ایک اتار رہا ہے نہ وہ لونڈی خرید رہے آ رہے ہیں نہ آپ لونڈی دے رہی ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ آپ دولھا اور سمدھیانے والوں کے بے جا مطالبات اور نخرے سہیں۔ اس مبارک موقع پر دونوں فریقوں کو آپس میں شرافت اور انسانیت کا مظاہرہ کرنا اور دوسرے کو کم سے کم زیربار کرنا چاہئے۔ خود اعتمادی اور خودداری بڑی اعلیٰ نعمت ہے اور جب تک آپ کو خود اپنی ان صفات کا پاس نہ ہوگا دوسرے کیوں کریں گے؟

اب باقی رہی بڑی دعوت جس میں آپ دولھا اور براتیوں کے ساتھ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اندازہ لگایئے کہ کتنا روپیہ اس مد میں آپ صرف کر سکتے ہیں۔ اور یہ بھی سوچ لیجئے کہ قانونی طور پر کتنے لوگوں کو کھانا کھلانے کی اجازت ہے اور کتنا کھانے پینے کا سامان بغیر بلیک مارکٹ کے آپ کو مل سکتا ہے۔ بس اتنے ہی لوگوں کو آپ مدعو کیجئے ورنہ پھر ایک سادہ سا ایٹ ہوم (عصرانہ) کہیں زیادہ اچھا رہے گا۔ زیادہ سے زیادہ جتنے لوگوں کو بلا سکتے ہیں بلایئے کہ دولہا دلہن کو اشیرواد دیں اور ہنسی خوشی رخصت ہو جائیں۔ یقین کیجئے آنے والے بھی اس سے زیادہ خوش ہوں گے کیونکہ انہیں کم وقت صرف کرنا پڑے گا (مفت خوروں کا یہاں کوئی ذکر نہیں) مقصد تو آپ کا اور ان کا یہی ہے نا کہ ایک دوسرے کی خوشی میں شرکت کر کے اپنی محبت اور تعلقات کو استوار کریں وہ اس طرح بھی حاصل ہو سکتا ہے۔

مگر ابھی ایک اور مسئلہ باقی ہے ——— اور زیادہ سخت ہے یہ۔ یعنی قریبی عزیزوں اور جگری دوستوں کا جن کو اگر بہت دن پہلے سے نہ بلایا گیا تو وہ خفا ہو سکتے ہیں۔ آپ مجبور ہیں کہ انہیں لکھیں "تمہیں میری قسم جلد آؤ ——— بچی میری ہی نہیں تمہاری بھی تو ہے ——— وقت کے وقت غیروں کی طرح آئیں تو مجھے بڑا رنج ہوگا ———" حالانکہ دل میں آپ دعائیں مانگ رہی ہیں کہ خدا کرے وقت کے وقت ہی آئیں نہیں تو کہاں اتنے لوگوں کو ٹھیرائیں گی۔ ادھر جن کو بلا رہی ہیں ان کے پاس بھی وقت اور پیسے کی زیادتی شاید نہ ہو۔ لیکن وہ بھی یہی سوچتی ہیں پہلے سے نہ گئی تو شکایت ہوگی۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ سارے دور پرے کے عزیزوں کو یوں ہی بلانا اور ان کو یوں ہی مجبوراً آنا پڑتا ہے ورنہ کون باتیں سننے اور طعنے سہے۔

لیکن کیا ان سب عزیز از جان عزیزوں کا ہفتوں یا دنوں پہلے سے آ کر رہنا تعلقات کو بہتر بناتا ہے؟ حاشا و کلا نہیں آپ خود ہی دیکھ لیجئے گا۔ چھوٹا سا گھر اس پر چپہ چپہ پر آدمی، نہ رات کو ڈھنگ سے سونے کی جگہ، نہ دن میں نہانے دھونے اٹھنے بیٹھنے کی جگہ۔ نہ اپنی پسند کا کھانا ہے نہ بچوں کے شور و غل سے نجات ہے کوئی بیمار ہو جائے تو وقت پر دوا نہیں ملتی۔ ہزاروں شکایتیں ان مہمانوں کو پیدا ہوں گی۔ گھر والے اپنی جان لاکھ ہلکان کریں۔ مگر نہ اتنے لوگوں کے مطالبات پورے کر سکتے ہیں، نہ ان کے آرام کا پورا بندوبست ہی ہو سکتا ہے۔ صد حیف کہ آپ نے قرضہ میں بال بال بھی جکڑ بند کیا مصیبت بھی اٹھائی اور ہاتھ کیا آیا؟ وہی بدنامی۔ وہی شکایت وہی تعلقات کی خرابی، معاف کیجئے گا اتنی رواداری نہ آپ میں ہے نہ مجھ میں کہ دوسرے کے ہاں جا کر اس کی مشکلوں اور پریشانیوں کا پورا اندازہ کر سکیں۔

پھر کیوں نہ آپ ان سب کو بھی وقت کے وقت بلایئے۔ اگر کسی سے زیادہ محبت اور خصوصیت ہے تو وہ کسی اور موقع پر ظاہر کر دیجئے گا ——— خدا کے لئے شادی کے وقت اسے مع خاندان کے مدعو کرنے کے پہلے کے اچھے جی بھی برے نہ کیجئے۔ آپ پھر کہیں گی کہنا آسان ہے کرنا مشکل ہے۔ مگر ذرا جی کڑا کر کے تو دیکھئے ——— ان مشکلوں اور بدنامیوں سے کم ہی جھیلنی پڑیں گی جو اس بھاری مہمان داری کے معاوضے میں آپ کو ملیں گی۔ آپ یہ تقریب اپنی اور اپنے بچوں کی خوشی کی خاطر کر رہی ہیں، کسی اور کے لئے نہیں۔ دوسرے لوگ اگر خوشی سے شرکت کریں تو بہت اچھا ہے نہیں تو ان کی مرضی۔ آپ ان کو بدنامی کے خوف یا ظاہرداری کی خاطر نہ بلایئے بلکہ اس لئے کم بلایئے کہ آپ کی خوشی میں وہ بھی خوش ہو لیں، اور اس کے لئے چند گھنٹے کی شرکت کافی سے زیادہ ہے۔ اگر مہمان میزبان دونوں ہی اس نکتے کو سمجھ لیں تو یہ مسئلہ کتنی آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔ آج کا مہمان کل کا میزبان ہو سکتا ہے۔ جلد ہی ایسا موقع آئے گا کہ دوسرے آپ کے مہمان ہوں گے اور وہی سب طعنے اور اعتراض سننے اور مشکلیں آپ کو بھی جھیلنی پڑیں گی جو اس وقت آپ کی بے چاری بہن، یا ماں، یا بھاوج یا دوست جھیل رہی ہے۔ پھر آخر دوسروں کے ہاں زیادہ دن رہنے سے مہمان کو کیا کم تکلیف ہوتی ہے؟ اپنا گھر الگ تپلٹ ہوتا، بچے چھوڑ کر جاؤ تو مشکل، لے کر جاؤ تو مصیبت وہی بدنامی کا ڈر تو آپ کو بھی ہے تاکہ نہ گئیں تو مغرور، آرام طلب اور خود غرض سمجھی جائیں گی اور شکایت ہوگی کہ اتنا قریبی رشتہ ہوتے ہوئے بھی وقت کے وقت آئیں لیکن اگر آپ یہ بات سمجھ لیں کہ آپ کے جا کر رہنے سے بھی یہ شکایات کم نہ ہوں گی، تو مجھے یقین ہے کہ آپ کی خودداری اسے قبول نہ کرے گی کہ ایسے موقع پر جا کر گھر والوں پر بار بنیں۔ بلکہ میں تو کہوں گی اگر آپ اسی شہر میں رہتی ہیں تو شادی والے گھر میں جو بہت سے مہمان جمع ہوں ان میں سے دو چار کو اپنے ہاں رات کو سونے کیلئے لے آیئے۔ دیکھئے گا کہ لڑکی کی ماں اس سے زیادہ خوش ہوگی۔ بہ نسبت اس کے کہ آپ بھی ان میں اضافہ کرنے پہنچ جائیں۔ اوپری دل سے ظاہرداری کے طور پر محبت بھری شکایت شاید پھر بھی کی جائے۔ مگر دل میں وہ لوگ ضرور ممنون اور آپ کی سمجھداری کے قائل ہوں گے۔ پھر کبھی آپ اطمینان سے جا کر اپنی سہیلی یا عزیز کے ساتھ جا کر رہ سکتی ہیں اور اپنی محبت کا یقین دلا سکتی ہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ شادی کے وقت ہی ساری محبت چھٹ پڑے؟

مجھے یقین ہے کہ ان نمائش پرست اور مفت کے پیسے والوں کے سوا جو روپے کا مقصد ہی نمود و نمائش سمجھتے ہیں، قریب قریب میری ہر بہن جو اس مرحلے سے گزر چکی ہے یا گزرنے والی ہے کم و بیش میری ان تجویزوں سے متفق ہوگی۔ "بات تو خیر کچھ ٹھیک ہی ہے ——— اگر سب ایسا کرتے ہیں تو ہم بھی کر لیں گے ———" مگر بہن ہونے کیسے لگے؟ کسی کو تو پہل کرنی ہی ہے ——— تو پہل کرے گا، یہ میں جانتی ہوں

کہ اُسے اعتراض سننے پڑیں گے، یا باتیں بنائی جائیں گی ـــــ مگر آپ مجھے یہ بتلایئے کہ جو بہنیں بڑے بھاری بھاری جہیز دیتی ہیں، ہزاروں روپیہ آرائش اور دعوت اور نمائش پر صرف کرتی ہیں، بارات کو کئی کئی دن ٹھیراتی ہیں اور قرض میں اپنا بند بند باندھ کر اپنے دوسرے بچوں کا مستقبل قربان کرکے اپنے شوہر کو مصیبت میں گرفتار کرکے یہ تقریب انجام دیتی ہیں۔ کیا وہ اعتراضوں اور بدنامی سے بچ جاتی ہیں؟ نہیں ـــــ نہیں ـــــ ہرگز نہیں۔ توبہ کیجئے۔ ایسا ہونے لگے تو یہ زندگی جنت ہی نہ بن جائے۔ ان پر بھی ہزار طرح کے اعتراض ہوتے ہیں۔ یوں کنجوسی کا الزام لگے گا تو وہ نمود و نمائش پسندی، ظاہرداری کی صفات ان سے وابستہ کی جاتی ہیں۔ "اے ہے لوگوں سے تحفے وصول کرنے کے لئے یہ سب کیا گیا ہے" "بہن ہم نے تو کچھ بھی نہ کھایا۔ خرچ ہو گئے سو پچاس روپے" "بوا نام بڑا اور درشن چھوٹے ایسا خراب انتظام تھا کہ توبہ ہی بھلی" "بس ساری ٹیم ٹام دیکھنے ہی کی تھی دل تو ہمی نہیں" "اونہہ بیٹی کو دیا تو احسان کس پر کیا؟" "اے دیا ہی کیا ہے ـــــ ایک ہی بیٹی تھی۔ اس سے دگنا بھی دیتے تو کم تھا ـــــ" غرض جتنے مونہہ اتنی ہی باتیں ہونگی ممکن ہے دو چار آدمی تعریف بھی کر دیں۔ مگر انشاء اللہ اکثریت اعتراض اور شکایت کرنے والوں ہی کی ہوگی ـــــ پھر جب اس طرف سے پورا اطمینان ہے کہ بدنامی تو ہر حال میں آپ کا مقدر ہو چکی ہے تو کیوں پرائی بدشگونی میں اپنی ناک نہیں بلکہ زندگی کا سکھ چین خطرے میں ڈالا جائے اور اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرکے برسوں کے لئے پریشانی اٹھائی جائے؟

مگر ـــــ پہل کون کرے؟ جی پہل آپ کیجئے ـــــ آپ جو اس مضمون کو پڑھ رہی ہیں۔ چاہے تمسخر کے انداز سے چاہے لکھنے والی پر اعتراض کرکے چاہے اُسے بے وقوف سمجھ کر ـــــ مگر پہل آپ ہی کو کرنی ہے ـــــ آج نہیں تو کل ـــــ یہ کرنا پڑے گا ضرور۔ اس لئے کیوں نہ ابھی سے یہ تہیہ کر لیجئے کہ اب کی بار جو شادی کی تقریب آپ کے خاندان میں ہوگی تو آپ میری تجویزوں کو آزما کر اپنے مالی حالات کے پیش نظر خرچ میں کمی پیش کرکے دیکھیں گی لوگ ضرور باتیں بنائینگے گمراہ میں سے دو ایک آپ کی تقلید کرنے والے بھی نکل آئیں گے۔ جو نہیں کریں گے وہ بھی اس دن کے انتظار میں رہیں گے جب یہ رواج عام ہو جائے گا اور شادی کی تقریب مصیبت یا زحمت نہ بنا کرے گی اور پھر رفتہ رفتہ اس طرح رسم و رواج میں مناسب ترمیم و اصلاح کی صورت نکل آئے گی۔ یہی طریقے رائج اور مقبول ہو جائیں گے یوں ہی چراغ سے چراغ جلا کرتا ہے۔ اچھی مثال کا اثر لوگ قبول ضرور کرتے ہیں چاہے دیر میں کریں اور دیر تو وقت کا بڑا اہم مسئلہ ہے۔

کہئے ہے آپ میں جرأت؟

اچھی بیوی

عورت اپنے گھر کی ملکہ ہوا کرتی ہے۔ بہت سے بگڑے ہوئے گھر جن میں بدنظمی بے برکتی اور اختلاف و انتشار کی خاک اڑا کرتی تھی، جب وہ گھر سلیقہ شعار بیوی کے انتظام میں آیا تو اس نے اس کی چمن بندی کی قسم قسم کے بیل بوٹے اگائے یہ کیوں اور کیسے ہوا؟

یہ اس لئے اور اس طرح ہوا کہ ہماری کتاب "اچھی بیوی" نے عورتوں میں گھریلو زندگی سنوارنے کی ایک روح پھونک دی ہے۔ ایک گھر میں جب ایک عورت یہ کتاب پڑھ کر سنورتی ہے تو محلہ کی عورتوں میں بھی یہ رنگ پھیلنے لگتا ہے اور ایک چراغ سے ہزاروں چراغ روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔

قیمت ایک روپیہ پچیس نئے پیسے

اچھا خاوند

خاوند بیوی کا سرتاج ہے اس کے رنج و راحت پر تقدیر کا قلم چلتا ہے مگر اس کی عظمت کے عین مطابق اس پر بڑی بڑی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو نظر انداز کرکے کوئی خاوند اچھا خاوند نہیں بن سکتا۔ خاوند کے اخلاق و عادات، عقائد و اعمال اور طرز معاشرت وغیرہ قرآن و حدیث میں کھول کھول کر بیان کئے گئے ہیں۔

اس کتاب میں خاوند کو اس انداز سے تربیت دی گئی ہے کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی میں اس کتاب سے مدد لے کر بہار خلد کا لطف حاصل کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ پچیس نئے پیسے

بانو بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی

ہم نے بھی نوکر رکھا

جہاں آرا

آخر بڑی امیدوں اور مرادوں کے بعد ہم نے بھی نوکر رکھ لیا۔ نوکر رکھنے اور اُسے برداشت کرنے کی ہمت تو نہ پڑتی تھی لیکن کیا بھی کیا جاتا "اُن" کے دفتر جانے کا وقت ہوتے ہی بچوں کے اسکول کے الارم شروع ہو جاتے ادھر میرے اپنے اسکول جانے کی گھنٹی قریب آنے لگتی اور وہ کہرام مچتا کہ خدا کی پناہ۔

آخر انہوں نے سوچا کہ اس قدر "مار دھاڑ" اور پریشانی کا تو بس ایک ہی علاج ہے کہ ایک سستا سا نوکر یعنی کوئی پہاڑی چھوکرا یا دیہاتی "منڈو" رکھ لیا جائے۔ حساب کتاب کیا تو اُس پر کل خرچ کوئی تیس روپیہ ماہوار ہونے کی امید تھی۔ یہ بولے یہ خرچ تو کوئی بہت بڑا نہیں۔ نئے سال کی سالانہ ترقی کے ساتھ ہی کچھ اور ملا کر آسانی سے پورا ہو جائے گا۔ میں نے بھی بہت سوچا کہ آخر کب ضرورت ہے اس خرچ کی، لیکن بعد میں میرے من کا پانسہ بھی نوکر ہی کے حق میں پڑا۔

اب نوکر کی تلاش شروع ہوئی۔ حلوائی کو بتایا گیا کہ کوئی لونڈا نوکری کی تلاش میں گھومتا پھرتا آئے تو بھیج دیا جائے۔ ساتھ والوں کے چھوکرے کو کہا گیا کہ اگر اُس کی "نگاہ میں کوئی لڑکا ہو تو وہ بتا دے"، اسی طرح جو آیا اسی سے ایک نوکر ـــــ جو اچھا، سستا اور ایماندار ہو ـــــ کی فرمائش کی گئی۔

جہاں گئے یہی سنا "بہن آج کل تو نوکر ملتے ہی کہاں ہیں۔ سب کے سب بس صاحب بنے پھرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اگر کوئی گھومتا پھرتا مل گیا تو ضرور بھیج دیا جائے گا"

نوکر کو آتے تو خیر دیر لگی لیکن بچوں نے اسی اُمید میں جوتوں پر پالش کرنا چھوڑ دیا۔ یہ صبح دودھ لینے جاتے تھے۔ لیکن اب سوچنے لگے کہ جلد ہی اس عذاب سے چھٹکارا مل جائے گا اور وہ دیر تک بستر میں لیٹیں گے اور اس وقت تک آنکھ نہیں کھولیں گے جب تک کہ نوکر ایک گرم گرم پیالہ "بیڈ ٹی" کا لے کر انہیں جگانے کے لئے نہ کھڑا ہو۔

باورچی خانے کے ایک کونے میں اُس کے رہنے کے لئے بھی اچھی خاصی جگہ بنوا دی گئی ـــــ اور بس اب ایک نوکر ہی کا انتظار تھا۔ باقی گھر کی ہر ایک چیز جنت بننے کے لئے مکمل تھی۔

آخر ایک روز خوابوں کا یہ شہزادہ بھی آ گیا۔ حلوائی نے خبر دی کہ ایک لڑکا اُس کی نگاہ میں ہے جس نے ابھی ابھی کسی انجینیر کے گھر سے نوکری چھوڑی ہے۔ تنخواہ ذرا کڑی ہے لیکن لڑکا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً

اُس کے لائے جانے کا حکم دے دیا۔ اگلے روز وہ آن ہی پہونچا۔ پتہ چلا کہ کوئی بیس بائیس سال کا پہاڑی سا لڑکا ہے۔ ایک ایسی زبان میں ہندی بولتا ہے جو ہماری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس طرح بات کرتا ہے جیسے ہم نے اُسے نہیں بلکہ اُس نے ہمیں نوکر رکھا ہے اور اس طرح سے گھور گھور کر ہمیں دیکھتا ہے کہ گویا ہم پر یہ احسان اُسے کرنا چاہئے یا نہیں۔

لیکن "انہوں" نے سوچا کہ نیا نیا اجڈ سا لڑکا ہے اگر اس طرح باتیں کرتا ہے تو کیا ہوا۔ اکثر اجڈ اور اکھر لوگ دل کے نیک اور کام کے ستھرے ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے اُس نے جو کچھ کیا انہوں نے منظور کر لیا۔ نوکر رکھنے کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ اُس نے دھیرے دھیرے کر کے سب ذیل کی شرطیں منوالی تھیں:

۱۔ تنخواہ پچیس روپے ماہوار ہوگی، لیکن آیندہ چھ مہینوں میں تیس روپے تک ہو جائے گی۔ گرمیوں کے کپڑے جاڑوں ہی میں اور جاڑوں کے کپڑے گرمیوں ہی میں بنوا کر دینے ہوں گے۔

۲۔ تنخواہ کے علاوہ ایک آنہ یا دو آنے روزانہ جتنی بھی ہم میں ہمت ہو نوکر صاحب کو بطور بخشش سگرٹ بیڑی کے لئے دینے ہوں گے۔

۳۔ اگر کوئی چھوٹی موٹی چیز چوری ہو جائے یا کچھ ٹوٹ جائے تو نوکر اس کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔

۴۔ کھانے میں ناشتہ دوپہر اور رات کے کھانے اور چائے کے علاوہ نوکر کے دوستوں کا کبھی کبھار کھانا بھی شامل ہوگا۔

۵۔ اتوار کو نوکر کی چھٹی ہوگی۔ اس کے علاوہ وہ صبح آٹھ بجے سے لے کر ایک بجے دوپہر اور شام کے چار بجے سے لے کر آٹھ بجے ہی تک کام کرے گا۔ ورنہ پھر "اوور ٹائم" دینا ہوگا۔

۶۔ کپڑے دھونا، بوٹ پالش کرنا اور جھاڑو دینا نوکر کے فرائض میں شامل نہیں ہوگا۔ کیوں کہ بقول اس کے "کوئی انسان ایسے نیچ کام نہیں کر سکتا"

ظاہر ہے کہ ان شرطوں کے منظور ہوتے ہی ان کا یہ خواب کہ وہ صبح سوتے ہی رہیں گے خاک میں مل گیا۔ اسی طرح بچوں کی یہ خواہش کہ انہیں صبح اپنے جوتے پالش کرنے سے نجات مل جائے گی ہنسی مذاق ہی میں تحلیل ہو کر رہ گئی۔

لیکن ان شرطوں کے بعد بھی ہم نے اُسے قبول کر لیا۔ شاید اس کی پہلی وجہ تو یہی تھی کہ نوکر کے بغیر ہم گھر کی شوبھا مکمل نہیں سمجھتے تھے اور دوسری یہ کہ ان کا خیال تھا کہ اور نہیں تو کم از کم نوکر کی بدولت میرے ہاتھوں کو تو کچھ سکون مل ہی جائے گا۔ بہرحال جو بھی سوچا ہو اسے دہرانے کی ضرورت نہیں کیوں کہ نوکر صاحب کی اپنی کارکردگی کے سامنے یہ تمام اُمیدیں اور خواہشیں ماند پڑ گئیں۔

باورچی خانے میں آتے ہی اُس نے ناک مونہہ سکوڑ کر چولہے کے بجائے انگیٹھی لائے جانے کا مطالبہ کر دیا۔ اگلی ہی شام وہ مطالبہ بھی پورا ہوا۔ گھر میں جتنے مسالے تھے وہ نوکر کے لئے ناکافی ثابت ہوئے۔ اس لئے ایک نئی اور طویل فہرست کے مطابق نئے مسالے آئے۔ ہم یہ سب کچھ برداشت کرتے گئے کیوں کہ "اُن" کا کہنا ہی تھا کہ نوکروں کے طور نرالے ہوتے ہیں اور سب ہی کہتے ہیں کہ کچھ حد تک تو اُن کے ناز غرے برداشت کرنا ہی پڑتے ہیں۔

بہرحال بڑی اُمنگوں اور اُمیدوں سے شام کے کھانے کے لئے دسترخوان بچھا۔ کھانے کے لئے وقت چونکہ کم تھا (محض پانچ گھنٹے) اس لئے محض تین چیزوں ایک سالن ایک دال اور چاول پر اکتفا کی گئی۔ دال اور چاول آئے تو یہ پہچاننا ہی مشکل ہو گیا کہ ان میں دال کونسی ہے اور چاول کونسے۔ اس لئے کہ جو چیز زرد تھی اور دال لگتی تھی وہ کچھ سوکھی سوکھی اور کھڑی کھڑی دکھائی دیتی تھی اور جو چیز سفید تھی اور چاول معلوم ہوتی تھی وہ کچھ اس طرح بے اختیار ہو کر بہے جا رہی تھی کہ دال بھی دیکھے تو شرما جائے۔ پوچھا گیا تو جواب ملا کہ "پسند پسند اور فیشن فیشن کی بات ہے۔ کہیں پر ایسے کھایا جاتا ہے اور کہیں پر ویسے"۔ کھانے کے معاملے میں نئے فیشن سے ناواقفیت کا علم ہونے پر ہم سب ہی چپ کے رہے، لیکن بڑے لڑکے نے جب سالن کو چھوا تو پتہ چلا، کہ اُس میں گوشت کے علاوہ کچھ دوسرے لوازمات بھی شامل تھے جن کا رواج کم از کم کسی اور گھر میں تو ہم نے نہیں دیکھا لیکن نوکر سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ ردی کاغذ کے چھوٹے موٹے ٹکڑے اس کے بال اور معمولی سے پتھر کنکر کا سالن میں شامل ہونا کوئی ایسی بات نہیں جس پر بہت زیادہ پریشانی کی ضرورت محسوس ہو ہاں البتہ ایک چیز جس کی زیادتی سالن میں بالکل نہ تھی وہ تھا گوشت۔ پتہ چلا کہ پورا آدھ سیر گوشت یا تو شوربے میں گھل مل گیا ہے اور یا جو باقی ہے وہ نوکر کے اپنے کھانے کے لئے ضروری ہے۔

ظاہر ہے کہ ہم لوگ امور باورچی خانہ میں اس قدر جدت پسندی اور نئے فیشن کے قائل ابھی نہیں ہوئے تھے، اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ جب تک نوکر کو ہمارے پرانے فیشن سمجھ میں نہیں آتے کھانا میں خود پکاؤں۔ ہاں نوکر بازار سے سودا سلف ضرور لا سکتا ہے یہ کام اس نے بخوشی اپنے ذمہ لے لیا۔ لیکن پہلے ہی روز اس کی خرید پر ہماری معلومات میں حسب ذیل اضافہ ہوا۔

۱۔ آج کل قصاب جو بکرے خرید کر لاتے ہیں ان میں محض پسلیاں اور گردن (بغیر کسی قسم کے گوشت کے) اور زیادہ انتڑیاں ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ باقی تمام اجزاء آج کل بکروں میں ہوتے ہی نہیں۔

۲۔ تقریباً تمام اشیا یک دم بھاری ہونی شروع ہو گئی ہیں۔ اس لئے سیر بھر گوبھی آدھا سیر اور پاؤ بھر لہسن ایک چھٹانک معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ چین نے ہندوستان پر جنگ کردی ہے اس لئے دوکانداروں نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر نوکر چیز خریدنے جائیں تو ان سے چیزوں کی دگنی قیمت وصول کی جائے۔

۴۔ دوکاندار آج کل سودا بیچنے میں نہیں بلکہ تاش کھیلنے یا حقہ پینے میں مصروف رہتے ہیں۔ اس لئے جو سودا سلف دس منٹوں میں خریدا جاسکتا ہے اس پر نوکروں کو ڈھائی اور تین گھنٹے صرف کرنا پڑتے ہیں۔

یہ انکشافات بھی ہمارے لئے اس درجہ تباہ کن ثابت ہوئے کہ اگلے روز بچوں کے ابا ہی نے دفتر جانے سے پہلے بازار جاکر سودا لانے کا دھندا شروع کردیا۔ نوکر کو اپنے فرائض کا اس قدر احساس تھا کہ اسے پہلے تو یہ بہت ناگوار گذرا کہ اس کے فرائض کوئی دوسرا سرانجام دے لیکن بعد میں اُس نے اس شرط پر رضامندی ظاہر کردی کہ اس کے بجائے اُسے اور کوئی کام کرنے کو نہیں کہا جائے گا۔

کھانا پکانے کا کام دوبارہ ہاتھ میں لینے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اگر برتنوں کی صفائی نوکر کے ذمے ہوتی ہے تو ایک خاص فائدہ یہ ہوتا ہے کہ نئے سالن کے لئے دیگچی میں دوبارہ گھی وغیرہ ڈالنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی، کیوں کہ ساری صفائی کے بعد بھی پہلے سالن (بشرطیکہ بہت عمدہ نہ بنا ہو یا نوکر کا کوئی ساتھی کھانے پر موجود نہ ہو) گھی کی مقدار دیگچی میں موجود رہتی ہے کہ اُس کی چکنائی نیا سالن بنانے کے لئے کام میں لائی جاسکتی ہے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ برتنوں کے لئے اس طریقہ صفائی کا ایک مزید فائدہ یہ ہوتا ہے کہ برتن نہ گھستے ہیں اور نہ ہی خراب ہوتے ہیں۔ لہٰذا اپنی پرانی بوا کو بلایا اور کہا لو بڑی بی اب برتن بھی تمہیں صاف کیا کردیں کہ ہمارے نئے نوکر کو ہماری صحت کے بجائے ہمارے برتنوں کی عمر کا کچھ زیادہ ہی خیال ہے۔

بس برتنوں ہی کی صفائی کی بات ذرا جدا تھی ورنہ باورچی خانہ میں جو کچھ بھی تھا وہ صاف تھا۔ مثلاً گھی آٹے دال اور نمک مرچ سے لے کر چھوٹی موٹی رکابیوں اور چمچوں وغیرہ تک کئی چیزیں سرے ہی سے صاف تھیں۔ یوں گھر کی صفائی کچھ اتنی صفائی اور مہارت کے ساتھ کی جاتی کہ پتہ ہی نہ چلتا کہ گھر صاف ہوا بھی ہے یا نہیں۔ جب یہ حالت دیکھی تو یہ کام بھی پہلے جس کا تھا اسی کے حوالے کردیا گیا۔

گویا نوکر گھر میں اب بھی موجود ہے لیکن اس کا کام محض یہ ہے کہ چار وقت کھانا کھائے، ایک یا دو وقت وہ کھانا دوستوں کو بھی کھلائے اور گھر میں اگر کبھی کئی دونی پڑی دیکھے یا سگرٹ کی ڈبیاں ہی پڑی نظر آجائے تو اُسے اٹھالے۔ ہمارے ہاں چونکہ اب نوکر کو گھر کی سٹو بھا نہیں سمجھا جاتا اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی ان خدمات کے بغیر بھی ہماری گذر ہوسکتی ہے۔ ہاں اگر کسی بہن کو نوکر واقعی نہ ملتا ہو تو وہ بانو کی معرفت مجھ سے رجوع کرسکتی ہیں تاکہ نوکر اُن کے حوالے کرکے اُن کی اور اپنی مشکل کشائی کردی جائے۔

●●

شاہدہ

بیتے دنوں کی یاد، ایک دھوپ جو آفتاب کے ساتھ چلی گئی اور اس وطن کی کہانی جو مصنف انتصار حسین کے لئے اب دیارِ غیر ہے فرحت اللہ پور کے ایک اعلیٰ خاندان کے حالات کس طرح بدلے تعلیم کا چرچا ہوا ـــــ انجمن آبادار از دار بنی، بہورانی لکھنؤ سے آئیں اور شاہدہ نے کہا یہ تمہاری ہم وطن ہیں۔ لکھنؤ سے اس قصبہ میں بیاہ کر لائی گئی ہیں۔ اور بہورانی نے خود بھی کہا

جس کو فلک نے لُوٹ کے ویران کردیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

خوبی یہ کہ پورے ناول کی دلچسپی آخر تک قائم رہتی ہے۔

قیمت تین روپے

خوفناک محبّت

مولانا عبدالحلیم شرر کا ایک اسلامی معاشرتی ناول جس میں ایک شریف گھرانے کے معاشرے میں انقلاب برپا ہونے کی عبرت آموز داستان اور حق بحق دار رسید کی مونہہ بولتی تصویر ہے۔ نعیمہ ایک پاک دامن لڑکی جو شوہر کی زبردستی سے نامحرموں کے سامنے آتو گئی مگر جس کی شرم و حیا کو بٹہ لگ گیا۔ پورا ناول انتہائی دلچسپ اور عبرت آموز ہے۔

قیمت صرف تین روپے

رہنمائے گرہست (باتصویر)

خاوند بیوی کے تعلقات پر ایک ایسی تصنیف جس کی آج ہر گھر میں ضرورت ہے اب تک جنسیات کے موضوع پر درجنوں کتب شائع ہوچکی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ 'رہنمائے گرہست' ان سب کی سرتاج ہے۔ سوا چار سو صفحات پر پھیلی ہوئی گرہست کی زندگی سے متعلق تمام باتیں جن کا جاننا ہر مرد اور عورت کے لئے ضروری ہے۔ قیمت ۴ روپے

بانو بک ڈپو آصف علی روڈ نئی دہلی

اندھیری راتیں

جوان عمر، خوبصورت چہرہ اور ایک سڈول جسم۔ ان کے سہارے ایک معمولی کلرک لڑکی اونچی سوسائٹی اور زیادہ سے زیادہ عیش و عشرت کے سامان پا سکتی ہے۔ یہ ایک ایسی ہی لڑکی کی کہانی ہے، جسے ریوتی سرن شرما نے ناول کے رُوپ میں پیش کیا ہے۔
قیمت ۳ روپے ۹۵ نئے پیسے

ہزار راتیں

ایک ایسی ہیروئن کی کہانی جو دن کو اچھوت اور رات کی تاریکی میں پاکیزگی کا مدفن تھی۔ دن کو قانون نے اس کا پیچھا کیا، لیکن رات کو اسی قانون نے اس کو پناہ دی۔ پیٹ اور جسم کی پکار نے اس کو نفرت اور زہر کا، کالا بیوپار کرنے پر مجبور کر دیا، ش، مظفر پوری کا ایک دل چسپ اور پُراسرار ناول۔ قیمت ۴ روپے ۵۰ نئے پیسے

گھائل

جب کسی دوشیزہ کے دل کی دھڑکنیں بڑھ جاتی ہیں، جب محبت کی حدت سے تپتے دل کسی کو چاہنے لگتے ہیں۔ اُس وقت دل جو چاہتا ہے وہ اس سے چھین لیا جاتا ہے، دل کے ٹکڑے کر دیئے جاتے ہیں، ارمانوں کو کچل دیا جاتا ہے۔ کرشن گوپال عابد کے قلم سے ایک اچھوتا ناول۔ قیمت ۳ روپے ۹۵ نئے پیسے

جلن

آپ نے کبھی مجبور جوانی کی دبی ہوئی سسکیاں سُنی ہیں، کبھی آپ نے کسی دوشیزہ کے دل کی دھڑکنوں کا احساس کیا ہے؟ یہ ایک ایسے مرد کی داستان ہے جسے محبت کے جرم کے عوض جلنے کا عتاب ملا۔ کرشن گوپال عابد کا ایک اور دل چسپ ناول۔
قیمت ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے

فریبِ مُسلسل

یہ ایک عورت کا فریب نہیں، ایک مرد کی وفا کی داستان ہے جس نے ہر عورت کو ایک نیا فریب دے کر اپنے سنہری جال میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مقید کر لیا۔ شفیق بانو کے لکھے ہوئے ایک ہی موضوع پر بے حد دل چسپ افسانے۔ قیمت ۲ روپے

گُناہ

کیا یہ گناہ ہے، اگر کسی شادی شدہ عورت کو اس کے خاوند کی موجودگی میں جنسی ہوس کا شکار کر لیں۔ ناول گناہ کی کہانی اسی محور کے گرد گھومتی ہے، جس میں ایک امیر آوارہ نوجوان کی ایک شادی شدہ لڑکی سے محبت دکھائی گئی ہے۔ قیمت ۲ روپے ۹۵ نئے پیسے

چوٹ

ایک ایسے نوجوان کی کہانی جس نے ایک عورت سے والہانہ محبت کی، مگر وہ نوجوان کو منجدھار میں چھوڑ کر چلی گئی۔ سماج کے گھناؤنے مکر و فریب کی ننگی تصویر دیکھنی ہو تو ناول چوٹ پڑھئے۔ قیمت ۳ روپے ۷۵ نئے پیسے

چڑیوں کی الف لیلہ

"ایک گدھے کی سرگزشت" اور "باون پتے" کے مصنف کرشن چندر نے چڑیوں، بندروں، مچھلیوں اور پرندوں کی مزے دار کہانیوں کے بھیس میں سماج اور سوسائٹی پر بھرپور طنز کی ہے۔ قیمت مکمل چار حصے ۳ روپے

شمع بک ڈپو آصف علی روڈ۔ نئی دہلی

عادل رشید

دو کہانیاں

میرے ایک دوست ہیں ——— نام ——— !اچھا فرض کر لیجئے ان کا نام ساجد ہے۔ تو جناب یہ ساجد صاحب ایک لڑکی سے بڑی محبت کرتے تھے۔ محبت بھی سچ مچ کی محبت تھی۔ اور یہ اس لڑکی کے لئے ماہی بے آب کی طرح تڑپتے تھے۔ اور اس لڑکی کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ بھی بغیر ساجد کے جینا حرام سمجھتی تھی۔ دونوں شدید قسم کی محبت میں گرفتار تھے۔ اور اس لڑکی کے بڑے بھائی کو جو کہ ساجد کے بھی دوست تھے اس بات کی نہ جانے کیوں یہ ضد پیدا ہو گئی تھی کہ وہ ان دونوں کو کبھی ایک نہ ہونے دیں گے۔

لہٰذا اس محبت میں لعن طعن شروع ہو گئی۔ اور لڑکی کے بھائی نے زبردستی اپنی بہن کی شادی کسی اور جگہ طے کر دی۔ یہ جانتے ہوئے کہ اُن کی یہ غریب بہن ساجد سے دیوانہ وار محبت کرتی ہے وہ ان کی محبت کے آڑے آ گئے اور پھر آپ جانتی ہیں کہ کیا ہوا؟

لڑکی سے ساجد کی ایک خفیہ ملاقات ہوئی اور ساجد نے اُسے یہ صلاح دی کہ وہ اس کے ساتھ فرار ہو جائے اور اسی میں ان دونوں کی بھلائی ہے۔ مگر آپ جانتی ہیں کہ کیا ہوا؟

اس شریف باپ کی شریف بیٹی نے اپنے محبوب سے یہ صاف کہہ دیا کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ کر اپنے خاندان کو رسوا اور بدنام کرنا نہیں چاہتی۔ اس نے ساجد سے صاف صاف کہہ دیا۔

"دیکھئے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز مجھے آپ ہیں۔ اپنی زندگی سے بھی زیادہ میں آپ کو عزیز سمجھتی ہوں۔ مگر آپ سے اور آپ کی محبت سے زیادہ جو چیز مجھے عزیز ہے وہ ہے میرے ماں باپ اور میرے خاندان کی عزت۔ میں مر جاؤں گی لیکن میں اپنے خاندان پر بدنامی کا اتنا بڑا داغ کبھی نہ لگنے دوں گی۔" اور پھر اس نے ساجد سے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "دیکھئے میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں آپ کے سوا کسی دوسرے کا مونہہ بھی نہ دیکھوں گی۔ مر جاؤں گی مگر آپ کی محبت کو بیوفائی کا داغ کبھی نہ دوں گی۔ آپ مجھ پر اعتماد رکھئے۔"

اور پھر اس لڑکی کی شادی ہو گئی۔ اور قبل اس کے کہ اس کا دولہا جو کہ ظاہر ہے ساجد نہیں تھا اس کا مونہہ دیکھے۔ اس نے اپنا کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا۔ جب اس کا دولہا اس کے کمرے میں پہنچا تو اس نے شرمائی لجائی دلہن کی جگہ ایک جوان اور بیحد خوبصورت لڑکی کی لاش دیکھی جو کہ سہاگ کی سیج پر پڑی تھی۔ زہر نے جو کہ اسی نازک لمحے کے لئے

اس نے رکھ چھوڑا تھا اُس کی وفاداری کی لاج رکھ لی تھی۔

اور پھر ساجد کے دل و دماغ پر اس خبر نے بجلی گرادی اور وہ نیم پاگل ہوگیا۔

"تم آخر شادی سے انکار کیوں کرتے ہو بیٹا؟" ساجد کی ماں نے اُس کے سامنے اپنا آنچل پھیلا دیا۔ میں تم سے اپنے دودھ کے حق میں بھیک مانگتی ہوں۔ تم مجھے بہو کو اس گھر میں لانے دو بیٹا۔ نہیں تو میں مرتے مرجاؤں گی مگر تمہارا دودھ کبھی نہ بخشوں گی۔"

اور یہ سن کر ساجد چیخ پڑا۔ "خدا کے لئے امّی جان!" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "آپ اپنا یہ فیصلہ واپس لے لیجئے۔ نہیں تو میں پاگل ہوجاؤں گا۔ میں جان سے دوں گا۔"

اور وہ دیوانہ وار باہر کی طرف بھاگا۔ اور اس کی ماں کا آنچل جو کہ اس کے سامنے پھیلا ہوا تھا اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔

اور پھر دو سال بیت گئے۔ اور گھر والوں کے اصرار پیہم اور لگاتار تقاضوں اور خوشامدوں سے مجبور ہو کر ساجد نے بڑے مرے ہوئے انداز میں اپنی شادی کی اجازت دے دی۔ اور اس کوشش میں میری اپنی کارگذاریوں کو بھی بڑا دخل تھا۔ دو سال تک میں مسلسل ہر صورت سے ساجد کو اس شادی کے لئے آمادہ کرتا رہا تھا۔

اور پھر ساجد کی شادی ہوگئی۔

"دیکھئے ——!" ساجد نے اپنی گٹھری بنی ہوئی دلہن سے کہا۔ "میں آپ کو ایک بہت بڑے راز کی بات بتا رہا ہوں۔ میں نے ایک لڑکی سے بڑے شدید قسم کی محبت کی تھی۔ اور میں اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک اُسے نہ بھلا سکوں گا۔ اُس لڑکی کے تقریباً ساڑھے تین سو خطوط جو کہ میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں، ہر وقت میرے کلیجے سے لگے رہتے ہیں۔ اُس کی تصویر دیکھ دیکھ کر میں زندہ رہتا ہوں۔ لہٰذا ایسی صورت میں اگر آپ میرے ساتھ زندگی کے دن گذار سکتی ہیں تو ٹھیک۔ ورنہ میں آپ کو ہر قسم کی آزادی دینے کو تیار ہوں۔ آپ مجھ سے علیحدگی بھی اختیار کر سکتی ہیں۔"

اور پھر اپنا یہ راز صاف لفظوں میں ظاہر کر دینے کے بعد اس نے اپنی بیوی نزہت سے پوچھا۔ "اچھا اب آپ بھی مجھے صاف صاف یہ بتا دیجئے کہ آپ کی زندگی میں بھی اسی قسم کا واقعہ تو نہیں پیش آیا۔ اگر کوئی ایسا ہی واقعہ آپ کی زندگی میں بھی ہو تو مجھے صاف صاف بتا دیجئے۔ میں صبح ہی آپ کو طلاق دے دوں گا۔ اور اپنی ذمہ داری پر میں آپ کی شادی اس کے ساتھ کرا دوں گا جس سے کہ آپ کی شادی اس سماج میں رہ کر نہیں ہو سکی ہے۔"

اس نے زور دیا۔ "بخدا آپ ذرہ بھر بھی نہ جھجکئے۔ میں قرآن کو درمیان میں دے کر یہ بات کہہ رہا ہوں کہ میں وہی کروں گا جو کہ میں نے کہا ہے۔ میں محبت کی قدر دل و جان کے ساتھ کرتا ہوں۔ اور یہ سمجھتا ہوں کہ نہ جانے کتنی ہی شریف لڑکیوں کی شادیاں اسی طرح ان کی مرضی کے بغیر جبراً کر دی جایا کرتی ہیں۔ وہ چاہتی کسی اور کو ہیں۔ اور شادی کرنی پڑ جاتی ہے انہیں کسی اور سے۔"

اور اس پر نزہت نے بڑی دیر کے بعد آہستہ سے کہا۔ "میں نے کسی اور سے شادی کی خواہش کبھی نہیں کی۔"

"قسم کھاتی ہیں آپ؟"

"خدا کی قسم اور آپ کے سر کی قسم کہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

"آپ کہیں یہ سب کچھ ڈر کی وجہ سے تو نہیں کہہ رہیں؟"

"جی نہیں ——"

"پھر ——" ساجد بولا "مجھے —— مجھ جیسے انسان کو آپ گوارا کر سکیں گی جو کہ آپ کا ہونے کے باوجود کسی اور کی محبت میں زندگی بھر گرفتار رہے گا؟"

"اس میں آپ کا کیا قصور" نزہت بولی "آپ سے تو اُلٹی اور زیادہ ہمدردی اور محبت ہونی چاہئے مجھے۔ اور میں اس بات کی پوری کوشش کروں گی کہ آپ کے دل و دماغ کے اس بوجھ کو میں ہلکا کر سکوں۔"

اور پھر سچ مچ نزہت نے ساجد کے دل و دماغ سے محبت کی ناکامیوں کے داغ مٹانے کا پکا ارادہ کیا اور اپنے حسن سلوک سے اس نے دل شکستہ ساجد کے دل کو جیتنے کی کوشش شروع کر دی۔

ساجد شادی کے دو ہی مہینے بعد ایک کوٹھے پر بیٹھا اپنا غم غلط کر رہا تھا۔ وہ گانا سن رہا تھا۔ اور وہ اب تک اس ناچنے والی کے اُوپر سے ایک ہزار قربان کر چکا تھا کہ اس نے اپنے ایک بہت قریبی دوست سے چپکے سے کہا "دیکھو تم گھر جاؤ اور اپنی بھابی سے پانچ سو روپے لے آؤ۔ کہنا کہ مجھے اشد ضرورت پڑ گئی ہے۔ یہ نہ کہنا کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔"

ساجد کے دوست نے اُسے بہت سمجھایا اور اس طرح روپے لٹانے سے منع کیا مگر ساجد کے اصرار پر گھر گیا اور اس کی بیوی سے صاف صاف کہہ دیا۔

"بھابی، ساجد ایک طوائف کے کوٹھے پر بیٹھے گانا سن رہے ہیں۔ اب تک وہ ایک ہزار لٹا چکے ہیں۔ پانچ سو روپے اور منگوائے ہیں انہوں نے۔ مگر آپ نہ دیجئے گا۔"

اور یہ سن کر نزہت ان پر برس پڑی۔

"اچھے دوست ہو تم ان کے جو مجھے یہ مشورہ دے رہے ہو کہ میں انہیں غیروں میں روپیہ نہ بھیج کر ذلیل و رسوا کروں۔ جبکہ کراؤں ان کی دوسری جگہ۔ تم یہ پانچ سو لے جاؤ۔ بلکہ ٹھیرو میں اور زیادہ دیتی ہوں تمہیں شاید اور ضرورت پڑے انہیں۔ روپیہ ان کا اپنا ہے۔ اور پھر یہ میاں بیوی کا معاملہ ہے بیچ میں ٹانگ اڑانے والے تم کون ہوتے ہو؟"

اور پھر اس نے نوکر کو بھی ساتھ کیا اور بولی "میں نوکر کو ساتھ اس لئے کر رہی ہوں کہ تم یہ روپیہ ان تک پہنچا دو۔ ایسا نہ ہو کہ تم نہ دو انہیں اور وہاں غیروں میں ان کی

بے عزتی ہو۔"

اور پھر رات کے ڈھائی بجے جب ساجد واپس لوٹا تو اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی نزہت اُس کے انتظار میں جاگ رہی ہے۔ وہ سراسیمگی کے عالم میں بولا "معاف کرنا ذرا ایک جگہ پھنس گیا تھا۔"

اور جب وہ کپڑے بدل کر اور منہ ہاتھ دھو کر اور کھانا کھا کر اپنے بیڈ پر آیا تو نزہت بولی "یہ کیسے ہیں آپ کے دوست؟"

"کیا ہوا؟"

"کہہ رہے تھے کہ آپ کو ٹھٹے پر گانا سُن رہے ہیں۔ ایک ہزار خرچ کر چکنے کے بعد آپ نے مجھ سے پانچ سو اور منگوائے ہیں۔ مشورہ دے رہے تھے کہ میں ایک دھیلا بھی نہ دوں۔ مگر میں نے انہیں آپ کا بڑا مانتے گا جھاڑ دیا۔ میں نے کہا کہ آپ کون ہوتے ہیں مجھے ایسا مشورہ دینے والے۔ روپیہ ان کا ہے۔ اور پھر غیر جگہ آپ کی بیگی ہو میں یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ میں نے سات سو بھجوائے تھے اسی لئے۔ اور میں نے کریم کو ساتھ گیا تھا کہ وہ چھپ کر یہ دیکھ لے کہ وہ روپیہ آپ کو دیتے بھی ہیں یا نہیں۔ اور پھر جب کریم نے آکر بتایا کہ روپیہ آپ کے ہاتھ میں پہنچ چکا ہے۔ تب مجھے اطمینان ہوا۔"

یہ سُن کر ساجد سناٹے میں آگیا۔ اُس نے سوچا یہ عورت ہے یا فرشتہ۔ اور پھر اس دن سے ساجد کبھی کہیں اور کسی جگہ کوٹھے پر گانا سننے نہیں گیا۔ یہ عادت خود بخود اُس سے چھوٹ گئی۔ اور اس نے اپنی شام کے بعد کی اور دوسری تفریحات بھی چھوڑ دیں۔ نہ کلب، نہ تماشا اور نہ کچھ اور۔ وہ سیدھا اپنے آفس سے گاڑی لے کر گھر آنے لگا۔

اور اگر نزہت ساجد سے اس بات پر لڑتی جھگڑتی یا خفا ہوتی تو ساجد اپنی یہ عادت کبھی نہ چھوڑتا۔ البتہ وہ بیوی سے کچھ نہ کہتا اور چھپ چھپ کر وہ سب کچھ کرتا جو کہ وہ کرنا چاہتا۔ روپیہ سب کا سب وہ اپنے پاس رکھتا اور نزہت کو اس کی خبر بھی نہ ہوتی کہ کتنا آیا اور کتنا گیا۔ مگر نزہت کی اس شرافت پر ساجد پسیج گیا اور اس نے اپنی بہت سی بُری عادتیں چھوڑ دیں۔ جو کہ محض اپنا غم غلط کرنے کے لئے وہ کیا کرتا تھا۔

پھر ایک دَور ساجد پر وہ بھی آیا کہ وہ بہت زیادہ پریشان ہو گیا اور مقروض ہو گیا اس کا جو اپنا کاروبار اتنا بڑا تھا تباہ ہو گیا۔ اور بزنس میں اُونچ نیچ تو لگی ہی رہتی ہے اور پھر نزہت کی ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں وہ ہر وقت اس کوشش میں رہنے لگی کہ ساجد کو اپنی پریشانی یا مفلسی کا احساس تک نہ ہو۔ اور پھر وہ اپنے کاروبار کو یکسوئی کے ساتھ پھر سنوار لے۔

ساجد دسترخوان پر کئی قسم کے کھانوں کا عادی تھا اور اب نوبت یہ تھی کہ دال اور ترکاری بھی مشکل ہو گئی۔ نزہت یہ کرتی تھی کہ محض کورس پورا کرنے کے لئے وہ ایک ہی دو چیزوں سے کئی کئی کھانے بنا لیتی مثلاً اس نے چنے کی دال کا مزیدار بھرتہ الگ تیار کر لیا۔ اور پھر چنے کی دال اس انداز میں علیحدہ پکائی کہ اس میں قیمہ بھرے کریلوں کا مزا آنے لگے۔ صبح گھر میں جو تربوز آیا تھا۔ اس کے چھلکے اس نے نہیں ضائع کئے اور ان چھلکوں سے اس نے دو کھانے بنائے۔ تھوڑے سے چھلکے بہت باریک باریک کاٹ کر تیل میں تل لئے۔ اور تھوڑے سے چھلکوں کو اُبال کر اور پیس کر انہیں ایسا مزیدار بنا لیا کہ کیا کہنے۔ مزا ہی بدل گیا۔ اور وہ بالکل علیحدہ چیز معلوم ہونے لگی۔

لیجئے صاحب چار ترکاریاں بن گئیں۔ اور مزا ہر ایک کا الگ اور ضائقہ جدا۔

اپنے شوہر کی محبوبہ کی تصویر پر ہمیشہ وہ تازہ پھولوں کا ہار چڑھاتی۔ اس کے خطوں کو ہمیشہ سنبھال کر رکھتی۔ اور ہر جمعرات کو اس کے نام فاتحہ کر کے فقیر کو بھجوا دیتی۔

ساجد کے ہر دوست کی خاطر دل و جان سے کرتی۔ ساجد باہر بیٹھا ہے۔ اس نے خالی چائے کو کہلوایا۔ اور جب نوکر چائے لے کر آیا تو اُس کے ساتھ ہی کچھ اور لوازمات بھی تھے۔ پھلکیاں ہیں، آلو کی الگ اور پیاز کے ساتھ الگ۔ یا آلو کے چپس ہیں یا خستہ اور میٹھی ٹکیاں ہیں۔ نمکین اور خستہ پارے ہیں۔ اور ان چیزوں کی تیاری میں وقت اتنا ہی اُس نے لگایا جتنا وقت کہ خالی چائے بنانے اور بھجوانے میں لگتا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ساجد نزہت کا غلام ہو کر رہ گیا۔ اور اپنی پُرانی محبت کی ناکامی کے وہ داغ بھی جسے کہ وہ ناسور کہا کرتا تھا رفتہ رفتہ بھر گئے۔ اور وہ اپنی گھریلو زندگی سے اتنا خوش، مطمئن اور آسودہ ہوا کہ ان کی کھوئی ہوئی ساکھ دوبارہ چار برس کی مشکلات کے بعد اُسے پھر واپس مل گئی۔ اور اب پھر مرغ، تیتر اور بریانی کی بات ہونے لگی۔ اور اب نزہت کو بھی ڈاشنز کی گنتی بڑھانے کی کد و کاوش سے نجات مل گئی اور تربوز کے چھلکوں کی بھی جان چھوٹ گئی۔

اور اب اس واقعہ کے ساتھ ساتھ ایک اور واقعہ بھی سُن لیجئے۔

میرے ایک جگری دوست اور ہیں۔ نام پریم سمجھ لیجئے۔ ان کی بیگم صاحبہ اس قسم کی ولی ہیں کہ انہوں نے اپنے بھلے گھر کو جہنم بنا لیا ہے۔ شوہر اگر کسی کام سے بھی رات کو گیارہ بجے واپس آیا ہے تو وہ اس کی جان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہیں کہ وہ ضرور کسی آوارہ عورت کے ساتھ گھومتا پھرتا رہا ہے۔ اور اب کھانا دانا تو ایک طرف گھر ہے کہ مہابھارت بنا ہوا ہے۔ اور وہ جان سے عاجز ہے۔ جان چھڑانی اُسے مشکل ہو گئی ہے، اور وہ بھوکا ہی سو گیا ہے۔

صبح اُسے جلدی جانا تھا مگر شریمتی جی نے چائے بنا کر نہیں دی۔ اور وہ بغیر چائے پیئے گھر سے نکل گیا۔ اُس کا کوئی دوست گھر پر اُس سے ملنے آیا ہے وہ چاہتا

ہے کہ دوست کو کم از کم چائے پلا دے۔ مگر بیوی سے عرض کرنے کی جرأت نہیں ہو رہی۔ مسکین صورت بنا کر وہ باورچی خانے پہنچا اور قبل اس کے کہ وہ زبان کھولے بیوی بول پڑی "دیکھو جی چائے وائے کی بات نہ کرنا۔ بچوں کو اسکول بھیج رہی ہوں یہ گھر ہے، ہوٹل نہیں ہے، سمجھے؟"

اور وہ بیچارہ بی بی بن کر واپس آگیا۔ اور دوست کو جو کہ صبح ہی صبح آگیا تھا بغیر ایک کپ چائے کے واپس جانا پڑا۔ اس نے منہ پر تو کچھ نہیں کہا۔ مگر پریم بیچارے کے چہرے پر ندامت کا پسینہ سخت سردی کے باوجود پھوٹ پڑا۔

اور پھر نتیجہ یہ ہوا کہ اچھا بھلا شوہر زندگی کے یہ ماہ و سال اسی انداز میں گذارتے گذارتے سچ مچ بوکھلا گیا اور اب وہ کسی اور سہارے کا محتاج دکھائی دینے لگا۔ کوئی ایسا نازک سہارا جو اس کے دل پر مرہم لگا سکے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اب پریم سچ مچ باہر کی عورتوں میں جی بہلانے لگا۔ اور پھر ایک دن وہ شریمتی جی میرے گھر پر صبح ہی صبح آگئیں۔ فرمانے لگیں کہ تمہارا دوست آوارہ عورتوں کا ہو کر رہ گیا ہے۔ میں سیدھی عدالت جا رہی ہوں۔ طلاق کی درخواست دوں گی۔

اپنے تئیں سان خطا ہو گئے یہ سن کر۔ بہت سمجھایا بجھایا۔ بہلایا پھسلایا۔ وہ عدالت تو نہ گئیں۔ البتہ شوہر کے ایک ایک دوست سے اس نے ان کے گھر جا جا کر یہ دکھڑا سنایا۔ اور شوہر کی خوب خوب بدنامی کی۔ اور اب شوہر ہے کہ کسی کو منہ نہیں دکھا سکتا۔

نفرت دونوں طرف سے بڑھتی گئی اور اچھا بھلا گھر جہنم بن گیا۔ اور شوہر نے اب بڑھ چڑھ کر دوسری عورتوں کی طرف ہاتھ پیر پھیلانے شروع کر دیئے۔

اور اب تو یہ بھی سنا ہے کہ اس نے کسی اور عورت سے مستقلاً رشتہ جوڑ لیا ہے۔ قانون کا ڈر غالب ہے ورنہ وہ دوسری شادی بھی کر لیتا۔

بیچارہ سوچتا ہوگا کہ کاش یہ قانون نہ بنتا یا پھر اس نے ہندو کے گھر میں جنم نہ لے کر کسی مسلمان کے گھر میں جنم لیا ہوتا تاکہ اس کی یہ دشواری حل ہو جاتی۔ اور ان تمام باتوں کی ذمہ داری اس پر کم اور ایک ناسمجھ بیوی پر زیادہ ہے۔ اور کیا میری اس بات پر آپ متفق نہیں ہیں؟

آپ متفق ہوں یا نہ ہوں مگر آپ مجھ سے قسم لے لیجئے کہ یہ دونوں کہانیاں جو کہ میں نے مختصراً آپ کو سنائی ہیں سچی ہیں اور اس میں ذرا برابر بھی جھوٹ نہیں ہے۔

کیا آپ ان دو کہانیوں کے آئینے میں دیکھ کر مجھے یہ بتائیں گی کہ اس میں چہرے صاف طور پر نظر آتے ہیں یا نہیں؟ اور میں اس زحمت کے لئے آپ کا ممنون ہوں گا۔

●●

پیغمبری دُعائیں

ارشاد ہے کہ "دعا مومن کے لئے ڈھال اور تلوار ہے" اللہ کے محبوب بندے سرورِ عالم جب اپنے رب سے سرگوشی کرتے تھے تو اس راز و نیاز کی عظمت تک پہنچنے سے پہلے جبریل کے پَر جل جایا کرتے تھے، وہ مقدس سرگوشیاں دہرا جاتیں اور وہ محب و محبوب میں اندازِ گفتگو "پیغمبری دعائیں" ہیں۔ یہ کتاب اگر آپ پڑھ لیں تو خدا کو پکارنے میں صحیح لذت محسوس کرنے لگیں۔ یہ مستند دعاؤں کا بہترین مجموعہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ

رسولِ خدا کے اخلاق

جو لوگ یہ بے ہودہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا اُن کی بجواس کا منہ توڑ جواب، رسول اللہ صلعم کے اخلاقِ حمیدہ پر مجمل کتاب حضور کے اخلاق سے متاثر ہو کر کفار کس طرح اسلام کے آغوش میں آگئے، یہ رُوح پرور نظارہ دیکھنا ہو تو یہ کتاب پڑھو۔ قیمت ۵۰ نئے پیسے

قرآنی دُعائیں

خدا کی عظمت و جلال کا یہ عالم ہے کہ نوری ملائکہ مقربین بھی لرزاں اور ترساں رہا کرتے ہیں۔ اپنی ذات کو اگر خاکی انسان پکارے تو کیا الفاظ اختیار کرے اس کتاب میں وہ سب دُعائیں درج ہیں جو بندے اپنے رب کے حضور میں پیش کرتے ہیں۔ اور اپنا مطلب و مدعا حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔
قیمت ایک روپیہ

درسِ قرآن

قرآن خدا کا وہ پیغام ہے جس کی بابت سرورِ کونین صلعم نے فرمایا "خدا اسی قرآن کے ذریعے لوگوں کو بامِ عروج پر پہنچاتا ہے اور اسی کو ترک کرنے کی صورت میں قعرِ رسوائی میں ڈال دیتا ہے" ایسے پیغام حیات بخش کو سمجھنے کی تڑپ ہر دل میں پیدا ہوتی ہے اور اس جستجو میں دوڑتے ہیں کہ چند روز میں کس طرح اصول و قواعد کے وہ گھونٹ پی لیں جن سے قرآن پر عبور حاصل ہو جائے۔ ایسے وقت میں یہ کتاب ہر طالب قرآن کے لئے باعثِ تسکین ہے۔ قیمت ۲ روپے

مکتبہ دینیات، آصف علی روڈ، نئی دہلی

عشرت رحمانی

جنگ آزادی کی

پُر

سبز پوش

مجاہدہ

"مائی ڈیر فار سمتھ۔ میں تمہارے پاس ایک بڑھیا مسلمان عورت کو روانہ کرتا ہوں۔ یہ عجیب قسم کی عورت ہے۔ اس کا کام یہ تھا کہ سبز لباس پہن کر شہر کے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرتی تھی۔ اور خود ہتھیار باندھ کر اُن کی کمان کرتی ہوئی ہمارے مورچہ پر حملہ کرتی تھی ـــــ جن سپاہیوں کو اُس سے سابقہ پڑا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس نے بارہا دلیرانہ اور مردانہ حملے کئے اور مستعدی سے ہتھیار چلائے۔ اس میں پانچ مردوں کے برابر طاقت ہے۔ جس روز یہ گرفتار ہوئی اس دن یہ گھوڑے پر سوار تھی اور شہر کے باغیوں کو فوجی ترتیب سے لڑا رہی تھی۔ اس کے پاس بندوق تھی جس سے اس نے بہت سے نشانے مارے اور سپاہی کہتے ہیں کہ تلوار اور بندوق کے وار سے خود اُس نے ہمارے بہت آدمی قتل کر ڈالے۔ مگر جیسا کہ امید تھی اس کے ساتھی بھاگ گئے، اور یہ زخمی ہو کر گرفتار ہوئی۔ امید ہے کہ آپ اس کی جراءت کا معقول بندوبست کریں گے۔ کیوں کہ یہ ڈائن بہت ہی اندیشہ ناک عورت ہے۔"

یہ کسی کہانی یا افسانہ کا ٹکڑا نہیں، انقلاب ہند کی تاریخ کا ایک ورق ہے۔ لفٹننٹ ہڈسن نے فار سمتھ کمشنر انبالہ کو یہ نیم سرکاری خط لکھا تھا۔ اس میں جس مجاہد خاتون کا ذکر کیا تھا اس کو دو سو مسلح گوروں کی حفاظت میں کمشنر کے پاس بھیجا تھا، اور جس جنگ کا اس خط میں ذکر ہے۔ وہ تھی ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی یہ مجاہدہ خاتون دہلی کے ایک آخری مورچہ پر، ۱۷ دسمبر ۱۸۵۷ کو جنگی قیادت کرتے ہوئے ایک معرکہ میں انتہائی جراءت و دلیری سے لڑتی ہوئی زخمی ہو کر گرفتار ہوئی،

"جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے" اس خاتون کی بے جگری اور دلاوری کا اعتراف جن الفاظ میں ہڈسن جیسے دشمن نے کیا ہے، وہ اس ضرب المثل کو ثابت کر رہا ہے۔ اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ گو شکست و فتح کا فیصلہ نصیبوں سے ہوا مگر ہند کے دلاوروں نے جس عزم و صداقت اور بہادری سے مقابلہ کیا وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ یہ پہلی عوامی جنگ تھی جو ہندوستان کو غیر ملکی تسلط سے آزاد کرانے کے لئے دہلی سے شروع ہو کر ملک کے ہر ہر گوشہ میں لڑی گئی اور جس میں بلا تفریق ذات و ملت ہر فرقہ کے عورت مرد برابر کے شریک ہوئے۔ امیر غریب سب کا ایک ہی عقیدہ تھا۔ "ملک کی آزادی کے لئے سرفروشی"

ہے کہ درست کو کم از کم چائے [illegible] دشمن عناصر بھی شریک ہو گئے، جنہوں نے غیروں
ہو رہی مسکین صفت عداری کے ذلیل کارنامے بھی انجام دیئے اور ذاتی مفاد کی خاطر
ملک کو دوسروں کے ہاتھوں بیچ ڈالا، مادر وطن کو غلامی کا طوق پہنا دیا۔ ہزاروں
سہاگ اجڑ گئے، لاکھوں گھر برباد ہوئے۔ بے شمار سرفروش آزادی کی بھینٹ چڑھ
گئے۔ بچے یتیم ہوئے۔ ماؤں کے دودھ خشک ہو گئے۔ دہلی کی ویرانی کی داستانیں
خون کے حرفوں سے لکھی گئیں۔ مدتوں دہلی کے گلی کوچوں میں لہو کی ندیاں بہتی رہیں
مگر انہیں خونیں حروف سے ملک و وطن کی آزادی بھی لکھی گئی۔ مجاہدین کی ہمت،
شجاعت اور شہیدوں کا لہو رائے گاں نہیں گیا۔ سو سال تک اس انقلاب عظیم کی
داستان بڑھتی رہی اور آخر کار آزادی کے آخری باب پر انجام بخیر ہوا۔

اسی دہلی کے معرکہ کا ذکر ہے۔ جس سبز پوش خاتون کی گرفتاری پر ہڈسن
نے اپنی ساری انگریزی افواج کی بہادری پر فخر کر کے اس کو کمشنر انبالہ کے حوالہ کرتے
ہوئے خوف و ہراس کا اظہار کیا ہے، اس کا نام تک کسی کو نہ معلوم ہو سکا۔ تاریخ
انقلاب میں اس کا ذکر "ایک پُراسرار خاتون" یا "سبز پوش مجاہدہ" کے نام سے
کیا گیا ہے۔ گو وہ ان نامور خواتین کی طرح مشہور نہیں ہوئیں جن کی ناموری کا ایک
سبب اس کی ایثار و قربانی اور دلیری کے ساتھ خاندانی امارت بھی تھی۔ ان میں
سرفہرست جھانسی کی رانی بائی لکشمی بائی، اور لکھنؤ کی ملکہ حضرت محل ہیں۔ زمانہ کا عام
دستور یہ رہا ہے کہ کسی انسان کے کام کی شہرت میں اس کے خاندان اور حیثیت کا نام
بھی شامل ہوتا ہے۔ چنانچہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ کے مجاہدین کی جو تاریخ مرتب ہوئی
ہے اس میں بھی کارناموں سے زیادہ ناموری کے لئے اسی دستور عام کو کام میں
لایا گیا ہے۔ ہزاروں سرفروش ایسے تھے جنہوں نے ہمت و جرأت کے عظیم کارنامے
دکھائے لیکن عالی خاندان اور اعلیٰ مرتبت نہ ہونے کے سبب ان کے نام اور کام
کو تاریخ کے اوراق میں محفوظ نہ کیا جا سکا۔ اور ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی داستان
گمنامی کی تہہ میں دفن ہو کر رہ گئی۔

"اس سبز پوش مجاہدہ" کی زندگی کے جو مختصر حالات ملتے ہیں ان کا ہر دور اسرار
و رموز کے پردوں میں ملفوف نظر آتا ہے۔ ابتدا کا ذکر ہے کہ

ایک صاحب نے دیکھا کہ اجمیر شریف کے مقام پر حضرت حاجی لال محمد
چشتی نظامی خلیفہ حضرت مولانا فخر الدین چشتی نظامی دہلویؒ کے حضور میں ایک خاتون
مجذوبانہ کیفیت کے عالم میں بیٹھی ہے، اور ان سے عرض کر رہی ہے کہ

"حضرت میرے لئے شہید ہونے کی دعا فرمایئے" اس کے بعد وہ بیخودی
کی حالت میں جھومنے لگیں، اور پھر کہنے لگی

"مجھے جہاد کی تمنا ہے۔ جہاد چاہتی ہوں"

حضرت حاجی صاحب نے جواب میں فرمایا "نفس پر جہاد کرو، اس سے
بڑھ کر کوئی جہاد نہیں۔ دنیا کی خواہشات کے خلاف بغاوت کرو" اور حاجی صاحب
مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ پھر کچھ تامل کے بعد فرمانے لگے "مہندی کے پتے سبز ہیں مگر
باطن سرخ رکھتے ہیں، جا تو بھی سبز پوش ہو جا اور سرخ بن!"

وہ خاتون حاجی صاحب کے قدموں پر گر پڑی اور اٹھ کر کہیں چلی گئی۔

اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے حاجی صاحب کا مطلب
سمجھ لیا اور اس کے دل کو سکون ہو گیا۔

اس سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ اسی خاتون نے سبز پوش بن کر جہاد آزادی
میں شرکت کی اور مجاہدہ کی حیثیت سے سرخروئی حاصل کر لی۔

مندرجہ بالا واقعہ کے راوی نے کچھ عرصہ بعد اس خاتون کو ایک بار حضرت
قطب صاحبؒ کی درگاہ (واقع مہرولی، نزد دہلی) میں دیکھا۔ اس وقت وہ سبز پوش
تھی۔ اور حضرت مولانا فخر الدین چشتی نظامیؒ کے مزار پر مراقبہ میں بیٹھی تھی۔ جب اس نے
آنکھیں کھولیں تو اس شخص نے اس کے پاس جا کر دریافت کیا

"کیا آپ وہی خاتون ہیں جن کو میں نے اجمیر شریف میں حضرت حاجی صاحب
کی خدمت میں دیکھا تھا؟"

اس خاتون نے جواب دیا "ہاں بھائی میں وہی آپ کی بہن ہوں"

اس پر اس شخص نے پوچھا "کیا آپ بھی حاجی صاحب قبلہ کی مرید ہیں؟"

سبز پوش خاتون نے جواب دیا "ہاں میں ان کی کنیز ہوں"

پوچھا "آپ کون ہیں اور کہاں کی رہنے والی ہیں، یہ درویشی کا لباس کیوں
اور کب سے پہنا"

اس پر خاتون نے اپنی کہانی مختصر الفاظ میں یوں بیان کی:

"میرے دادا احمد شاہ ابدالی کی فوج میں سردار تھے۔ مرہٹوں کے لشکر سے
جب احمد شاہ ابدالی کی لڑائی ہوئی تو میرے دادا جان بھی اس میں لڑ کر شہید ہوئے
اس وقت میرے والد نوجوان تھے اور وہ بھی احمد شاہ ابدالی کی فوج میں تھے۔
والد صاحب اپنی بیوہ ماں کے ساتھ کچھ عرصہ لاہور رہے۔ پھر ریاست بھاول پور
چلے گئے۔ وہیں فوج میں ملازم ہو گئے۔ اور معمولی تنخواہ میں گزر بسر کرتے رہے۔
وہیں اُن کی شادی ہوئی اور میں پیدا ہوئی۔ بعد ازاں میں اپنے والدین کے ساتھ
ریاست جے پور چلی گئی اور میرے والد وہیں فوج میں نوکر ہو گئے۔ ہم وہیں رہنے
لگے۔ میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ اور مہاراجہ کے ایک چوبدار کے ساتھ میری شادی
ہو گئی۔ ایک دفعہ میرا شوہر بیمار ہوا اور اس کے زندہ رہنے کی آس بھی باقی نہ رہی۔
میں رات دن شوہر کے سرہانے بیٹھی ان کی صحت اور زندگی کی دعائیں مانگا کرتی۔

ایک رات میں اسی طرح دعا مانگ رہی تھی کہ بے اختیار میری زبان سے نکلا کہ "الٰہی خواجہ ہند الولی حضرت معین الدین چشتیؒ کے صدقہ میں میرے میاں کو تندرست کردے!" اسی حالت میں روتے اور دعا مانگتے میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے خواب دیکھا کہ چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے۔ ایک ہجوم اس آگ کو بجھانے کے لئے دوڑ دوڑ کر اس پر پانی ڈالتا ہے۔ لیکن وہ پانی بھی آگ پر تیل کا کام دیتا ہے اور شعلے بن کر بھڑکتا ہے۔ میں اس آگ کے طوفان کو دیکھ کر سخت گھبرائی ہوئی تھی کہ میں نے ایک بزرگ کو سامنے کھڑا دیکھا۔ ان بزرگ نے مجھے اشارہ کرکے فرمایا اے عورت! اپنے سر کی قربانی دے تو یہ آگ بجھ جائے!!" میں نے عرض کی "یا حضرت۔ سر کیسے قربان کروں؟" انہوں نے فرمایا "تو شہید ہونا نہیں چاہتی؟" یہ کہہ کر انہوں نے مجھے ایک سبز چادر دی۔ کہ اس کو اوڑھ لے اس چادر کا اوڑھنا تھا کہ میں اوپر اڑنے لگی میں نے چادر کو اپنے جسم پر لپیٹنا شروع کیا اور جوں جوں لپیٹا زیادہ اوپر اڑتی گئی۔ اس وقت میرے کانوں میں غیب سے آوازیں آنے لگیں "یہ شہید ہے۔ یہ شہید ہے"

میری آنکھ کھلی۔ میں نے گھبرا کر اپنے شوہر کو دیکھا وہ فوت ہو چکے تھے۔ میں اُن کے غم میں بدحواس اور پاگل ہوگئی۔ اُس کے بعد مجھے اپنی حالت کا زیادہ ہوش نہیں۔ جس روز آپ نے اجمیر شریف میں مجھے دیکھا میں اسی روز حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم میں اجمیر شریف کیوں کر پہنچی انسان کی محبت میں میں پاگل ہوئی تھی اور اللہ کی محبت میں مجھے ہوش آگیا۔ مگر دنیا سے نفرت ہوگئی۔ میں نے حاجی صاحب سے بیعت کی چونکہ والدین فوت ہو چکے تھے میں اکیلی تھی، وہیں رہنے لگی۔ اب کچھ دنوں سے یہاں حاضر ہوئی ہوں۔ سنتی ہوں سچ مچ چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے۔ اس پر خون چھڑکنا ہوگا (یہ وہ زمانہ تھا جب ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کا آغاز ہو چکا تھا)

تھوڑی دیر وہ مرد اور عورت خاموش رہے۔ پھر عورت نے کہا "پرسوں حضرت دادا پیر (حضرت مولانا فخر الدین چشتیؒ جن کے مزار پر وہ بیٹھی تھی) نے مجھے خواب میں فرمایا "تو سبز پوش شہید ہے"

اور اس کے بعد دہلی کے جہاد آزادی کا ہنگامہ اور گرم ہوا۔ آگ اور خون کا طوفان ہر طرف برپا تھا، وہاں ایک سبز پوش خاتون کو گھوڑے پر سوار مونہہ پر نقاب ڈالے ایک عوامی دستہ کی قیادت کرتے دیکھا گیا، جو کمال جرائت و شجاعت سے انگریزی فوج کا مقابلہ کر رہی تھی۔ اور گورا پلٹن کے دانت کھٹے ہو رہے تھے۔ اس مجاہدہ کے ہاتھ میں تلوار تھی، اور اپنے دستہ کے آگے بے جگری سے ہر طرف میدان میں گھوڑا دوڑاتی گوروں کے سر اڑاتی پھرتی، اس کے دستہ کے جانباز مجاہدوں میں ہر فرقہ اور طبقہ کے لوگ شامل تھے، جو آزادی کی راہ میں دیوانہ وار وطن اور قوم پر جانیں فدا کر رہے تھے۔ جب ایک دستہ انگریزی فوج کی گولیوں کا نشانہ بن کر ختم ہو جاتا تو یہ سبز پوش مجاہدہ بے پناہ سرپٹ گھوڑا دوڑاتی شہر کی طرف نکل جاتی اور نئے سرفروشوں کی جماعت کو ساتھ لے کر میدان جنگ میں کود پڑتی۔ اس طرح کئی روز مردانہ وار شجاعت کے کرتب دکھاتی رہی، اور مخالف فوجوں کو حیرت میں ڈال کر کھلبلی مچائے ہوئی تھی۔ آخر کار زخموں سے چور چور ہو کر بے ہوشی کے عالم میں گرفتار ہوئی۔

اس حوصلہ مند جانباز مجاہدہ کی بے مثال دلیری کا اعتراف دشمن فوج کے سردار ہڈسن تک نے کیا۔ لیکن ہمارے "قومی" مورخ منشی ذکاء اللہ نے اپنی "تاریخ ہند" میں جن الفاظ سے اس کو یاد کیا وہ اُن کی قوم فروشی اور سرکار پرستی کا افسوس ناک مظاہرہ ہے۔ فرماتے ہیں:

"یہ کٹنی سینکڑوں آدمیوں کو بہکا کر شہر سے لے جاتی اور میدان جنگ میں ان کو کٹوا دیتی"

ہڈسن نے کمشنر انبالہ کو متذکرہ بالا خط میں مزید لکھا تھا کہ

"یہ عورت گرفتاری کے بعد جنرل صاحب (ولسن) کے سامنے پیش ہوئی۔ تو انہوں نے عورت سمجھ کر اس کو رہا کر دینے کا حکم دیا۔ مگر میں نے روکا۔ اور کہا کہ اگر یہ رہا ہوگئی تو شہر میں اپنی باطنی اور غیبی طاقت کا دعویٰ کرے گی اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کو اس کی رہائی کسی مخفی اثر کا نتیجہ معلوم ہوگی اور ممکن ہے کہ اس سے یہ عورت فرانس کی مشہور عورت (جون آف آرک) کی طرح ہمارے واسطے باعث تکلیف ہو جائے، جس کا ذکر انقلاب فرانس کی تاریخ میں مذکور ہے۔ اس پر جنرل صاحب نے میرے مشورہ کو قبول کیا اور اس عورت کو قید کرنے کی تجویز قرار پائی ——"

ہڈسن جیسے ہندوستان دشمن کا یہ لکھنا "سبز پوش مجاہدہ" کے ظاہری و باطنی کمالات سے خائف ہونے کی دلیل ہے کہ "آپ کی خدمت میں اس کو روانہ کیا جاتا ہے امید ہے کہ آپ اس کی حراست کا معقول بندوبست کریں گے کیوں کہ یہ ڈائن بہت ہی اندیشہ ناک ہے"

ہڈسن اس پُراسرار شخصیت سے مرعوب تھا ورنہ اپنے ہاتھ سے بلا رعایت اس کا سر اڑا دیتا یا گولی کا نشانہ بنا دیتا۔ بعد میں معلوم نہ ہو سکا کہ اس مجاہدہ کا کیا انجام ہوا۔ غالباً "شہید ہو کر سرخرو ہوئی"

●●

شہاب نے سلمیٰ کا حسن اور نکھار تباہ کیا....
شہاب نے سلمیٰ کے رخساروں کا نور چھین لیا....
شہاب نے اپنی تسکین کے لئے ایک زندہ دل، گلاب کی حسین کلی کی طرح
نازک اور شاداب دوشیزہ کو زندہ درگور کر دیا۔
لیکن جب شہاب کے ضمیر نے اس پر ملامت کی تو اسے اپنے وجود سے بھی چڑ ہو گئی،
اس کا دل سلمیٰ کی اس خستہ حالی پر رو دیا ——— سلمیٰ شہاب کی
اس تبدیلی پر قربان ہونے کے لئے تیار ہو گئی۔
اور عورت کی فطرت بیدار ہوئی، اس نے مرد کو سہارا دیا
شہاب کی اندھیری زندگی میں اُجالا ہو گیا۔ غموں کی راتیں مسرت اور
شادمانی میں تبدیل ہو گئیں۔
آپ کے پسندیدہ ناول نگار عادل رشید کا ایک
انتہائی دِل چسپ ناول "اندھیرے اُجالے"
قیمت ۳ روپے

شمع بک ڈپو کے دو نئے ناول

آگ اور دھواں

یہ چند بُرے اور چند اچھے آدمیوں کی کہانی ہے۔
ہریش ایک بُرا آدمی تھا، جس کے صرف دو شوق تھے ———
"نئی نئی عورتیں اور قیمتی شرابیں!"
لتا، ہریش جتنی بُری تو نہیں تھی جو پہلے بھٹکی بعد میں
سنبھلی۔ یہ دنیا اچھے بُرے سب ہی لوگوں سے مل کر بنی ہے
ہر دل عزیز ناول نگار م۔ راجندر
کا عجیب و غریب ناول "آگ اور دھواں"
قیمت ۲ روپے ۲۵ نئے پیسے

شمع بک ڈپو آصف علی روڈ، نئی دہلی

بڑی بی کی ڈائری

بڑی بی کی ڈائری کے کچھ اوراق ہمارے ہاتھ لگے ہیں، اور بانو بہنوں کے اصرار پر انہیں پیش کیا جا رہا ہے۔
بڑی بی ان عام بڑی بوڑھیوں جیسی ہیں جن کی آمد ہمارے ہر گھر میں وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہے لیکن ان کے اندر ایک بڑا عیب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کھری کھری سناتی ہیں اور ان کی کھری باتوں میں کم از کم ۵، فیصدی وزن ضرور ہوتا ہے۔ بسا اوقات ضرورت سے زیادہ کڑوی ہو جاتی ہیں۔ ان کی کڑواہٹ کو برداشت کرنے کے لئے بڑے پائیدار صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو صبر کرے گا اور ان کی کڑوی کسیلی باتیں برداشت کرے گا، ہمیں یقین ہے کہ بڑی بی اس کے لئے بہت میٹھا پھل ثابت ہوں گی

ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ اسے اپنی جنم کنڈلی نکلوانے اور نجومیوں سے غیب کی باتیں معلوم کرنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک دن اس کے پاس ایک نجومی آیا اور ہاتھ دیکھ کر کہنے لگا "حضور! آپ کی عمر کی لکیریں کہتی ہیں کہ آپ ڈیڑھ مہینے کے اندر اندر مر جائیں گے۔" یہ سنتے ہی بادشاہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے دربار کا ایک ایک شخص نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ وزیر اعظم نے یہ حال دیکھا تو ہریان پریشان ہو گیا کہ بادشاہ سلامت کو اس نگوڑے وہم سے کیسے نجات دلائی جائے۔ سوچتے سوچتے ایک بات ذہن میں آئی۔ نجومی سے کہا "اچھا اپنا ہاتھ دیکھ کر بتاؤ کہ تم کب تک زندہ رہو گے؟"

نجومی نے اپنا ہاتھ دیکھا اور بولا "اللہ رکھے میری عمر کے ابھی تیس سال باقی ہیں۔"

وزیر نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ، تلوار کا ایک ایسا وار کیا کہ مُنڈی سی اُڑ کر گرد اور دُور جا پڑی پھر وہ بادشاہ سے بولا "حضور اس کے ہاتھ کی لکیر کہتی ہے کہ یہ تیس سال زندہ رہے گا، لیکن بے چارہ تیس منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکا۔"

سچ ہے گیدڑ اوروں کو شگون بتلائے اور آپ اپنی گردن کتوں سے تڑوائے۔ آتا جاتا کسی کو کچھ نہیں، کمائی کا ایک دھندہ نکال رکھا ہے۔ اور پتھر پڑی، عقل کی ماری عورتیں ایسی ہیں کہ ہر آئے گئے کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ وہ کم بخت ہاتھ دیکھنے والا بھی جس کا نہ کوئی کاٹے کٹے اور نہ مارے مرے ایسی ایسی باتیں ملاتا ہے کہ یقین کرتے ہی بن پڑے ——— یقین کیا نہیں اور کام سے گئی نہیں۔ ٹھیک ہے جب ہاتھ کی لکیریں یہ کہہ دیں کہ ہم اس دنیا میں بے کار آئے ہیں اور بے کار سی موت مرنا ہے تو کون ایسا مائی کا لعل ہو گا جو اس کی بات پر آمنا و صدقنا کہہ کر بھی کچھ کام کرنے کی کوشش کرے؟ اور اگر یہ کہہ دیا کہ فلانے شخص کی قسمت ایسی اچھی ہے کہ بادشاہ بنے بغیر نہیں مانے گا، تو سمجھ لو کہ اچھے بھلے محنت مشقت کرتے ہوئے آدمی کو مٹا دیا اب تو وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے گا اور اُس وقت کا انتظار کرے گا جب چھپر پھٹ کر بادشاہت اس کے لئے اُترے گی۔ بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو یہ کہتے جاتے ہیں کہ بھئی، ہم یقین وقین تو کچھ کرتے نہیں، بس یوں ہی تفریحاً ہاتھ دکھاتے ہیں ——— کیا کروں، انہیں باتوں پر تو بدنام ہوں۔ ایسے لوگوں کو میں تو بالکل سفید جھوٹ بولنے والا کہتی ہوں۔ مونہہ پر رام رام اور بغل میں چھری۔ دِل میں تو یہ کہ کوئی اچھی سی غیب کی بات معلوم ہو جائے گی اور مونہہ پر یہ کہ تفریح کرتے ہیں۔ واری اس بھولپن پر۔

ویسے ہاتھ دیکھنا تو مجھے بھی آتا ہے۔ ہاتھ دیکھنے والوں تک کے ہاتھ دیکھ چکی ہوں۔ جو کچھ کہا ہے ڈنکے کی چوٹ پر کہا ہے اور آج تک کوئی ایسا نہیں ملا، جو میری بات کا انکار کر سکے۔ اب بھی کوئی لڑکی بالی خوشامد درامد کرتی ہے تو ہاتھ لے کر بیٹھ جاتی

ہوں۔ ہزار لاٹھی ٹوٹی ہوئی ہو تو بھی گھر کے باسن توڑنے کو بہت ہے۔ جانتی ہوں کہ لڑکیاں بالیاں عام طور پر کیا پوچھ سکتی ہیں۔ مثلاً:

۱۔ تعلیم اور آئندہ کی زندگی (یعنی شوہر کیسا ہوگا، شادی کب ہوگی وغیرہ وغیرہ)

۲۔ عمر۔ اب تک زندگی کیسی گزری۔ آخری عمر میں کلمہ نصیب ہوگا یا نہیں؟

۳۔ حج یا کسی دوسرے ملک کا سفر۔

اب ان کے پوچھے بغیر میں ساری باتیں بتانا شروع کر دیتی ہوں مثلاً:

۱۔ تم بہت تیز کام کرنے والی ہو یا سستی بہت کرتی ہو (ہر لڑکی تیز کام کرنے والی بھی ہوتی ہے اور سست بھی۔ جو دل چاہے کہہ دو، بات سولہوں آنے ٹھیک ہوگی) طبیعت میں لڑنے بھڑنے کی عادت ہے یا قوتِ برداشت بہت زیادہ ہے، (یہ دونوں باتیں بھی ہر لڑکی سے کہی جا سکتی ہیں، اگر انکار کر دے تو ہاتھ کا علم جھوٹا اور جو چور کی سزا وہ میری) تعلیم واجبی ہے۔ سورج کی لکیر ذرا اور گہری ہوتی تو بے حد تعلیم حاصل کرتیں۔ اب بھی اگر یہ لکیر تھوڑی سی اور بڑھ جائے اور توقع ہے کہ بڑھ جائے گی تو کافی تعلیم حاصل کر سکو گی ——— آئندہ زندگی موجودہ زندگی سے بہتر ہوگی۔ بہترین بھی ہو سکتی ہے بشرطیکہ دماغ کی لکیر پر سے صلیب کا نشان غائب ہو جائے۔ شوہر ہنس مکھ ملنسار اور پڑھا لکھا ہوگا۔ سسرال کے دو ایک عزیزوں سے رنج پہنچے گا۔ لیکن جو پیا کے من بھائے، وہی رانی کہلائے۔ کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتا ——— شادی کے دن اب بالکل قریب آ گئے ہیں۔ کچھ عزیز رشتہ دار بیچ میں روڑے اٹکا رہے ہیں، لیکن مونہہ کی کھائیں گے۔ یقین کی بندی ہوگی تو سچ مانو گی کہ تم ایسا گڑ نہیں جسے چیونٹے چیونٹیاں چھو سکیں۔ ہنستے پھول اور کمبستی کلی کی طرح یہاں سے رخصت ہو کر جاؤ گی۔ دشمنوں کو لعنت کا شروا اور پھٹ پھٹ کی روٹی نصیب ہوگی۔

۲۔ ایں! یہ کیا غضب ہے۔ تمہاری اس لکیر کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ اچھی سچ سچ بتانا ہر طرح کا سکھ ہوتے ہوئے بھی تم یہ سمجھتی ہو کہ چین سے نہیں۔ بچپن سے اب تک کوئی فکر اور پریشانی گھیرے رہتی ہے۔ جسے اپنا سمجھتی ہو وہی ہاتھ میں سمرنی اور بغل میں کترنی لئے آ موجود ہوتا ہے۔ دل کی بہت صاف ہو، یہی وجہ ہے کہ خواہ مخواہ لوگ دشمن بن جاتے ہیں حالانکہ قسم لے لو جو کسی کو دکھ میں دیکھ کر تمہیں خوشی ہوتی ہو۔ جو تمہاری زبان کو میرٹھ کی قینچی کہتے ہیں، ناسمجھ نالائق ہیں، ان کے مونہہ کے آگے خندق نہیں۔ نہ اینٹ ڈالیں نہ چھینٹ کھائیں ——— افسوس! اتنا اچھا دل لیکن سکون سے محروم ——— ملے گا بھئی، سکون بھی ملے گا لیکن ابھی دو ایک سال تو امید نہیں۔ عمر اچھی خاصی ہے۔ بچپن میں کافی بیمار رہیں۔ ایک بار تو ڈاکٹروں تک نے جواب دے دیا تھا۔ شادی کے بعد کچھ بیماریاں پھر گھیریں گی۔ ایک مرض تو بڑا جان لیوا ہوگا۔ بچ گئیں تو بیڑا پار ہے۔ پھر بڑھاپے سے پہلے کوئی بیماری نہیں۔ تمہارے سیدھے بازو پر تل ہے۔ میں نے دیکھا نہیں بغیر دیکھے بتایا ہے۔ یہ تل اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ تمہارا شوہر کانوں کا بڑا کچا ہوگا اور تم سے اتنی محبت کرے گا جتنی چکور چاند سے (جسم کے ہر حصے پر ایک نہ ایک تل ضرور ہوتا ہے، کسی بھی حصے کا حوالہ دے کر کوئی بھی پیش گوئی باور کرائی جا سکتی ہے) آخیر عمر میں مذہب سے رغبت بڑھ جائے گی۔ اب بھی نماز روزہ کبھی کبھار ہوتا ہے لیکن مذہبی طور پر بہت سخت ہو۔ گلے پر چھری کیوں نہ ہو، مذہب کی برائی نہیں سن سکتیں ——— کیوں سچ ہے نا؟ جو بات جھوٹ بولوں فوراً بتا دینا۔ تکلف بالکل مت کرنا۔

۳۔ حج کی لکیر بننا شروع ہو گئی ہے۔ ذرا اور بڑھ جائے تو حج یقینی ہے ——— ویسے قسمت میں سفر ہیں اور تمہیں لمبے لمبے سفروں سے محبت بھی ہے۔

لو بھئی! یہ یا اس سے ملتی جلتی باتیں کیں اور ہاتھ دیکھنے والے بن بیٹھے۔ اب جہاں جائیں، "یہ بات وہ بات، اچھا ہے تیرا ہات، ٹکا دھر میرے ہات" جو بھر کی آشنائی ہو اسی علم کی بدولت گاڑی بھر کا ناطہ جوڑ لیں ——— زندہ رہے یہ علم اور زندہ رہیں اس کو ماننے والے۔ کان پیارے تو بالیاں، جورو پیاری تو سالیاں۔

آہا ہا ہا جج صاحب بہادر! مزا آ گیا تمہارا فیصلہ سن کر۔ ایمان ایمان سے کہتی ہوں کہ تم موئے مردوں میں بھی ایک آدھ ایسا نظر آ ہی جاتا ہے جسے عقل مند کہا جا سکے۔ اب بھلا تم ہی بتاؤ، اختر میاں ایک بیوی اور تین ننھے ننھے بچوں کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنے کے لئے تمہاری عدالت میں آ کر اپنی بیوی کی برائیاں کریں۔ دوستوں اور پاس پڑوس والوں سے جھوٹی سچی گواہیاں دلوائیں اور حلف اٹھانے اور قسمیں کھانے تک سے گریز نہ کریں ——— کون ایسا تم جیسا عقل والا بھلا مانس ہوگا جو الٹی انہی میاں کے ہینگ لگا دے ——— تمہارا فیصلہ یاد کرتی ہوں تو سچ مانیو، کلیجہ بلیوں اچھلنے لگتا ہے، تم نے اپنے فیصلہ میں کتنی شاندار بات کہی ہے کہ:

"قابلِ مبارک باد ہے وہ عورت جو اختر میاں کی بیوی اور ان کے بچوں کی ماں ہے اور جس نے اپنے طور طریقوں اور عادات و اطوار سے اپنے شوہر کو اتنی راحت بہم پہنچائی کہ اسے شادی کے بعد پچھتانے کے بجائے ایک اور بیوی کی ضرورت محسوس ہوئی ——— ورنہ آج کل کے شادی شدہ لوگ خواہ وہ مرد ہوں یا عورت، ہمیشہ اس گھڑی کو کوستے ہیں جب ان کی شادی ہوئی تھی، چہ جائیکہ دوسری شادی کی تمنا کریں ——— عدالت کافی غور و خوض کے بعد اختر میاں کی موجودہ بیوی کی تعریف کرتے ہوئے اختر میاں کی دوسری شادی والی درخواست کو رد کرتی ہے۔"

خدا باقی اختر میاؤں کو بھی توفیق دے کہ وہ تمہارے فیصلہ سے اپنے ہونٹوں کی

مستی پونچھیں۔ اپنی بیویوں کے ہوتے ہوئے اِدھر اُدھر کے خیال دل میں نہ لائیں ——— یقین کرتاج صاحب! ہم عورتیں تو مردوں کے گھروں میں بیاہ کر جاتی ہیں تو اسے برباد کرنے نہیں جاتیں۔ تمہاری بربادی تو ہماری اپنی بربادی ہے۔ گھر پھونک تماشہ دیکھنے والے تم مرد تو ہو سکتے ہو لیکن کوئی بی بی اپنے آپ کو اُجاڑ کر خوش نہیں ہو سکتی ——— میں اگر تمہاری جگہ ہوتی تو اختر میاں اور ان کی بیوی دونوں کو ایک ایک شادی کرنے کی اجازت دے دیتی۔ پھر دیکھتی کہ اختر میاں کے کیسے مرچیں لگتی ہیں، کیسے کیسے بلبلاتے اور ہکر ہکر کرتے ہیں (ویسے فیصلہ تمہارا بھی بُرا نہیں)۔

معصوم شاہ کے مینارے والی گلی میں کھڑی تھی کہ چھوٹے سے قد والی کرمن بوا آئیں اور آتے ہی پتھر کھینچ مارا۔ بولیں "او دیوانی! راستہ چھوڑ دو تو میں جاؤں"۔

میں ایک طرف کو ہو گئی "جاؤ میری ٹھگنی بہن"۔

میں نے انہیں بوا کہا تو اڑوس پڑوس کے لوگ ہنس پڑے۔ بڑی کرکری ہوئی جلدی سے کہنے لگیں "میرا اشارہ تو تمہاری عقل کی طرف تھا"۔

میں نے کہا "میں نے بھی تمہاری عقل کی بات کی تھی ——— تم کیا سمجھیں"۔

اب جو لوگ ہنسے تو دُم دبا کر بھاگتے ہی بن پڑی۔ ایسی اُڑن چھو ہوئیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

میرے محلّے میں ایک صاحب رہتے ہیں جناب اسرار حسن منصوری۔ بچوں کی نفسیات پر پورا پورا عبور رکھتے ہیں۔ ہر ایک سے کہتے پھرتے ہیں کہ آج کل کے لوگ بچوں کو پالنا ہی نہیں جانتے۔ انہیں چاہئے کہ بچوں کی ہر بات کو مانیں تاکہ ان میں خود اعتمادی پیدا ہو اور یہ یقین ہو جائے کہ وہ دنیا میں جو چاہیں حاصل کر سکتے ہیں ——— مثال کے طور پر چرچل کا نام لیتے ہیں کہ بچپن میں ضد کرنے پر ان کے باپ نے انہیں کئی سو روپے کا شیشہ توڑنے کی اجازت دے دی تھی۔ اسی شیشہ کو توڑ کر چرچل ادیب، مصور اور وزیر اعظم بن سکے۔ اگر اجازت نہ ملتی تو شاید وہ یونہی سے کلرک بن کر رہ جاتے ——— ایک دن ان کی تین چار سال کی بھانجی ان کے کمرے میں سو گئی۔ آدھی رات تک سکون رہا۔ آدھی رات کو اٹھ کر اس نے رونا شروع کر دیا۔

منصوری صاحب اُٹھے اور چمکارتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے؟"

"میں باغ والا کیڑا کھاؤں گی"۔

"اس میں رونے کی کیا بات ہے"۔ انہوں نے کہا "ابھی لاتا ہوں"۔

ڈھونڈھ ڈھانڈ کر کیڑا لائے تو اس نے ناک بھوں چڑھائی "یہ سا نہیں۔ بالوں والا"۔ دوبارہ گئے اور بالوں والا کیڑا لے کر آئے۔

"اب اسے پکائیے بھی تو"۔ بچی نے کہا۔

بے چارے نے سٹوو جلایا اور کیڑے کو خوب اچھی طرح فرائی کیا۔

"اب آدھا آپ کھائیے"۔

غریب نے آدھا کیڑا خود کھا لیا ——— اُدھر کیڑا حلق سے اتارا اور اِدھر لڑکی نے نعرہ لگایا "آپ نے ہمارا والا آدھا کھا لیا۔ ہمارا والا آدھا لائیے"۔

سُنا ہے وہ سر پیٹتے ہوئے باہر بھاگ گئے اور پورے دو دن کے بعد واپس آئے آج کل بچوں کی نفسیات پر لوگوں کو لیکچر دیتے ہیں یا نہیں، اس بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ یہ البتہ معلوم ہوا ہے کہ اب وہ اپنا زیادہ وقت دُکان پر گزارتے ہیں۔

لوا در سنو کل کی لڑکی، ہونٹوں کا دودھ خشک نہیں ہوا اور بڑے دھڑلے سے اعلان فرما رہی ہیں کہ ظہور احمد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں۔ ہاتھ بھر کا کلیجہ چاہئے ایسی بات کہنے کو۔ ایک ہم ہیں کہ آج تک ایسی بات مونہہ سے نکالنا تو درکنار جی تک میں نہیں لا سکتے۔ رہی یہ کم بخت آج کل کی محبت وحبت، اس کے بارے میں اپنا ایک قصہ یاد آ رہا ہے:

میری عمر یہی کوئی چودہ پندرہ برس کی تھی۔ بڑے میاں کے ہاں سے میرا رشتہ آیا ہوا تھا اور گھر والوں نے ابھی تک ان کا مونہہ میٹھا نہیں کرایا تھا۔ اُن ہی دنوں ایک دُور کے شہر سے میرے ایک خالہ زاد بھائی آئے۔ پہلے مجھے خوب گھورتے رہے۔ دوسرے دن باورچی خانے میں آ کر یہ شعر پڑھا

میرا دِل اُداس رہوے ہے　　خدا جانے کس کے پاس رہوے ہے

اگلے دن ہمت کچھ اور بڑھی۔ میرا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے اور بولے "اگر تمہارے ساتھ میری شادی نہیں ہوئی تو خدا رسول کی قسم مر جاؤں گا"۔ میری جو حالت ہوئی، سو ہوئی۔ اِس قصّہ کی مزے دار بات یہ ہوئی کہ میری شادی کے بعد واقعی اُن کا انتقال ہو گیا (صرف چالیس سال کے بعد)

وہ دن ہے اور آج کا دن، میں تو یہ جانتی ہوں کہ محبت کرنے والے بھی مرتے ہیں اور موت انہیں بھی آتی ہے، جو کسی سے محبت نہیں کرتے ——— شادی بیاہ گڈیوں کا کھیل نہیں۔ جب تک ماں باپ عزیز رشتہ دار اور تم خود اچھی طرح پرکھ نہ لو، اس قسم کی دھمکیاں دینے کی ضرورت نہیں۔ جو آج اپنی لچھے دار باتوں سے تمہیں موہ لینا چاہتا ہے کل وہی تمہارا حاکم بنے گا اور اگلے پچھلے سارے قرض ادا کرائے گا ——— میری بوڑھی آنکھوں نے ایسا بھی ہوتے ہوئے دیکھا ہے کہ جن لوگوں نے اچھا جانا، انہوں نے ہی نخرے کئے اور جن کو بُرا سمجھا، ایسے اچھے شوہر نکلے کہ آج تک واہ واہ ہوتی ہے۔ پتہ نہیں، کس طرح تم، کل کی بچی، کورا پنڈا ان باتوں پر اتنی جلدی اعتبار کر بیٹھتی ہو اور

مارنے مرنے کی دھمکیاں دینے لگتی ہو۔

دو تین غیر ملکی سیاح آئے تھے۔ انہوں نے شہر میں معلوم کیا کہ یہاں سب سے بوڑھا شخص کون ہے۔ پھر میرے پاس آئے، آدھے گھنٹے تک بات کرنے کی اجازت چاہی۔ سو روپے کا ایک کرارا نوٹ میرے ہاتھ میں تھمایا۔ ان میں سے دو قلم دوات لے کر لکھنے بیٹھ گئے۔ تھوڑا تھوڑا ڈر تو ضرور معلوم ہوا کہ اللہ جانے کیا پوچھ بیٹھیں پھر ہمت کر کے اور گلا صاف کر کے بیٹھ گئی اور کہا "پوچھو بیٹا۔ کیا پوچھتے ہو؟"

"بڑی بی۔" ان میں سے ایک نے کہا "تمہاری اتنی عمر ہونے کو آئی۔ ہزاروں عورتوں اور لڑکیوں بالیوں سے ملی ہوگی۔"

میں نے کہا "ہاں بیٹا۔ آنکھوں دیکھتے جانے کتنے پھول اور کتنی کلیاں خاک میں مل گئیں۔"

کہنے لگا "اچھا۔ اپنے تجربہ کی رُو سے یہ بتاؤ کہ عورت کتنی عمر تک اپنے آپ کو خوبصورت سمجھ سکتی ہے۔"

میں نے کافی غور و خوض کرنے کے بعد جواب دیا "افسوس بیٹا! اس سلسلہ میں مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

لکھنے والوں کے ہاتھ سے قلم گر گئے۔ حیرت سے میری طرف اس طرح دیکھنے لگے گویا میں نے کوئی عجیب و غریب بات کہہ دی ہو۔ ایک شخص آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرایا پھر بولا "اچھا بڑی بی! ہمیں جو کچھ پوچھنا تھا، پوچھ چکے ——— خدا حافظ۔ تکلیف کا بہت بہت شکریہ۔"

آدھے گھنٹہ کا وقت لیا اور پانچ منٹ کے اندر ہی اندر چلے گئے ——— نہ کچھ پوچھا، نہ گچھا۔ اللہ ایسے بے وقوف غیر ملکی مہینے میں تین چار بار بھی بھیج دیا کرے تو مزا آجائے۔

پیر عطائی بہت خوش ہوئے جب انہوں نے اپنے دورانِ قیام اپنی پیاری مریدنی سنجیدہ بیگم کو صبح سویرے فجر کے بعد یہ حمد گنگناتے ہوئے سُنا:

"اے خدا تو پاک ہے بے عیب ذات تیری سی کس میں بھلا ہوں گی صفات"

سنجیدہ بیگم ان کے لئے ناشتہ لے کر آئیں تو وہ اظہارِ خوشی کے بغیر نہ رہ سکے،

"شاباش بیٹی! شاید تم روزانہ یہ حمد پڑھتی ہو۔"

"جی ہاں پیر و مرشد۔ تقریباً روزانہ ہی پڑھتی ہوں ——— انڈا آدھا اُبالنے کے لئے تین بار اور پورا اُبالنے کے لئے پانچ بار۔"

ایک بار شوکت میاں رات بھر غائب رہ کر صبح سویرے گھر پہنچے۔

"کہئے جناب رات کہاں گزاری؟" بیوی نے پوچھا۔

"ذرا گانا سننے چلا گیا تھا۔ کچھ شراب بھی پی ڈالی۔ پھر اُن ہی گانے والیوں میں سے ایک کے ہاں پڑا رہا۔ سوچا کہ رات کے وقت تمہیں کیوں تکلیف دوں۔"

"یہ دھوکا کسی اور کو دیجئے گا۔" وہ گرج کر بولیں "میں جانتی ہوں، اُسی خاک پڑے کلموئے فاضل کے ساتھ رات بھر شطرنج کھیلی ہوگی۔"

سیّد احمد کو نہیں معلوم تھا کہ خوشی اور اطمینانِ قلب کسے کہتے ہیں، جب تک کہ اس کی شادی نہیں ہوگئی ——— مگر افسوس کہ اُس وقت وہ دن پھر واپس نہیں لائے جا سکتے تھے۔

"آتو جی میری بچی بڑی حساس ہے۔ اگر کبھی یہ اسکول کا کام کر کے نہ لائے تو برائے کرم اسے ماریں نہیں۔ سزا دینا ہی چاہیں تو اس کے برابر والی لڑکی کو مار لیں ——— یہ خود بخود سہم کر ٹھیک ہو جائے گی۔"

ایک کمیونسٹ دوسرے کمیونسٹ سے پوچھنے لگے "کہئے ویدجی! آپ کے بم میں کیا ٹائم ہوا ہے؟"

"سیٹھ جی نے میرا ووٹ لینے کے لئے مجھے دس روپے دیئے اور رائے صاحب نے آٹھ روپے۔ میں نے رائے صاحب کو اپنا ووٹ دے دیا۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ سیٹھ جی کے مقابلے میں رائے صاحب کچھ کم بدمعاش نکلے۔"

میری ۹۵ ویں سال گرہ تھی۔ جان پہچان کے بہت سے لوگ، عورتیں، لڑکیاں بالیاں آئی تھیں۔ تحفے تحائف بھی ملے لیکن چائے پانی میں کافی نقصان ہوگیا ——— ایک لڑکی روبینہ کی وجہ سے خواہ مخواہ ہنگامہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

بات یہ ہوئی کہ اُس نے مجھے ایک تحفہ دیا اور بولی "مجھے امید ہے کہ میں تمہاری ۱۰۰ ویں سال گرہ پر اس سے بھی اچھا تحفہ پیش کر سکوں گی۔"

میں نے نیچے سے اوپر تلک اُسے دیکھا "ہاں شاید۔" میں نے کہا "تمہاری تندرستی تو ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ شاید اُس وقت تک زندہ رہو۔"

بس رونے لگی کہ بڑی بی مجھے کوستی ہیں ——— حالانکہ میں قسم کھاتی ہوں کہ کسی بُرے خیال سے نہیں کہا۔ جو کچھ بھی کہا، زمانے کو دیکھتے ہوئے اپنے تجربہ کے مطابق ہی کہا۔

کوستی ہیں تو کوسا کریں۔ کوّوں کے چلّانے سے ڈھور نہیں مرتے۔

"اگر آپ اپنا ٹیلی فون نمبر بتا دیں تو میں آپ کو فون کر کے ایک ایسی بات کہوں، جو زبانی کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔"

"میرا نمبر آپ کو ڈائرکٹری میں مل جائے گا۔"

"ٹھیک ہے ——— لیکن آپ کا نام؟ مجھے تو آپ کا نام بھی پوچھنے کی جرأت نہیں ہوئی۔"

"وہ بھی نمبر کے ساتھ ہی چھپا ہوا ہے۔"

ہوائی جہاز کا پائلٹ یکایک قہقہے لگانے لگا۔

"کیا بات ہے؟ ایک مسافر نے پوچھا۔

"یہ سوچ کر ہنسی آ رہی ہے جب پاگل خانے والوں کو معلوم ہوگا کہ میں بھاگ آیا، تب ان پر کیا قیامت گزرے گی۔"

مولوی صاحب ایک تختۂ سیاہ کے پاس سے گزرے تو وہاں لکھ دیا "میں سب کے لئے دعا کرتا ہوں۔"

وکیل صاحب آئے تو یہ لکھ گئے "میں سب کی وکالت کرتا ہوں۔"

ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمایا "میں سب کا علاج کرتا ہوں۔"

بے چارہ معمولی سا شہری ادھر سے گزرا تو اس نے سو کی سیدھی ایک بات لکھ دی "میں سب کے لئے اپنی جیب خالی کرتا ہوں۔"

"کیا تم بھول گئی ہو کہ تمہیں میرے دس روپے دینا ہیں۔"

"نہیں! تھوڑا وقت اور دے دو۔ پھر میں بآسانی بھول جاؤں گی۔"

"آپ دن میں کتنی بار شیو کرتے ہیں؟"

"چالیس یا پچاس اور کبھی کبھی ساٹھ ستّر بار۔"

"جی.... ای.... ای؟"

"جی ہاں ——— میں حجام ہوں۔"

پاگل خانے کے سپرنٹنڈنٹ سے ایک مہمان خاتون نے پوچھا "ہمیں گھورتی ہوئی جو عورت ادھر سے گزری کیا وہ خطرناک ہے۔"

"جی ہاں.... لیکن کبھی کبھار۔"

"اور آپ نے اسے آزادی دے رکھی ہے؟"

"کیا کروں، مجبور ہوں۔"

"کیوں؟ کیا وہ آپ سے ڈرتی نہیں اور کیا وہ آپ کے کنٹرول میں نہیں۔"

"جی نہیں ——— نہ وہ مجھ سے ڈر سکتی ہے اور نہ میرے کنٹرول میں ہے ——— وہ تو میری بیوی ہے۔ میری نصف بہتر۔"

غفران جلد از جلد کسی مصیبت میں گرفتار ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"تمہیں کیسے علم ہوا؟"

"وہ میرے متعلق ہر جگہ جھوٹی بکواس کرتا پھرتا ہے۔"

"جب تک وہ جھوٹ بولتا رہے، پرواہ مت کرو ——— ہاں، اگر سچ سچ کا سچ بولنے لگے تو اس کے جبڑے چیر دو۔"

اور یہ ایک چھوٹا سا پیارا سا پالتو ہے جو اکثر میری غیر حاضری میں تمہیں میری یاد دلاتا رہے گا۔"

"اوہ مجید صاحب! آپ کتنے اچھے ہیں کہ مجھے بندر کا یہ بچّہ پیش کرتے ہیں۔ واقعی یہ ہو بہو آپ جیسا خوبصورت ہے۔"

وہ بدصورت، بدہَوَنق، بڑے بڑے ہونٹوں والا بے وقوف سا شخص بیٹھا ہوا ہمیں کیوں گھُور رہا ہے۔"

"ارے نادرہ! وہ ہمارے بڑے بھائی ہیں، چلو تمہارا تعارف ان سے کرا دوں۔"

"معاف کرنا۔ یوں ہی بے خیالی میں بک گئی ——— حالانکہ ان میں اور تم میں ہر لحاظ سے کوئی نمایاں فرق نہیں۔"

دو دوستوں کی ایک شاعر نے دعوت کی۔ دعوت کے دوران میں شاعر بولا "عمر خیام کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

"مجھے ڈرائی جن کے علاوہ کوئی دوسری شراب پسند نہیں۔" ایک نے بے رُخی سے جواب دیا۔

جب وہ گھر واپس آ رہے تھے تو دوسرے نے پہلے کو سمجھاتے ہوئے کہا "جب تمہیں کسی چیز کے بارے میں پوری طرح معلوم نہ ہوا کرے تو خواہ مخواہ اپنی ٹانگ مت

اڑایا کرو ـــــ عمر خیام کسی شراب کا نام نہیں، ریاستہائے متحدہ امریکہ کی اکیاونویں ریاست کا نام ہے۔"

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ کام کسی گدھے ہی سے کرانا پڑے گا، تو تمہارے بدلے میں خود ہی جانا مناسب سمجھتا۔"

"آپ نے ادھر سے کسی پولیس آفیسر یا سپاہی کو گزرتے ہوئے تو نہیں دیکھا۔"
"جی نہیں۔"
"تو جلدی کیجئے اور اپنا روپوں کا بٹوا اور گھڑی میرے حوالے کر دیجئے۔"

"کیا آپ مجھے ایک اکنی عنایت فرمائیں گے؟"
"کیوں۔ خیر تو ہے۔"
"ہم دونوں اس بات کے لئے قیاس کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کا بٹوا کون لے گا اور گھڑی کس کے حصے میں آئے گی۔"

"کیا آپ کے والد صاحب اپنی آخری سانس تک بہ ہوش و حواس رہے۔"
"کچھ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا ـــــ اُن کا وصیت نامہ کل پڑھا جائے گا۔"

"آج تک کوئی عورت کسی ملک کی صدر نہیں ہوئی۔"
"تمہیں علم نہیں کہ صدر کے لئے ۳۵ سال سے زیادہ عمر کا ہونا ضروری ہے؟"

"شاید میں آپ سے کہیں مل چکا ہوں۔"
"یقیناً ملے ہوں گے۔ میں اکثر وہاں جایا کرتا تھا۔"

"اچھا۔ تمہارے ہوٹل میں مرغی کا گوشت بھی پکا ہے ـــــ کیا خالص گوشت ہے۔"
"جی نہیں پچاس فی صدی ملاوٹ ہے ـــــ ایک مُرغی اور ایک بکری۔ دونوں کا گوشت ملا دیا ہے۔"

"میں کہتی ہوں، اس کے خیال سے باز آجاؤ۔ وہ شادی شدہ ہے۔"
"نہیں امّی، آپ کا خیال غلط ہے ـــــ وہ قسم کھاتے ہیں کہ بالکل کنوارے ہیں۔"

"جھوٹا ہے۔ میں ہرگز نہیں مان سکتی۔ جب کبھی وہ بٹوا کھولتا ہے تو میری طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو جاتا ہے۔"

"اِسے تم چائے کہو گے یا کافی؟ یہ تو بالکل پیالیوں کا دھوون معلوم ہوتا ہے۔"
"اگر یہ پیالیوں کا دھوون معلوم ہوتا ہے تو میں گارنٹی کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ چائے ہے کیوں کہ ہمارے ہوٹل کی کافی میں مٹی کے تیل کا مزا آتا ہے۔"

"بیرا ـــــ اِدھر آؤ ـــــ یہ دیکھو سالن میں ایک بال پڑا ہے۔"
"کالا یا بھورا؟ دو دن سے ہمارے ہاں کھانا پکانے والی غائب ہے۔"

"اگر آج شیکسپیئر زندہ ہوتا تو . . . ."
". . . . تو ساڑھے تین سو سال سے زیادہ کی عمر کا ہوتا۔"

"ہاں اب بتایئے۔ آپ کو کیا شکایت ہے؟"
"ڈاکٹر صاحب! صرف اتنی شکایت ہے کہ مجھے جلیبیاں اچھی لگتی ہیں۔"
"یہ تو کوئی شکایت نہیں۔ خود میں بھی جلیبیوں کا شوقین ہوں۔"
"سچ؟ تو کسی دن غریب خانے پر تشریف لایئے۔ میرے پاس ٹرنک پر ٹرنک، بستر پہ بستر اور الماریوں پہ الماریاں جلیبیوں سے بھری ہوئی ہیں۔"

بیوہ : کیا یہ تم ہو، ہلال احمد؟
بھوت : ہاں۔
بیوہ : کیا تم مرنے کے بعد خوش ہو؟
بھوت : بہت خوش ہوں۔
بیوہ : اس سے بھی زیادہ خوش ہو جب تم میرے ساتھ اس دنیا میں تھے۔
بھوت : ہاں! اس سے بھی زیادہ خوش ہوں۔
بیوہ : تب تو تم یقیناً جنت میں ہو گے۔
بھوت : نہیں ـــــ میں جنت میں نہیں جا سکا۔ دوزخ میں ہوں۔

پیاری بچیوں کو سات سمندر پار آنے والی بڑی بی کی دعاؤں کے بعد معلوم ہو کہ میں خیریت سے ہوں اور تم سب کی خیریت (مجیدن، جمالو اور اختری کے علاوہ) خداوند کریم سے نیک مطلوب۔ دیگر احوال یہ ہے کہ پچھلے ہفتہ عزیزی سرکار میاں سلمہٗ کے

پیچھے پیچھے میں ناچیز بھی ڈیڑھ سمندر پار کر کے سات سمندر پار آ گئی ہوں۔ تم سب کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ بڑی بی اب واقعی بہت بڑی بنتی جا رہی ہے، کیوں کہ بڑا آدمی بننے کے لئے گٹ پٹ جاننا ضروری ہے اور میں یہاں آنے کے بعد سے نہ صرف گٹ پٹ بول اور سمجھ لیتی ہوں اور بلکہ مُوئے خواب بھی گٹ پٹ والے ہی دیکھتی ہوں۔ البتہ یہ ایک ذرا سی مصیبت ضرور ہے کہ اپنے ملک کی طرح یہاں بیٹھ کر باتیں بنانے والے لوگ نہیں ملتے۔ چھوٹے میاں ہوں یا منجھلے میاں، ننھی بوا ہوں یا بڑی خالہ۔ جسے دیکھو ہوا کے گھوڑے پر سوار کسی نہ کسی کام میں مصروف ہی نظر آتا ہے ——— سرکار میاں کی بلّی سے بھی ملی تھی چندے آفتاب، چندے ماہتاب لڑکی ہے۔ اگر سرکار میاں اس کی شان میں مضمون اور کہانیاں لکھ لکھ کر یہاں کے رسالوں اخباروں میں چھپواتے ہیں تو کیا بُرا کرتے ہیں۔ لوگ تو آنکھوں میں پُتلی والی تک کے لئے کہانیاں لکھنے سے باز نہیں آتے۔ بلّی تو پھر چاند کا ٹکڑا ہے۔ ایسی ہنس مکھ، ایسی شرمیلی، ایسی شوخ اور ایسی حیادار کہ تعجب ہوتا ہے، اتنی خوبیاں اور ایک اکیلی لڑکی میں ——— اور کیا یہ غضب کی بات نہیں کہ کافروں کے ملک میں ہوتے ہوئے بھی روزے نماز کی پابند ہے۔ کیا مجال کہ نماز چھوٹ جائے۔

پان، چھالیہ اور زردہ کھائے ہوئے بہت دن ہو گئے۔ شروع شروع میں دیس کے لائے ہوئے کچھ مہوبہ پانوں نے ساتھ دیا۔ بعد میں وہ بھی نہ رہے۔ ڈھونڈتی پھرتی ہوں لیکن کہیں نہیں ملتے ——— سُن کے ہنسو گی۔ اِس اللہ مارے پان نے ایک دن تو مجھے ہسپتال ہی میں پہنچا دیا تھا۔ معلوم یہ ہوا ہے کہ یہاں کے ہسپتال بڑے جان لیوا ہوتے ہیں۔ کسی بھی مریض کے پیچھے پڑ جائیں، سمجھ لو کہ اس کے مرض کا تیا پانچہ ہوا۔ اپنے وطن کی طرح نہیں ہوتا کہ دوا لینے جاؤ، کام کی تشخیص کراؤ دق کی اور پانی بھری سوئیاں لگوا لگوا کر کل کی مرتی آج مر جاؤ۔

اپنے وطن کے ڈاکٹر بھی کتنے پیارے اور کتنے بھولے بھالے ہوتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر جے نرائن تھے۔ جھنڈے والی نورانی بوا نے اپنی نواسی کی دوا لانے کو مجھے وہاں بھیجا پہلے میں نے مریضہ کا پورا حال سنایا، پھر انہیں بتایا کہ ڈاکٹر قریشی کے ہاں جاڑے بخار کا ایک مریض گیا تھا۔ انہوں نے ٹائیفائڈ کا علاج کیا اور جب وہ مر گیا تو ڈاکٹر زبیری نے دیکھ کر کہا کہ سرسامی حالت میں انتقال ہوا ہے ——— یہ قصہ بتا کر میں نے ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی کہ مرض کی صحیح تشخیص کر کے علاج کریں، کہیں ڈاکٹر قریشی والی بات نہ ہو جائے۔

"کیسی چھچھوری باتیں کرتی ہو" وہ بولے "میں قریشی کی طرح اناڑی اور عطائی ڈاکٹر نہیں ہوں، نمونیہ کا علاج کروں گا تو انشاء اللہ نمونیہ ہی میں انتقال ہوگا۔ کسی دوسرے مرض میں انتقال ہو جائے تو ڈاکٹری چھوڑ کر اصلی میرے کا نقلی سرمہ بیچنے لگوں گا۔"

تو بہ ہے۔ کہہ رہی تھی کھیت کی اور سنانے لگی کھلیان کی۔ تم بے چاریاں بھی کیا کرو، سات سمندر پار تو لقمہ دینے سے رہیں۔ تمہارے پاس تھی، دس اپنی سناتی تھی، ایک تمہاری سنتی تھی۔ تمہیں گاڑھا صاحب والے سعید میاں تو یاد ہی ہوں گے، وہی جو اور سیر بن کر اتنا اِتراتے تھے گویا بادشاہ بن گئے ہوں ——— کیسے مزے کے آدمی تھے وہ بھی، دُور سے ذرا سی جھلک دکھلا دی اور ہم سب لوگ سمجھ گئے کہ اب جھاڑ اور گپ شروع ہوئی۔ ذرا اور چمکے تو اپن لوگوں ہی میں سے کسی نے کہا "جس کو جو کچھ کہنا ہو ابھی کہہ لے، وہ دیکھو، سعید میاں آ رہے ہیں۔" تم میں سے کسی چھوٹی قسمت والی کو مل جائیں تو میرا سلام کہنا اور ان جھوٹی باتوں اور تہمتوں کا شکریہ ادا کر دینا جو وہ آئے دن میرے اوپر جوڑتے رہتے ہیں۔ اللہ مارے کنویں کے مینڈک ہیں۔ باہر نکل کر دیکھیں تو معلوم ہو کہ دنیا کتنی بڑی ہے لیکن انہیں تو مجھ دُکھیاری پر الزام تھوپنے ہی میں مزا آتا ہے جو لکھنؤ والے احمد حسین کے زردہ میں آیا کرتا تھا۔

اوہو۔ زردہ! زردہ کے اوپر یاد آیا کہ پان کی بات کر رہی تھی اور پہنچ گئی کہاں سے کہاں۔ تم الگ سوچ رہی ہو گی کہ موئے پان کی خاطر مجھے اتنا ذلیل و خوار اور ہریان پریشان کیوں ہونا پڑا کہ ہسپتال تک کی نوبت آ گئی ——— قصہ دراصل یہ ہوا کہ جب میں یہاں نئی نئی آئی تھی تو ایک روز ٹہلنے کے لئے نکلی۔ کمبخت اتنا اگر رہا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ بمشکل تمام ٹکریں کھا کھا کر زمین دوز ٹرین کے اسٹیشن پر پہنچی۔ جیب میں ایک سوکھا ہوا پان تھا۔ نکال کر مونہہ میں رکھ لیا ——— تھوڑی دیر کے بعد ایک جگہ پیک جو تھوکی تو ایک ولائتی میم اور اس کے دلائتی صاحب نے آ کر مجھے پکڑ لیا اور گٹ پٹ کرنا شروع کر دی۔

ولائتی میم نے کہا "تم مریض ہو ایسے مت گھومو۔"

صاحب نے کہا "ہسپتال چلو۔ ہم تمہیں چھوڑے آتے ہیں۔ ورنہ پھر تم پورے شہر میں بیماری پھیلاؤ گی۔"

میں نے بھی کچھ گٹ پٹ اور کچھ اپنی زبان میں کہا "مریض تم اور تمہارے ہوتے سوتے اُجڑے ہمیں مریض کہنے والا۔ اور آگ لگے ہمیں ہسپتال لے جانے والے کے۔"

ولائتی صاحب دوڑا دوڑا گیا اور دو کوڑی کے سپاہی کو پکڑ لایا۔ کہنے لگا "آفیسر! یہ عورت خون تھوکتی ہے مگر ہسپتال نہیں جاتی۔"

وہ تو خیریت یہ ہوئی کہ ایک اپنی طرف کا آدمی ادھر آ گیا اور بتایا کہ پتے کھانے سے لال تھوک نکلتا ہے۔ وہ نہ آتا تو ہسپتال تو جانا ہی پڑتا۔

ولائتی صاحب یہ سن کر بہت ہنسا۔ جاتے وقت معافی مانگی اور بولا "تم لوگ ہماری سمجھ میں نہیں آتے۔ کچھ دن پہلے میری دُکان پر ایک شخص روزانہ کھانسی کی دوائی کا شربت خریدنے آتا تھا۔ ایک دن اس نے پوری پانچ شیشیاں مانگیں۔ میں نے ہمدردی کرتے ہوئے پوچھا "کون بیمار ہے، کب سے بیمار ہے۔ کھانسی کے شربت سے فائدہ ہوتا

ہے یا نہیں؟"

کہنے لگا "یہ شربت دوائی کے لئے نہیں لے جاتا۔ توس پر لگا کر کھاتا ہوں ——
آج تین چار اپنے وطن والے اکٹھے ہو رہے، ہم سب مل کر کھائیں گے۔"

ولائتی صاحب تو ہنستا ہوا چلا گیا لیکن مجھے بڑی بے عزتی معلوم ہوئی۔ بھلا یہ بھی کوئی تک ہے کہ جسے دیکھو بڑا آدمی بننے کے لئے ولایت بھاگا چلا آرہا ہے۔ حالانکہ زیادہ ایسے ہیں جو یہاں آکر جوتیاں چٹخاتے ہیں —— ایک صاحب جیسے تیسے برتن بھانڈے بیچ باچ کر ابھی یہاں آئے ہیں۔ ایف اے تک پڑھے ہوئے ہیں۔ نوکری کی تلاش ہے۔ گٹ پٹ بولنا تو بڑی بات، ابھی صحیح طور پر گٹ پٹ سمجھ بھی نہیں پاتے۔

پوچھا "کیا کر سکتے ہو؟"

بولے "ٹائپ آتا ہے۔"

جس ملک میں ٹائپ کا کام لڑکیاں کرتی ہوں، وہاں کون عقل کا اندھا، گانٹھ کا پورا ان جیسے عظیم فن کار کی قدر کرنے لگا۔

بس بولا۔ کیا بتاؤں یہاں آنے والوں کی حالت؟ لڑکے ہیں وہ سبحان اللہ لڑکیاں ہیں وہ ماشاء اللہ۔ تہذیب سیکھنے آئے ہیں اور بدتہذیبی کی اتنی عمدہ نمائش کر رہے ہیں کہ جو سنے عش عش کرنے لگے —— بعد میں سب یہی کہتے ہیں کہ ولائتی بُرے ہیں حالانکہ اگر اُن جیسی وقت کی پابندی اور تہذیب ہم میں آجائے (مولوی مصاحب علی اور پنڈت روند کمار کہتے ہیں کہ اُنہوں نے یہ خوبیاں ہم ہی سے سیکھی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہوائی جہاز والا خیال بھی ہمارے اُڑن کھٹولے سے چوری کیا ہے) تو شاید ہم ایک مرتبہ پھر دنیا کے سامنے فخر کے ساتھ کھڑے ہو سکیں —— ان کے اخلاق کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ اپنی طرف کے ملکوں میں سے کسی ملک کے ایک بہت بڑے آدمی یہاں ایک دعوت میں مدعو تھے۔ دعوت کے بعد پیالوں میں گرم پانی میز پر لاکر رکھا گیا تاکہ سب اس میں ہاتھ دھو لیں۔ ہمارے بڑے آدمی کھانے کی چیز سمجھ کر غٹ غٹ کر کے پی گئے۔ باقی ولایتیوں کا اخلاق دیکھو کہ کسی نے مونہہ سے کچھ نہ کہا اور اپنے اپنے پیالے اٹھا کر خاموشی کے ساتھ اس طرح پینا شروع کر دیئے گویا وہ واقعی کوئی کھانے کے بعد کی چیز ہو۔

ہمارے ہاں ایسا ہوتا تو ہر طرف کھی کھی ہونے لگتی۔ یہ اخلاقی جرأت ہم میں ہے ہی کہاں؟ جو یہاں آئے ہیں وہ بھی یہ سیکھنے نہیں آئے۔ وہ تو بس ناچنا سیکھیں گے اور شراب پینا سیکھیں گے۔ اس سے بھی زیادہ کچھ سیکھیں گے تو اپنی کمائی کو یہاں کی عورتوں پر لٹانا بھی سیکھ لیں گے۔

میں بازآئی ایسے ملک سے، جہاں اپنے ہاں کے لوگ آکر اپنی ہی توہین کرائیں۔

سرکار میاں نے جان چھوڑ دی تو ہفتہ عشرہ میں واپس آرہی ہوں۔

اقبال فرحت اعجازی

خدا کا انعام

انسانی تمدن نے از زمین تا آسمان اپنی بساط عشرت بچھائی اور سرور و کیف میں جب انتہا کو پہنچا تو اس کی خود پسندی نے اپنے درمیان سے خدا کو حذف کرنے کی ناپاک سعی کی خدا کی قدرت مسکراتی رہی۔ خود پرستی میں اس کو جب ٹھوکر لگی تو قدرت نے دوڑ کر سہارا دیا بندے کو جب ہوش آیا تو کہنا پڑا کہ دنیا میں جو کچھ ہے خدائی انعام ہے۔ اس کتاب کی حقیقت اور اس کا حیرت انگیز اثر اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ قیمت: ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے

اسلامی ادب

ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے لئے لوگوں کے دلوں میں جگہ ہو جائے، یہ خواہش اُس وقت پوری ہو سکتی ہے جب آپ اسلامی آداب کے ساتھ زندگی گذار دیں، پڑھئے اور اس پر عمل کر کے لوگوں کے دلوں میں گھر کر جائیے۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے

اسلامی تاریخی کہانیاں

اس کتاب میں تاریخ اسلام کی ایسی دل چسپ اور سبق آموز کہانیاں جمع کی گئی ہیں جن کو پڑھ کر اسلام کی حقانیت روز روشن کی طرح سامنے آجائے گی۔ سلف صالحین کے وہ کارنامے جن پر اگر عمل کیا جائے تو مسلمانوں کی پریشانیوں میں بڑی حد تک کمی ہو سکتی ہے۔ قیمت: ۲ روپے

مدنی زندگی اور غزواتِ اسلام

دنیا کی تاریخ میں ایسی نظیر نہیں ملے گی کہ تلوار کسی کو زندگی بخشنے کے لئے اٹھی ہو مگر اسلامی غزوات بتاتے ہیں کہ تلوار کی ہر حرکت یہاں آبِ حیات کا گھونٹ پلاتی ہے خلقِ خدا کو بسانے کی دُھن میں غازیوں کا اجڑنا، دشمنوں پر رحم و کرم کی بارش اور اس طرح کے دل پذیر واقعات اسلامی غزوات کا سرمایہ ہیں۔ پڑھئے اور سبق حاصل کیجئے۔

قیمت: ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے

تاج بہشتی زیور مکمل و مدلل

مولانا اشرف علی تھانوی کے اس اسلامی انسائیکلو پیڈیا کے بارے میں یہ کہا جائے تو بجا ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ کے بغیر کوئی مسلمان حقیقی معنوں میں مسلمان نہیں بن سکتا۔ ایک مسلمان کے پیدا ہونے سے مرنے تک کے تمام ضروری مسائل شرعیہ اس عظیم کتاب میں ملیں گے۔ قیمت: ۱۵ روپے

مکتبہ دینیات، آصف علی روڈ۔ نئی دہلی

آج فروخت کے لحاظ سے سب سے بلند ہے

لومانہ صرف پورے طور پر
بالوں کو کالا کرتا ہے بلکہ نہایت عمدگی
کے ساتھ سنوارتا بھی ہے۔ اسی لئے تو سارے
ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں زیادہ سے زیادہ
لوگ، جوان، بوڑھے، مرد اور عورتیں،
سبھی کسی اور بال کالا کرنے والی
چیز کے بجائے
لوما ہی استعمال کرتے ہیں۔

لوما
REGD.

دنیا بھر میں مانا ہوا بال کالا
کرنے والا

سول ایجنٹس:
ایس۔ ایس۔ کھمبات والا
احمد آباد نمبر ۱
ایجنٹس:
سی۔ نروتم اینڈ کمپنی
بمبئی نمبر ۲

AMAR.P.S.

دہلی ایجنٹ: دہلی میڈیکل اسٹور۔ چاندنی چوک۔ دہلی ۶
ایکسپورٹ کرنے کے لئے ایم۔ ایم کھمبات والا احمد آباد ۱ کو لکھئے

دستکِ نیم شب

راجہ مہدی علی خاں

کھٹکھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول!
اے میری روٹھی ہوئی بیوی ذرا منہ سے بول!
رات کو دیر سے آنا میری عادت ہی سہی
میرا ہر عیب چھپانا تیری فطرت ہی سہی
میری راحت کے لئے تھوڑی سی زحمت ہی سہی
حرفِ اُلفت نہ سہی حرفِ ملامت ہی سہی
شیریں آواز کا کانوں میں میرے اب رس گھول!
کھٹکھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول!

شک نہ کر مجھ پہ میری جان سے پیاری ممتاز
پڑھ رہا تھا کسی مسجد میں تہجد کی نماز
ایک ہی صف میں کھڑے تھے وہاں محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ وہاں تھا نہ کوئی بندہ نواز
میرے ہی گھر سے نہ کر ہائے میرا بستر گول!
کھٹکھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول!

پھول اک روز تیرے پیار کے توڑے میں نے
کھائے والد سے تیرے عشق میں کوڑے میں نے
مرمریں ہاتھ تیرے پھر بھی نہ چھوڑے میں نے
بحرِ سُسرال میں دوڑا دئے گھوڑے میں نے
اپنے ماضی کی ترازو میں میری صورت تول
کھٹکھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

"عشرتِ بیوی" ہے شوہر میں فنا ہو جانا
نہ کہ ہر بات میں شوہر سے خفا ہو جانا
یک بیک رحم و مروّت کا ہوا ہو جانا
یاد آیا ہمیں بیوی کا خدا ہو جانا
پر خدا کو کبھی نہیں بندوں پہ اتنا کنٹرول
کھٹکھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

تجھ کو میری ہی قسم ختم کر اب تو یہ سوانگ
رات کو کھیل نہ غصّے کی یہ پیاری پنگ پانگ
اونچی دیوار سے کودا تو سرک جائے گی ٹانگ
"مجھ سے پہلی سی محبت میری ممتاز نہ مانگ"
اور بھی فکریں ہیں بیوی کی محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں پیار کی راحت کے سوا
کیسے کر سکتا ہوں دن رات میں مجنوں کا رول
کھٹکھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کھٹکھٹاتا ہی رہوں گا میں سحر ہونے تک
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
میں بھی جیتا ہوں محلّے کو خبر ہونے تک
آج اتر جائے گا شاید میری عزّت کا خول
کھٹکھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

اچھا جاتا ہوں مجھے دل سے بھلا دینا تم
یاد بھی آؤں تو دو اشک بہا لینا تم
ننھے بچّوں کو پنگوڑے میں سُلا دینا تم
ختم راشن ہو تو بنئے سے منگا لینا تم
آج نادم ہوں کہ کیوں تم سے پڑھائے دو بول
اب نہیں تجھ سے کہوں گا میں کہ دروازہ کھول

دستکِ شبِ غم

طاہرہ سلطانہ
(راجہ مہدی علی خاں کی نظم کے جواب میں)

رات کے ایک بجے کہتے ہیں " دروازہ کھول!
اے میری رُوٹھی ہوئی بیوی ذرا مُنہ سے بول!"

آپ کے عیب چھپانا، میری عادت ہی سہی
سرِ تسلیم جھکانا، میری فطرت ہی سہی
آپ کو راہ پہ لانا، میری حسرت ہی سہی
لب پہ شکوہ بھی نہ لانا، میری راحت ہی سہی
آج دروازہ نہ میں کھولوں گی ہو جایئے گول
رات کے ایک بجے کہتے ہیں "دروازہ کھول!"

مر چکی "جانِ ادا" ـــــ آپ کی "پیاری" "ممتاز"
پڑھئے جاکر "اُسی" چوکھٹ پہ محبت کی نماز
جائیں چولھے میں رقیب آپ کے ـــ محمود و ایاز
بے وقوف آپ سمجھئے نہ مجھے، بندہ نواز!
پیٹئے جاکے چوراہے میں شرافت کا ڈھول
رات کے ایک بجے کہتے ہیں "دروازہ کھول!"

میں بھی جاکر جو کلبوں میں کیا کرتی ڈانس
میں بھی مَردوں سے کیا کرتی یُوں ہی گرُ دانس
لے کے آتی جو میں شیپین میں ڈوبی ہوئی سانس
کیا مجھے آپ دیا کرتے معافی کا چانس؟
رہیئے خاموش کہیں کھول نہ دوں آپ کی پول
رات کے ایک بجے کہتے ہیں "دروازہ کھول!"

زورِ بازو سے میں اب ختم کروں گی یہ سوانگ
نہ کلب ہوگی، نہ مِس روزی، نہ ہوگی پنگ پانگ
میں ہوں ممتاز اگر، رائٹ کروں گی ہر رانگ
مجھ سے پہلی سی رعایت میرے محبوب نہ مانگ
نہ ملا آپ کو کچھ اُلفتِ گوہر کے سِوا
گھر میں موجود سبھی چیزیں ہیں شوہر کے سوا
کب تلک آپ یہ فرمائیں گے مجنوں کا رول
رات کے ایک بجے کہتے ہیں "دروازہ کھول!"

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
میں بھی دروازہ نہ کھولوں گی سحر ہونے تک
گھر میں آپ آنہ سکے "رقصِ قمر" ہونے تک
میں بھی اس گھر میں ہوں ڈیڈی کو خبر ہونے تک

آپ کھونے کو ہیں اِک روز یہ ہیرا انمول
رات کے ایک بجے کہتے ہیں "دروازہ کھول!"

کہنا روزی ہی کو اب "جانِ ادا" میرے بعد
چھائے گی اُن کٹی زلفوں کی گھٹا میرے بعد
گھر میں گھُس آئیں گے سب "اہلِ وفا" میرے بعد
رہنا آرام سے تم اور چچا میرے بعد
آپ جیسوں پہ کرے کوئی کہاں تک کنٹرول
رات کے ایک بجے کہتے ہیں "دروازہ کھول!"

دِل کے اسٹیج پہ روزی کو نچا لینا تم
اُس کے کتّوں کو بھی سینے سے لگا لینا تم
اپنی دولت بھی جُوئے میں ہرا لینا تم
سبھی کچھ ہار کے بیوی کو مُنا لینا تم
میں بھی پچھتائی بہت، تم سے پڑھا کر دو بول
رات کے ایک بجے کہتے ہیں "دروازہ کھول!"

میں ہی جانوں مری شب کیسے بسر ہوتی ہے
پڑھ کے اشعار یہ، ممتاز بہت روتی ہے:
"پھر وہ آئے دلِ بے زار؟ نہیں کوئی نہیں
ہوگا گیدڑ یہ، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، اُترنے لگا ننھے کا بخار
میونسپلٹی نے بجھا ڈالے ہیں سڑکوں کے چراغ
اپنے گیراج میں سوتی ہے ہر اِک موٹر کار
سی۔ آئی۔ ڈی کو نہ ملے اُف تیرے قدموں کے سُراغ
بھاڑ میں جائیں یہ اُن کے مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کِواڑوں کو مقفّل کر لوں
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔"

"پنچھی" اُسرال سے اُڑنے کے لئے اب پر تول
رات کے ایک بجے کہتے ہیں دروازہ کھول

نینا کاشش

مہاسے اور کیل

اکثر بہنیں مہاسوں اور کیلوں کے داغوں کی وجہ سے بہت پریشان اور فکرمند رہتی ہیں۔ ان کی یہ فکر اور پریشانی کافی حد تک بجا بھی ہے، کیونکہ یہ داغ چہرے کی ساری جاذبیت اور دل کشی کو تباہ کر دیتے ہیں۔ ہر بہن کی یہی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ مہاسوں اور کیلوں کو فوراً دور کرنے کا کوئی علاج معلوم ہو سکے

لیکن درحقیقت مہاسوں اور کیلوں کو فوراً یا جلد دور کرنے کا کوئی علاج نہیں ہے۔ معمولی داغ یا دھبے تو بعض مرتبہ ایک یا دو ہفتہ کے صحیح علاج سے دور ہو سکتے ہیں، مگر مہاسوں اور ان کے داغوں کا سوال بالکل دوسرا ہے ان کا فوری سدِباب تو ڈاکٹری علاج یا کسی بیوٹی سپیشلسٹ (ماہر حسن) کی مدد سے ہی ہو سکتا ہے بیوٹی سپیشلسٹ کے بتائے ہوئے طریقے سے بہت سا وقت اور پیسہ بچ سکتا ہے اور اس شکایت سے بہت حد تک چھٹکارا ہو سکتا ہے۔

اس سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا کہ ان مہاسوں اور کیلوں کی وجہ کیا ہے، یعنی یہ پیدا کیوں ہوتی ہیں؟ طبی تحقیقات سے ثابت ہے کہ چہرے کی جلد کی خشکی، زیادہ ترش، میٹھی، چرچری اور چربی والی اشیاء خوردنی کا استعمال اور تیل بنانے والے گلینڈز (غدود) کا ضرورت سے زیادہ کام کرنے لگنا، وغیرہ ہی مہاسوں اور کیلوں کے پیدا ہونے کی وجوہ ہیں۔ لہٰذا قبض سے بچنا اور کھانے پینے میں احتیاط اور پرہیز سے کام لینا ہی ان کا بہترین علاج ہے۔

جسم میں تیل بنانے والے غدود کے ضرورت سے زیادہ کام کرنے لگنے کی صورت میں جلد کی سطح پر جو زائد تیل یا چکنائی آجاتی ہے، اُسے دور کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ عام نہانے کے صابن اور پانی سے چہرے کو دن میں کئی بار دھویا جائے۔ اگر کسی نرم برش یا اسفنج وغیرہ کی مدد سے دھویا جائے تو یہ شکایت کافی حد تک دور ہو سکتی ہے۔ جلد کی صفائی کے علاوہ صابن اور پانی ایک اور بھی کام کرتے ہیں۔ صابن کے اثر سے اوپر کی مردہ جلد اتر جاتی ہے اور اس طرح سے بند مساموں کا مونہہ کھل جاتا ہے۔ صابن کا استعمال سیاہ کیلوں کو بھی صاف کرنے میں مدد دیتا ہے۔ سیاہ مونہہ کی کیلوں کا درست کرنا ضروری ہے۔ اگر احتیاط سے ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے تو تھوڑی سی مشکل سے یہ کام ہو سکتا ہے۔ آپ کسی کیمسٹ کی دُکان سے تھوڑی ہی قیمت میں کیلوں کو دور کرنے کا آوزار (METAL ROD) خرید سکتی ہیں۔ یہ تین انچ لمبا ہوتا ہے اور اس کے دونوں سروں پر گول سوراخ ہوجاتے ہیں۔

سب سے پہلے تو چہرے کی جلد کو گرم اور نرم بنانا چاہیے اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک تولیہ کو ابل دے کر اس کا درمیانی حصہ گرم پانی میں بھگو دیا جائے اور پھر اس کو نچوڑ کر چہرے کے اس حصے پر تھپتھپانا چاہیے، جہاں کہ سیاہ کیل نکلے ہوئے ہیں۔ اور جب تک تولیہ گرم رہے، اسی طرح رکھنا چاہیے۔ ہر رات کو پانچ

دس منٹ یہ عمل کرنا ضروری ہے۔ اس عمل کے درمیان میں اگر تولیہ ٹھنڈا ہو جائے تو اس کو دوبارہ گرم کر لیا جائے۔ بھاپ جلد کے مسامات کو کھول دیتی ہے اور چکنائی نکالنے والے سخت حصوں کو نرم بناتی ہے جس کی وجہ سے سیاہ کیل پیدا ہوتے ہیں اس عمل کے بعد اس اوزار کا گول موٹھ کیل کے اوپر رکھ کر آہستہ آہستہ اور احتیاط سے دبانا چاہیے، تاکہ کیل سے وہ سیاہ مادہ نکل آئے اگر یہ عمل احتیاط سے کیا جائے تو جلد کو نقصان نہیں پہنچتا اور ذرا سی پریکٹس سے پانچ منٹ کے اندر اندر اس آوزار کے ذریعے بہت سے سیاہ کیل نکالے جا سکتے ہیں۔ روزانہ اس عمل کے بعد اصل اوزار کو پانی میں اُبال لینا ضروری ہے۔ اکثر اوقات سیاہ کیل مہاسوں کی بہتات کی وجہ سے ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں ان کا دور کرنا اشد ضروری ہے۔ گہرے اور بڑے بڑے کیل اس طریقے سے دور ہونے مشکل ہیں۔ انہیں دور کرنے کے لئے کسی ماہر کی خدمات حاصل کریں۔

اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کی جلد تندرست اور اچھی حالت میں رہے تو آپ کو چاہیے کہ اپنے ہاتھوں کو چہرے کی جلد سے حتی الامکان دور رکھیں یعنی ہر وقت کیلوں یا مہاسوں کو دباتے رہنا یا چہرے کو مسلتے رہنا انتہائی مضر ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جب چہرے پر موٹا سا مہاسہ پیدا ہوتا ہے، تو طبیعت کی بھینی پیدا ہو جاتی ہے، کہ کسی طرح جلد سے جلد اس کو دور کیا جائے۔ مگر مہاسوں کو دباتے رہنا اس مرض کو زیادہ ہی بڑھاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں اپنے آپ پر جبر اور کنٹرول کرنے کی عادت ڈالنی چاہیئے، کیونکہ پھر اس نامراد عادت کا چھوٹنا محال ہو جاتا ہے۔

سورج کی کرنیں مہاسوں کو دور کرنے کا ایک پرانا اور مانا ہوا طریقہ ہے۔ سورج کی کرنیں طاقت کا منبع ہوتی ہیں، اور ان سے جسم میں وٹامن ڈی پیدا ہوتے ہیں۔ مگر ہر چیز میں ایک توازن ہونا لازمی ہے۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ گھنٹوں دھوپ میں لیٹا جائے، بلکہ پندرہ منٹ سے آدھے گھنٹے تک سورج کی گرمی کو جذب کرنا ہی بہت کافی ہے۔ سن باتھ یعنی "دھوپ کا غسل" کرنے کے بعد صابن اور پانی سے چہرے کو اچھی طرح دھونا چاہیئے، کیونکہ سورج کی گرمی سے تیل کے غدود پوری تیزی سے اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ اس لئے اس زائد تیل کو صاف کرنا ضروری ہے۔ یہ بات یاد رکھئے کہ صرف سن باتھ ہی مہاسوں کا علاج نہیں ہے بلکہ دوسری تدابیر کے ساتھ ساتھ یہ بھی اس شکایت کو دور کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

چہرے کی جلد کی خشکی کو کریم یا تیل وغیرہ کے مناسب استعمال سے دور کیا جا سکتا ہے۔

جلد کی حفاظت کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی چہرے کو مہاسوں سے بچایا جا سکتا ہے، جن میں سے ایک یہ ہے کہ الگ ایسی خوراک کھانی چاہیئے جس میں کافی غذائیت موجود ہو۔ ہر انسان کا الگ مزاج اور طبیعت ہوتی ہے، لہٰذا سب کے لئے کوئی ایک خوراک مقرر نہیں کی جا سکتی۔ مگر مہاسوں کے پیش نظر ایک عام اصول وضع کیا جا سکتا ہے کہ ایسی خوراک سے پرہیز کیا جائے، جس میں مٹاریج (نشاستہ) مٹھاس اور چربی کی بہت زیادہ مقدار شامل ہو۔ زیادہ پروٹین والی چیزیں کھانا بہت فائدہ مند ہے۔ اگرچہ پروٹین چکنائی کے برابر قوت نہیں پہنچا سکتی، مگر اس کا اپنا ایک الگ مقصد اور فائدہ ہوتا ہے۔ لہٰذا خوراک میں اس کا زیادہ حصہ شامل ہونا ضروری ہے۔

پروٹین زیادہ تر گوشت، مچھلی، دودھ، انڈہ اور خشک میووں میں پائی جاتی ہے اور یہ کھائی بھی با افراط جا سکتی ہے۔ اس کے زیادہ استعمال سے خوراک میں رہ جانے والی کمی پوری ہو جاتی ہے اور گھی تیل جیسی چکنائیاں چھوڑنے سے جو نقصان ہوتا ہے اس کی بھی تلافی ہو جاتی ہے۔ دودھ میں پروٹین کا بہت بڑا حصہ شامل ہوتا ہے اور چکنائی بھی مناسب مقدار میں موجود ہوتی ہے۔ دودھ ایک ضروری خوراک ہے اور اگر میسر ہو تو کم از کم دو گلاس روزانہ ضرور پینا چاہیئے۔ اگر آپ چاہیں تو کریم نکالا ہوا دودھ بھی استعمال کر سکتی ہیں تاکہ چکنائی بالکل نہ آئے۔ دودھ میں نہ صرف پروٹین زیادہ ہوتی ہے بلکہ اس میں کیلسیم اور فاسفورس بھی موجود ہوتا ہے اور یہ دونوں ہی جسم کی نشوونما کے لئے انتہائی ضروری ہیں۔

اگر آپ کی جلد صحت مند ہو رہی ہے اور آپ اپنی زندگی میں خوشی محسوس کرنے لگی ہیں۔ مگر اس دوران میں ایک صبح آپ دیکھتی ہیں کہ چہرے پر دوبارہ مہاسے اور نشان وغیرہ ابھر آئے ہیں، تو اس بات سے آپ پریشان اور مایوس نہ ہو جیئے کیونکہ مہاسوں کا اپنا ایک اتار چڑھاؤ ہوتا ہے، جس پر آپ کنٹرول نہیں کر سکتیں۔

یاد رکھنے کی کوشش کیجئے کہ پچھلے دنوں آپ کھانے پینے کی جس چیز میں زیادتی کرتی رہی ہیں۔ خوراک کے سلسلہ میں دوبارہ احتیاط برتنا شروع کر دیں اور جلد کے بالکل صحت یاب ہونے تک احتیاط برتتی رہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ سدا ہی ان چیزوں کے استعمال میں احتیاط سے کام لیں۔ کئی مرتبہ مہاسوں کی زیادتی بغیر وجہ کے ہو جاتی ہے، تو ایسی صورت میں آپ کو گھبرانا یا مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ خود بخود ختم ہی ہو جائینگے آپ اپنا دھونے کا عمل جاری رکھیں۔ فائدہ ہوتا رہے گا پانی خوب پئیں اس مرض سے الجھن اور تشویش تو بہت ہوتی ہے، مگر اس سے لڑنے کے لئے صبر کی ضرورت ہے۔

صحیح تدابیر، خوراک اور مسلسل کوشش سے آپ اس مرض پر پوری طرح قابو پا سکتی ہیں اور آپ کے چہرے کی جلد پھول کی مانند ہو سکتی ہے۔

ہر دل عزیز بننے کے اصول

ظفر واسطی

(ہر کسی کو کوئی نہ کوئی ضرور پسند کرتا ہے۔ وہ لمحات ہماری زندگی کے تاریک ترین لمحات ہوتے ہیں۔ جب ہم تنگ آکر کہہ اُٹھتے ہیں کہ "کوئی ہم سے محبت نہیں کرتا۔ سب ہم سے نفرت کرتے ہیں"۔ لیکن کچھ آدمی بڑی آسانی سے ہر کسی کے ساتھ "گزارا" کر لیتے ہیں اور بعض آدمیوں کے لئے ایسا کرنا سخت مشکل ہوتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ آدمی شرمیلے، سست الوجود اور پریشان خاطر ہوتے ہیں۔ بہر حال وہ اپنے بہترین اوصاف کو چھپائے رکھتے ہیں اور بری باتوں کو ظاہر کرتے رہتے ہیں اور یہ بہت افسوس کی بات ہے کیونکہ بری بات کی جگہ اچھی باتیں ظاہر کرنے کی ہوتی ہیں۔ اور یہ تو مسلمہ امر ہے کہ فراخ دلی، مہر و محبت اور نیک اخلاق ہی ہیں جو آدمی کو ہر دل عزیز بناتے ہیں۔

ہم نے بہت سے قابل اور لائق لوگوں سے ہر دلعزیز اور مقبول ہونے کے متعلق اپنے تجربات ظاہر کرنے کی درخواست کی تھی۔ ان لوگوں میں تین بہت نامور ہستیاں بھی تھیں ان سب نے اپنے تجربات اور خیالات سے مستفید ہونے کا ہمیں موقع دیا جس کے لئے ہم اُن سب کے ممنون ہیں۔ ذیل میں انہی کے خیالات کا لبِ لباب درج ہے۔ (واسطی)

۱۔ اپنے چہرے پر ہر وقت ایک پُر وقار اور دلکش تبسم پیدا کئے رکھئے۔

۲۔ کسی کو بُرا نہ کہئے۔ نہ مونہہ پر نہ پیٹھ پیچھے۔

۳۔ جہاں تک ہو سکے کسی سے کوئی چیز اُدھار نہ مانگئے۔ اگر مجبوری سے مانگنی ہی پڑے تو ضرورت کے بعد فوراً واپس کر دیجئے۔

۴۔ دوسرے لوگوں کو ان کے مزاج کے مطابق اپنے آپ کو سمجھنے کا موقع دیجئے۔ اور وہ آپ کو پسند کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

۵۔ کوئی بھی تقریب ہو اُسے پر مسرت بنانے کی انتہائی کوشش کیجئے۔ کیوں کہ دعوت دینے والی ہستی نے آپ کو یہی لکھا تھا یا کہا تھا کہ آپ کی شمولیت باعثِ مسرت ہوگی۔

۶۔ کسی کے کام کی یا بات کی تعریف کرنا اچھا ہے لیکن تعریف کے فوراً بعد اگر اپنی کوئی ضرورت بیان کرنی ہو تو بہتر ہے کہ تعریف نہ کی جائے۔

۷۔ کسی کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے بھی آپ اپنے بعد خوشگوار تاثر چھوڑ سکتی ہیں۔ لیکن کسی قسم کی بحث میں بدتمیزی سے ہرگز کام نہیں لینا چاہئے۔

۸۔ بات کہنے والی کی بات دلچسپی سے سنئے اور جو شرمیلی ہو اس کی ہمت افزائی کیجئے۔

۹۔ شیخی بگھارنا کوئی تعریف کی بات نہیں۔ اس سے دوسرے اکتا جاتے ہیں۔

۱۰۔ دوسروں کو اچھا سمجھئے جب تک کہ وہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت نہ کر دیں۔

۱۱- ہمیشہ ایسا رویہ اختیار کیجئے کہ دوسرے اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگیں ایسی کوشش بھی نہ کیجئے کہ وہ آپ کے مقابلے میں خود کو چھوٹا سمجھیں۔

۱۲- تحفہ سے خلوص اور محبت کا اظہار ہوتا ہے خواہ معمولی قیمت کا ہو یا زیادہ قیمت کا۔

۱۳- اگر آپ کی پسند دوسروں سے مختلف ہے تو اس کے اظہار سے نہ ڈریئے اگر ہم سب کی ایک جیسی پسند ہوتی تو یہ دنیا بہت غیر دلچسپ ہوتی۔

۱۴- اگر آپ کوئی لطیفہ دس بار سن چکی ہیں اور اب گیارھویں مرتبہ سننے لگی ہیں تو بھی بہتر ہے کہ مسکراتی رہئے اور سنانے والی کی خوشی خاک میں نہ ملایئے۔

۱۵- اگر کسی کی دلیل سے آپ قائل ہو جاتی ہیں تو اُسے کشادہ دلی سے بتا دیجئے

۱۶- اگر آپ کو کوئی کھانا پسند آتا ہے تو اس کے پکانے والی کی تعریف کرنا نہ بھولئے

۱۷- اپنے قصّے مختصر اور موضوع سے متعلق رکھئے۔ ممکن ہے کہ دوسرے بھی اپنا قصّہ بیان کرنا چاہتے ہوں۔

۱۸- اگر آپ کو کسی بات سے واقعی تکلیف پہنچی ہے تو ناراض ہونے سے اور زیادہ پہنچے گی۔

۱۹- اگر کوئی آپ سے کہے کہ آپ کے مزاج کیسے ہیں۔ تو اس نے آپ سے آپ کی تکالیف کی فہرست نہیں پوچھی۔

۲۰- اگر کسی اختلافی مسئلہ پر گفتگو چھڑ جائے تو نرم گفتاری اور مزاج اور زبان پر قابو آپ کے بہترین مددگار ثابت ہوں گے۔

۲۱- دوسروں کی کوتاہیوں پر ہنسنے سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

۲۲- کوئی کھیل ہو، جب آپ ہاریں تو بھی اپنا مزاج خوش رکھئے اور جیتیں تو بھی۔

۲۳- ہر کسی سے اخلاق سے پیش آیئے۔ صرف اہم لوگوں ہی سے اخلاق سے پیش آنا خوش خلقی نہیں۔

۲۴- آپ نے کسی نئی پڑوسن یا محلّے والی کے متعلق بہت کچھ سنا ہے تو اس کے متعلق اچھی باتوں کو یاد رکھئے اور بُری باتوں کو بھول جایئے۔

۲۵- دوسرے لوگوں کو بھی مدد کرنے کا موقع دیجئے صرف آپ ہی وہ ہستی نہیں ہیں جو ہمیشہ شکرئے کی مستحق تصوّر کی جائیں۔

۲۶- اپنی تکلیفیں دوسروں سے مت کہئے۔ اور اپنی سہیلیوں اور دوستوں کو ٹوٹے ہوئے دل کے لئے مرہم کے طور پر استعمال نہ کیجئے۔

۲۷- اگر کوئی پڑوسن یا رشتہ دار کہیں چلی جائے تو اسے اپنی زندگی سے خارج کر دینا اچھا نہیں۔ کبھی کبھی ایک آدھ خط لکھ دینا دوستی اور محبت کو سلامت رکھتا ہے۔

۲۸- دوسروں کے اعتماد کو کبھی نقصان نہ پہنچایئے اور خود ہر کسی کو اعتماد میں نہ لیجئے۔

۲۹- مناسب موقع پر رحم کھانا اچھا ہے۔ لیکن یہ رحم کا جذبہ بعض دفعہ دوسرے کے دل میں نفرت بھی پیدا کر سکتا ہے۔

۳۰- تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ لیکن تالی بجانے والے دو ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ بننے سے ہمیشہ پرہیز کیجئے۔

۳۱- اگر دوسرے لوگ آپ پر تکلیف اور پریشانی میں بھروسہ کر سکتے ہیں تو آپ کو دوستوں کی کبھی کمی نہ ہوگی۔

۳۲- "کیو" ہمیشہ ہر کسی کو اس کا جائز حق دینے کے لئے لگائے جاتے ہیں۔ جو لوگ "کیو" سے آگے نکلتے ہیں وہ ہوشیار نہیں بلکہ خود غرض ہوتے ہیں۔

۳۳- اگر آپ کی سہیلی دل شکستہ ہے تو اُسے اپنی کسی نئی کامیابی کا قصہ سنانا بے دردی ہے۔

۳۴- آپ کے بچّوں کی عقلمندیوں اور چالاکیوں کے طویل قصّے صرف قریبی رشتہ داروں کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔

۳۵- اپنی عمر کی مناسبت سے کام کرنے سے لوگ آپ کو زیادہ پسند کریں گے۔ خواہ آپ سترہ برس کی ہوں یا ستر برس کی۔ ہر عمر میں دوسروں کے فائدے کے کام کئے جا سکتے ہیں۔ ایک چھوٹی بچی اگر نصیحتیں کرنے لگے یا ایک بڑھیا بچوں کی سی باتیں کرنے لگے تو یہ دو چار منٹ کے لئے تو دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے۔ مگر دلچسپی اتنی دیر پا نہیں ہوتی جتنا کہ خلوص۔

۳۶- اگر دوسرے گھر میں ریڈیو یا روتا ہوا بچہ آپ کے کام میں ہرج ڈالے تو نرمی سے اس بات کو اشارے میں بتا دینا زیادہ مفید ہوتا ہے۔ بجائے اس کے کہ غصّہ سے منع کیا جائے۔

۳۷- کسی کے یہاں بغیر اطلاع کئے کبھی نہ جایئے جب تک کوئی مجبوری نہ آپڑی ہو۔

۳۸- اگر آپ کو کوئی ایسی سوغات دی گئی ہے جس سے کہ آپ کو مایوسی ہوئی ہے تو اپنی مایوسی ظاہر نہ ہونے دیجئے۔

۳۹- یاد رکھئے کہ جو بھی آپ سے ملتی ہے وہ اس کوشش میں ہوتی ہے کہ آپ پر اپنا اثر چھوڑ کر جائے۔

۴۰- دوسرے کی غلطی پر اُس کے اظہار افسوس اور معافی طلبی کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیا کیجئے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو بھی اس سے کسی بات پر معافی

مانگنی پڑ جائے۔

۴۱۔ جب کوئی سہیلی آپ کو کوئی چیز خریدنے کے لئے بازار لے جائے تو اپنا دھیان اس کے کام کی طرف رکھئے۔ بازار جا کر سارا وقت اپنی ضرورت کی چیزیں خریدنے میں صرف نہ کیجئے۔

۴۲۔ دروازے گزرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ ان میں کھڑی ہو کر اپنی سہیلیوں سے لمبی باتیں نہ کیجئے۔

۴۳۔ اگر آپ نے کلب میں یا کسی اور تقریب کے موقع پر کوئی کام کرنے کی پیشکش کی ہے تو وقتِ مقررہ پر پہنچ کر وعدے کے مطابق کام شروع کر دیجئے۔

۴۴۔ اگر آپ نے کسی سے ملنے جانے کا، یا کوئی کام کرنے کا یا خط لکھنے کا وعدہ کیا ہے تو اُسے پورا کیجئے۔ اگر آپ ایسے وعدے بھول جانے کی عادی ہیں تو اپنے رُومال یا کسی اور چیز میں گرہ دے لیجئے۔

۴۵۔ اگر آپ کو کسی کی مدد کرنے کے سلسلے میں کوئی تکلیف اٹھانی پڑی ہے تو اپنی تکلیف ظاہر نہ ہونے دیجئے۔

۴۶۔ اگر آپ کو کبھی ٹیکسی، بس یا تانگہ کا کرایہ اُدھار لینے کی ضرورت پڑے تو اسے واپس دینا نہ بھولئے۔ قرض قرض ہی ہوتا ہے خواہ کم ہو خواہ زیادہ

۴۷۔ اگر آپ کو کسی سہیلی یا دوست کا نیا گھر یا باغیچہ دیکھنے کا اتفاق ہو تو ضرور اس کے حسنِ ذوق کی تعریف کیجئے۔ کارآمد اور مفید تجویزیں پیش کرنے کی بعد میں باری آنی چاہیئے۔

۴۸۔ کسی کو نصیحت اس وقت کرنی چاہیئے جب کہ خاص طور پر اس کا تقاضہ کیا گیا ہو۔ ورنہ بہترین مدد جو آپ دے سکتی ہیں یہ ہے کہ صبر کے ساتھ غم کی کہانی سنتی رہیئے۔

۴۹۔ اگر آپ کو جُندے یا بالوں میں لگانے کی پن یا کوئی اور چیز تحفے میں دی گئی ہے تو بہتر یہی ہے کہ اس کے بعد جب آپ تحفہ دینے والے یا والی سے ملیں تو وہ چیز پہن کر ملیں۔

۵۰۔ جب آپ کچھ خریدنے جائیں تو سوچ سمجھ کر چیزوں کا انتخاب کیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ پہلے ایک چیز پسند کی پھر اس کے بدلے کوئی اور چیز، پھر اس کی بجائے کوئی اور۔ دوکان دار بدخلقی سے تو ممکن ہے کہ پیش نہ آئے لیکن دوسری مرتبہ جب آپ اس کی دوکان پر جائیں گی تو وہ آپ کی طرف کم توجہ دے گا۔

۵۱۔ اگر کسی نے آپ کے ساتھ اچھا سلوک کیا ہے تو اس کے متعلق اپنے دوستوں اور عزیزوں کو بتایئے لیکن اگر آپ نے کسی سے اچھا سلوک کیا ہے تو اس کی خبر پھیلانے کا کام دوسروں پر چھوڑ دیجئے۔

۵۲۔ دوستوں کو اُن سے ملنے جانے سے پہلے آگاہ کر دینا بہتر ہوتا ہے خواہ آپ ان سے کتنی ہی بے تکلف کیوں نہ ہوں۔

۵۳۔ جب آدمی بیمار ہوتے ہیں تو دوست کا تیمارداری کو آنا بہت طاقت بخش ثابت ہوتا ہے۔

۵۴۔ کبھی کوئی نیک کام ضائع نہیں جاتا۔ نیک نامی لے کر آپ جس حلقے میں بھی جائیں گی بے حد مفید ثابت ہوگی۔

۵۵۔ کسی سے ناراض ہونا اچھا نہیں جب کہ اس کا مقصد آپ کو ناراض کرنا نہ ہو

۵۶۔ کسی پک نِک وغیرہ میں شریک ہونے سے پہلے سوچ لیجئے کہ اس کے اخراجات آپ برداشت کر سکیں گی یا نہیں۔

۵۷۔ اعتماد بھی ہر دلعزیزی پیدا کرتا ہے۔ اگر دوسرے لوگ یہ سمجھیں کہ وہ آپ پر اعتماد کر سکتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کی قدر اور عزت کرتے ہیں۔

۵۸۔ اگر آپ دوسروں کو اپنے یہاں بلاتی ہیں تو صرف ایسی میزبان نہ بنیئے جو کھانا پکاتی ہے اور بعد میں فوراً برتن دھوتی ہے وہ صرف کھانا کھانے کے لئے آپ کے یہاں نہیں آتیں بلکہ خلوص اور محبت کے لئے آتی ہیں۔

۵۹۔ اچھی گفتگو سادہ کھانے کو بھی خاصہ کی چیز بنا دیتی ہے۔

۶۰۔ کسی مہمان کو یہ محسوس نہ ہونے دیجئے کہ اسے بلانے کی وجہ سے آپ کو سارا گھر الٹ پلٹ کر دینا پڑا۔

۶۱۔ مہمانوں کو گھر کا نقشہ سمجھا دیجئے۔ یہ بات ان پر نہ چھوڑیئے کہ وہ آپ سے خود دریافت کریں کہ فلاں ضرورت کے لئے کہاں جائیں۔

۶۲۔ کسی دعوت میں بن بلائے مہمانوں کو نہ لے جایئے جب تک کہ میزبان سے دریافت نہ کر لیا جائے۔

۶۳۔ جب آپ اور آپ کی زندگی کا اہم ترین ساتھی کسی پارٹی میں ایک ساتھ شریک ہوں تو دوسرے لوگوں کو بھی اپنی توجہ کا مستحق سمجھئے۔

۶۴۔ جھوٹ بولنے سے ہمیشہ احتراز کیجئے اور سچ بات اگر تلخ ہو تو احتیاط سے کہئے

بیس برس سے کم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے

۶۵۔ اگر تم سب سوالوں کے جواب نہیں جانتے تو صاف تسلیم کر لینے میں زیادہ بہتری ہے بجائے اس کے کہ جھوٹ طور پر یہ ظاہر کرو کہ تم جانتے ہو۔

۶۶۔ شور اور بلند قہقہوں سے تم دوسرے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہو

لیکن انہیں متاثر نہیں کر سکتے۔

۶۷۔ تم سے زیادہ عمر کے آدمی تمہارے نقوش کی تروتازگی پر رشک کرتے ہیں تو اس تروتازگی کو "میک اَپ" کی تہوں کے تلے دبانا اچھا نہیں۔

۶۸۔ اگر تم کسی محفل میں پہلی مرتبہ چائے بنانے لگے ہو تو خود اعتمادی سے بناؤ ہو سکتا ہے کہ تم بہترین چائے بنانے والے ثابت ہو۔

۶۹ اپنے سے بڑی عورت کو جگہ دینا صرف مردوں ہی کا اخلاقی فرض نہیں۔ نوجوان لڑکیاں بھی ایسا کر کے اپنے لئے تعریف و توصیف کا سبب پیدا کر سکتی ہیں۔

۷۰۔ کسی ایک سہیلی یا دوست سے دوستی کا یہ مطلب نہیں کہ باقی سب سے کنارہ کشی اختیار کر لو۔

۷۱۔ یاد رکھو کہ تمہاری سہیلی یا دوست کے ذرائع آمدنی لامحدود نہیں ہیں۔ اسے کبھی فضول خرچی نہ کرنے دو۔

۷۲۔ تمہارا گھر ہوٹل نہیں ہے۔ اُسے صرف کھانے اور سونے کی جگہ نہ سمجھو۔

۷۳۔ اپنے والدین سے دل کی باتیں بتا دیا کرو۔ وہ اس بات سے خوش ہوا کریں گے اور اُن کی نصیحتوں پر عمل کرو۔

۷۴۔ اپنے طریقے پر خدائی عبادت ضرور کرو۔ ایسا کرنے سے برائیاں تم سے خود بخود بھاگیں گی۔

چشمہ اے آر خاتون کا نیا معاشرتی ناول

نجمہ کی باپ کے گھر سے رخصتی اور ڈولیوں کے درد بھرے گیت

کاہے کو بیاہی بدیس ....

نے اپنے پرائے سب کی آنکھوں میں آنسو جاری کر دیئے، دلہن کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی .... نجمہ کی رخصتی ہو گئی اور اس کے بعد نجمہ چشمہ سلمیٰ کی دل چسپ معاشرتی داستان شمع، افشاں، تصویر جیسے کامیاب ناول لکھنے والی اے۔ آر خاتون کے سحر آفریں قلم سے لکھے ہوئے اس معرکتہ الآرا ناول میں پڑھئے۔

صفحات ۸۹۶ گلیز عمدہ کاغذ، مجلد رنگین ڈسٹ کور

قیمت ۱۰ روپے ۷۵ نئے پیسے

بانو بک ڈپو، آصف علی روڈ۔ نئی دہلی

اسلامی اخلاق

اخلاص، عمل، سچائی، صبر و شکر، خوف و توبہ کے بہترین نتائج اور حسد و کینہ، ریا و دیگر بُرے عقائد و عمل کے بدترین نتائج پر سیر حاصل تبصرہ۔ جو شخص ان اسلامی اخلاق سے آراستہ ہو جائے اُسے گلدستۂ محفل کی طرح ہر نظر شرف قبولیت سے نوازیگی۔ قیمت: ایک روپیہ

اسلام کی بہادر بیٹیاں

ان خواتین کے حالات، جنہوں نے ابتدا اسلام میں ایمان لا کر اپنی پوری زندگی اسلام کی تبلیغ اور خدمت میں گذاری اور ہر محاذ جنگ پر زخمی مسلمانوں کی دیکھ بھال کے لئے موجود رہتی تھیں۔ اُن بہنوں کے حالات پڑھ کر اپنے جذبۂ ایمان کو تازہ کریں۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے

حضرت رابعہ بصری

حضرت رابعہ بصری کی زندگی، مذہب اور طریقت کی رُوح اور خدا شناسی کا ایک مکمل نصاب ہے جسے ہر خاتون کو ضرور پڑھنا چاہیئے۔ لڑکیوں کو جہیز میں دینے کے قابل کتاب۔ قیمت: ایک روپیہ

دربارِ رسالت کے فرمان

حضور سرورِ کائنات صلعم کے وہ فرمان جو آپ نے اپنی زندگی میں وقتاً فوقتاً اسلام اور انسانیت کے بلند مراتب کو سمجھانے کے لئے لوگوں کو بتائے ——— قیمت ۷۰ نئے پیسے

نصائح زرّیں

اسلاف اور بزرگوں کی سنہری باتیں، جن کا ایک ایک لفظ موتیوں میں تولنے کے قابل ہے۔
قیمت: ۴۰ نئے پیسے

اعمال قرانی

قرانی اعمال و وظائف کا بہترین مجموعہ، جس کو مولانا اشرف علی تھانوی نے مرتب کیا اور اعمال و وظائف کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ ان کی خاصیتیں بھی بتائی ہیں۔ ایک ایسی کتاب جس کی آج ہر گھر میں ضرورت ہے۔ قیمت ایک روپیہ

شرعی نماز

پانچوں وقت کی نماز اور رکعتوں اور دعاؤں کی تفصیل۔ عبادتِ خداوندی پر اس سے بہتر کوئی اور کتاب ابھی تک نہیں چھپی۔ قیمت: ایک روپیہ۔

مکتبہ دینیات، آصف علی روڈ، نئی دہلی

ہر کتاب کی قیمت ۳۱ نئے پیسے

شیخ چلی کا شاعرہ — خدا کی لاٹھی
چار نکھٹو — بدنصیب ناظمہ
آٹے کا پتلا — انوکھا مسافر
اسلم کے حیرت انگیز کارنامے — بھولا بچہ
میاں سُتھو — بغداد کا سوداگر
مسٹر گڈبڑ خاں — قومی خدمت گار
کہانی میں کہانی — کایا پلٹ
شہزادی قاش

ہر کتاب کی قیمت ۳۲ نئے پیسے

شہزادی گلنار — بھوتوں کا محل
شہزادی پروین — جادو کا شیر

ہر کتاب کی قیمت ۳۵ نئے پیسے

پرستان کی شہزادی — گم شدہ خزانہ
ایران کی شہزادی — چاند کی چوری
چین کی شہزادی — چوری کا ہار
غریب شہزادی — لنگڑی کتاب
چور شہزادی — ہلال کی کہانیاں
پریوں کی ملکہ — آخری شرارت
کالا چور — آخری خواہش
دو کام چور — تیسری آنکھ
اندھا جادوگر — چینی بُلبل
اندھا شہزادہ — چاند کی سیر
برفوں کی دنیا — برف کا آدمی
پاگل ڈاکٹر — بے وقوفوں کی کہانیاں
خونی دروازہ — بے وقوف بادشاہ
نیلی جادوگرنی — بادشاہ کا انعام

نیلی کھوپڑی — چندا ماموں
شیطان کا تحفہ — شہزادی گلبدن بیگم

ہر کتاب کی قیمت ۳۷ نئے پیسے

نقلی راج کماری — انوکھی چھتری
لاٹھی کا سانپ — ٹلو میاں
باز بہادر — پیسہ کا صابن
کہاوتوں کی کہانیاں: حصہ اول
حصہ دوم

ہر کتاب کی قیمت ۴۰ نئے پیسے

چوہوں کی حکومت — شیر کا انعام
بوڑھا بھوت — ظالم بلّی
خون کا دریا — شاہی چور
نرالا جانور — چار دن کا شہزادہ
بندروں کا تھیٹر — روشن پری
موٹر نمبر ۷۸۶ — دو شہزادیاں
سونے کا سیب — جادو کا مکان
سونے کی بگری — جادو کا ہاتھی
چاند کی دُلہن — جنگل کا شہزادہ
کالا موہنہ — چاندی کی گڑیا
ہیروں کا سوداگر — فقیر کی بیٹی
جادو کا ہار — طارق ابن زیاد
بے وقوف بندر — سوتیلی بیٹی
بے وقوف راجہ — سوتیلی بہن
ڈریوک چوہا — سنگ دل ملکہ
لکڑیوں کوں — نصائح زرّیں
سچے دوست — دربارِ رسالت کے فرمان
جادو کا اونٹ — ماں کا پیار

بہادر شہزادہ — غزالہ شہزادی
پھول پتے — ۴۴ نئے پیسے

ہر کتاب کی قیمت ۴۴ نئے پیسے

پری کا تحفہ — تین ہیرے
سمندر کی شہزادی — شیر کی بیٹی
چڑیا گھر — سرکس کے کھیل
خونی ڈاکو — اڑتا پہاڑ
انوکھا مقدمہ — بچوں کی محفل
مزدور کا بیٹا — پھول پتے (قطعات)
سمندری خزانہ

ہر کتاب کی قیمت ۴۵ نئے پیسے

سونے کی صندوقچی — چار بہنیں
جادو کا گلاب — سمندری خزانہ
جادو کی بنسری — شہزادے کو پھانسی

ہر کتاب کی قیمت ۵۰ نئے پیسے

جادو کا دروازہ — کھلو میاں
علی بابا کا غار — پانچ کھیل
ٹارزن — نئی کہانیاں
شیر دل — جھولے
اقوالِ زرّیں — صحابہ کی جانبازیاں
پری کی شرارت — تین شہزادے
چوری سینہ زوری — کھٹ پٹ
سوتیلی بیٹی

ہر کتاب کی قیمت ۷۵ نئے پیسے

چڑیوں کی الف لیلہ: حصہ اوّل، حصہ دوم

چڑیوں کی الف لیلہ: حصہ سوم، حصہ چہارم
نجومی آپا — موت کا غار

مختلف قیمتوں کی کتابیں

شریر لڑکا — ۵۵ نئے پیسے
مانو کے کارنامے — ۶۵ نئے پیسے
بھوتوں کا خزانہ — ۶۵ نئے پیسے
گھمیٹا کی بھنبھناشاہی — ۶۵ نئے پیسے
ارمان نبی — ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے
خطرناک دشمن — ۶۰ نئے پیسے
مغرور شہزادی — ۶۰ نئے پیسے
بچوں کی نماز — ایک روپیہ
اسلامی احکام — ۶۲ نئے پیسے
عقلمند شہزادہ — ۸۰ نئے پیسے
قرآنی دعائیں — ایک روپیہ
پیغمبری دعائیں — ایک روپیہ
اعمالِ قرآنی — ایک روپیہ
شرعی نماز — ایک روپیہ
روحوں کا انتقام — ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے
الٰہ درخت — ۲ روپے ۷۵ نئے پیسے
شمع کشیدہ کاری — ۴ روپے ۵۰ نئے پیسے
زینت کشیدہ کاری — ۵ روپے ۵۰ نئے پیسے
رشیدہ کی کشیدہ کاری — ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے
حسین کشیدہ کاری — ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے
دُلہن کشیدہ کاری — ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے
قدسیہ کشیدہ کاری — ایک روپیہ
شبنم کشیدہ کاری — ایک روپیہ
رائل کشیدہ کاری — ۲ روپے
کامیاب درزی خانہ — ۲ روپے

کھلونا بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی

ابو کی تصویر

گربچن سنگھ

ہاجرہ بیگم "زینت" کے تازہ شمارہ میں اپنے ننھے سلیم کی تصویر دیکھ کر پھولی نہیں سمارہی تھیں۔ جس صفحہ پر سلیم کی تصویر شائع ہوئی تھی۔ وہاں اور بھی کئی بچوں کی تصویریں تھیں۔ شمسہ کو قریب بلا کر انہوں نے کہا: "دیکھو شمسہ اپنے سلیم کی تصویر دیکھو۔ بالکل شہزادہ معلوم دیتا ہے نا.....؟"

شمسہ جھک کر تصویر دیکھنے لگی۔ واقعی ننھے سلیم کی تصویر دیگر بچوں کی تصویر کے بالکل درمیان میں تھی اور اس کی شان ہی نرالی تھی۔ وہ بنگلے کے باغیچے کے ایک گلاب کے پودے کے قریب کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گلاب کا ایک نوخیز پھول تھا۔

"ہاں بیگم!" وہ بیگم کی دل جوئی کرتی ہوئی بولی۔ "اپنے سلیم کی تصویر تو سب سے زیادہ خوب صورت ہے۔ سلیم کو لاؤں۔ دیکھو، وہ اپنی تصویر پہچانتا ہے یا نہیں؟"

"جاؤ لے آؤ!" بیگم مسکراتی ہوئی بولیں۔

شمسہ باہر باغیچے سے سلیم کو گود میں اٹھا لائی۔ اس کا اپنا بیٹا ابو بھی پیچھے پیچھے دوڑا چلا آیا۔ بیگم نے ممتا سے سلیم کا مونہہ چوم لیا: "یہ دیکھو بیٹا۔ اپنی تصویر تو دیکھو۔" انہوں نے تصویر پر انگلی رکھی۔

سلیم مبہم سی نگاہوں سے تصویر دیکھنے لگا۔ اس میں اس نے کوئی دل چسپی نہیں لی۔ کاغذ پر کالے کالے دھبے اور چھائیاں اس کے لئے بے معنی تھیں۔

بیگم سلیم کو گود میں لئے اپنے کمرہ میں چلی گئیں۔

شمسہ نے گہری سانس لی اور ابو سے بولی "جا بیٹا باہر جا کر کھیل.....؟" اور خود کمرے میں جھاڑو دینے لگی۔

ابو کی تصویر

دوپہر کے بعد جب بیگم آرام فرما رہی تھیں، شمسہ وہ رسالہ ہاتھ میں لئے بڑے غور سے اس میں بچوں کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ سلیم کی طرح دوسرے بچے اسے بڑے پیارے لگ رہے تھے کسی کی عمر دو سال کی تھی کوئی اس سے بھی چھوٹا، کوئی بڑا تین یا چار سال کا۔ اس کا ابو بھی تو چار سال کا ہونے کو آیا۔ سلیم کا ہم عمر ہے۔ کاش اس کی تصویر بھی ان بچوں میں ہوتی۔ پر غریب کی تصویر کیسے چھپے گی اس خوبصورت سے پرچے میں؟ تصویروں والے صفحہ میں، اوپر ایک کونے میں لکھا ہوا تھا "آپ بھی اپنے بچے کی تصویر بھیج سکتی ہیں۔ تصویر مفت شائع کی جائے گی۔"

شمسہ لفظ جوڑ جوڑ کر یہ عبارت پڑھنے لگی، لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکی اس کا خاوند باہر باغیچے میں پھولوں کی کچھ کیاریاں سجا رہا تھا۔ وہ اس کے پاس گئی اور جھک کر تصویروں والا ورق دکھاتی ہوئی بولی "لو دیکھو ـــــ سلیم میاں کی تصویر دیکھو۔۔۔۔"

رفیق تصویر دیکھنے لگا "واہ خوب! سلیم میاں تو شہزادے معلوم دیتے ہیں۔" وہ مسکراتا ہوا بولا "بھئی جج کا بیٹا ہے نا۔۔۔۔!"

"اپنا ابو کیا شہزادے سے کم ہے۔" شمسہ نے فوراً کہا "اچھا پڑھو تو تصویر کے نیچے کیا لکھا ہے۔۔۔۔؟"

رفیق آہستہ آہستہ پڑھنے لگا "سلیم ہاشمی ابن اکرم علی ہاشمی۔"

"اور اوپر یہ موٹے حروف میں کیا لکھا ہے۔۔۔۔" اوپر کی عبارت کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

رفیق پڑھنے لگا "آپ بھی اپنے بچے کی تصویر بھیج سکتی ہیں۔ تصویر مفت شائع کی جائے گی۔"

"مفت ـــــ؟" شمسہ کھل اٹھی "کیا ہمارے ابو کی تصویر چھاپیں گے اخبار والے۔۔۔۔؟"

"چھاپیں گے کیوں نہیں۔۔۔۔" رفیق بولا "لکھا تو ہے۔"

"پر چھاپیں گے کیسے ابو کی تصویر۔۔۔۔"

"تصویر بھیجنی پڑے گی۔" رفیق درمیان ہی میں بولا۔

"اے جی میاں صفدر سے کہو نا وہ اپنے کیمرے سے ابو کی تصویر کھینچ دیں۔" شمسہ بڑے بھولے پن سے بولی "انہوں نے ہی تو سلیم کا فوٹو کھینچا تھا۔ تم کہو نا ان سے۔"

"میرے کہنے سے کیا میاں صفدر ابو کی تصویر کھینچ دیں گے۔۔۔۔؟" رفیق نے شک ظاہر کیا۔

"اور نہیں تو کیا۔ کہہ کر تو دیکھو۔ چار بجے جب کالج سے آئیں گے تو کہو نا۔" شمسہ اپنی بات پر زور دیتی ہوئی بولی۔ "وہ ضرور کھینچ دیں گے۔"

"اچھا کہوں گا۔ اگر کھینچ دیں تو اچھا ہی ہے۔" کہتا ہوا رفیق اپنے کام میں جٹ گیا۔

شام کے وقت جب بیگم کا بڑا لڑکا صفدر کالج سے گھر لوٹا تو شمسہ نے رفیق کو فوٹو کی بات پھر یاد دلائی۔ رفیق صفدر کے کمرے کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ وہ ناشتہ وغیرہ کر کے کہیں باہر جانے کی تیاری میں تھا۔ رفیق پر نظر پڑتے ہی وہ بولا "کیا بات ہے رفیق کیا کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"ہاں ایک چھوٹی سی عرض ہے، چھوٹے حضور۔۔۔۔!" وہ کمرے میں داخل ہوتا ہوا انکساری کے لہجے میں بولا "ایک چھوٹا سا کام تھا" اور ایک نظر اس نے مونہہ گھما کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ دروازہ کے قریب دیوار سے لگی شمسہ اسے اشارے کر رہی تھی "بولو۔۔۔۔ بولو نا۔" رفیق کچھ جھجکتا ہوا سا بولا "چھوٹے حضور آپ کے پاس ایک کیمرہ ہے نا، وہ پھوٹو کھینچنے والی مشین۔۔۔۔"

"ہاں ہاں۔۔۔۔؟ کہاں ہے وہ۔۔۔۔؟" صفدر پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے بولا "کسی نے چھیڑا تو نہیں تھا اسے؟"

"نہیں حضور۔۔۔۔ کون چھیڑے گا اُسے۔۔۔۔؟" رفیق فوراً بولا "وہ رہا ٹیبل پر۔۔۔۔"

"ہاں تو کیا کہہ رہے تھے۔۔۔۔؟" ٹائی کی گرہ لگاتے ہوئے صفدر نے پوچھا۔

"چھوٹے حضور، اس کیمرے سے ابو کی ایک تصویر کھینچ دیجئے نا۔۔۔۔"

"فوٹو۔۔۔۔!" صفدر ہنسا "کیوں۔۔۔۔؟"

"ایں۔۔۔۔ شمسہ کہتی ہے اسے وہ اخبار "زینت" میں چھپنے کے لئے بھیجے گی۔۔۔۔ سلیم کا پھوٹو بھی اسی میں چھپا ہے۔"

"خوب۔۔۔۔" صفدر نے قہقہہ لگایا۔ دیوار کی اوٹ کھڑی شمسہ سمٹ کر رہ گئی۔ اس کے چہرے پر لالی ابھر آئی۔

اچھا کھینچ دوں گا۔۔۔۔!" کہتے ہوئے صفدر میز کی دراز میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ رفیق کمرے سے باہر نکل آیا اور شمسہ سے بولا "اب تو خوش ہو نا۔۔۔۔؟" شمسہ مسکراتی ہوئی باورچی خانہ کی طرف چل دی۔ چند ہی منٹ بعد صفدر اس کے پاس آ کر بولا "شمسہ ابو کہاں ہے، بلاؤ اس کی فوٹو کھینچ دوں۔۔۔۔" اس کے ہاتھ میں کیمرہ تھا۔

شمسہ کو جیسے اچانک کہیں سے بلاوے کا تار آگیا ہے۔ ہڑبڑائی سی اٹھی اسے کیا پتہ تھا کہ میاں آنی جلدی پھوٹو کھینچنے کو تیار ہو جائیں گے۔ ابو کو تو بتایا سنوارا بھی نہیں ہے۔ عین اس وقت ابو گھر سے باہر جھانکا، اس کے ہاتھ میں ٹوسٹ کا ایک ٹکڑا تھا۔ جو بیگم نے اسے بچے کھچے ناشتے میں سے دے دیا تھا، اور وہ اسے مزے لے لے کر کھا رہا تھا۔ ناک اور مونچھوں کی اگل بغل مکھن لگا ہوا تھا تن پر ایک میلی سی بنیان تھی جو گھٹنوں کو چھو رہی تھی مجموعی طور پر وہ بالکل مضحکہ خیز نظر آ رہا تھا۔ صفدر میاں کو ایک جدت سوجھی اور آگے بڑھ کر اس نے کیمرے کا اینگل ٹھیک کیا اور ذرا جھک کر سینپ لے لیا" بس اتر گیا فوٹو۔۔۔۔" وہ بولا اور شمسہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

جیسے کسی فقیرنی کو خیرات کے بہانے پاس بلا کر جھڑک دیا گیا ہو شمسہ کے دل میں ایک دھکا سا لگا۔ وہ اُلٹے پاؤں مونہہ لٹکائے باورچی خانہ میں لوٹ آئی۔

رات کے وقت وہ رفیق سے شکایت آمیز لہجے میں کہہ رہی تھی "اے جی میاں صفدر نے تو ہم سے مذاق کیا ہے۔ نہ تو ابو کا مونہہ صاف کرنے دیا نہ اسے کپڑے پہننے دیے۔ بس باگ میں کھڑا کر کے ننگ دھڑنگ کی پھوٹو کھینچ لی۔ کل بازار سے ابو کا پھوٹو کھنچوا لاؤ نا جی۔۔۔۔"

رفیق اپنی عقل مندی ظاہر کرتے ہوئے بولا "ننگے کا پھوٹو کھینچا تو کیا ہوا۔ پھوٹو میں تو سب ٹھیک ہوگا۔"

چوتھے دن صفدر نے رفیق کو خوش خبری سنائی، ابو کا فوٹو حل آیا ہے اور وہ اس فوٹو کو "زینت" میں بھیج دے گا۔

رفیق نے ذرا جھینپتے ہوئے کہا "حضور پھوٹو کے نیچے لکھ دیجئے گا کہ وہ میرا بٹیا ہے۔"

"ضرور لکھ دوں گا۔" صفدر نے اسے یقین دلایا۔

رفیق نے یہ خوش خبری شمسہ کو سنائی۔ پہلے تو وہ فوٹو بھیجنے کی بات سن کر بہت خوش ہوئی، لیکن فوراً ہی اس کا دل مایوسی سے ڈوب گیا۔ وہ بولی "ننگ دھڑنگ کا پھوٹو کون چھاپے گا۔ تم نے اخبار میں اور بچوں کے پھوٹو نہیں دیکھے تھے کیسے بنے سنورے دکھائی دیتے تھے۔"

رفیق کو بھی اس معاملہ میں شک تھا۔ وہ خاموش رہ گیا۔

دن بیتنے لگے۔ شمسہ کو اپنے بیٹے کی چھپی ہوئی تصویر دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اور وہ بے چینی سے اس دن کا انتظار کر رہی تھی، جس دن کہ اس کا فوٹو چھپ کر آتا۔ کبھی وہ اپنے دل میں سوچتی، بیکار وہ آس لگائے بیٹھی ہے۔ بھلا کون چھاپے گا ایسا فالتو پھوٹو۔ پھر سوچتی، نہیں۔ جب صفدر میاں نے وہ پھوٹو خود بھیجا ہے تو کیوں نہیں چھاپیں گے۔ سلیم کا پھوٹو بھی تو انہوں نے بھیجا تھا۔ دن بیتتے جا رہے تھے، ماں بیٹے کی چھپی ہوئی تصویر دیکھنے کی مشتاق ہے۔

ادھر جاڑے اتر آئے تھے۔ سلیم کے لئے نئے گرم کپڑے بن کر آ گئے تھے پرانے کپڑے، جو کچھ چھوٹے پڑ گئے تھے بیگم صاحبہ نے شمسہ کو اس کے ابو کے لئے دے دئے۔ ایک دن ابو شام کے وقت انہیں گرم کپڑوں کو پہنے باغیچے میں ٹہل آیا۔ شمسہ باورچی خانہ میں تھی۔ رفیق کسی کام سے بازار گیا ہوا تھا۔ جج صاحب کے گھر کے افراد ریڈیو سن رہے تھے۔ سلیم بھی وہیں تھا، صرف ابو اکیلا ہی باہر نکلا ـــــ کچھ اندھیرا جھک آنے پر شمسہ نے ابو کو پکارا "بیٹا ابو۔۔۔۔؟"

لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

"ابو۔۔۔۔ کہاں ہے بیٹا۔۔۔۔؟" شمسہ نے کچھ اونچی آواز میں پکارا۔ اور باغیچے میں چلی آئی۔ پر وہاں ابو دکھائی نہیں دیا۔ اس نے سوچا شاید گھر میں ہو۔ وہ اپنی کوٹھری کی طرف آئی لیکن وہاں تو اندھیرا تھا۔ ابھی تک بتی بھی نہیں جلی تھی۔ بتی روشن کرتی ہوئی وہ آہستہ سے بولی "ابو ـــــ بیٹا۔۔۔۔"

ابو وہاں بھی موجود نہیں تھا۔ شاید وہ سلیم کے ساتھ بنگلے میں ہو۔ سوچتی ہوئی اندر بنگلے میں گئی۔ دیکھا سلیم تو تھا پر ابو نہیں تھا۔ شمسہ کا دل سرعت سے دھڑکنے لگا۔ وہ دوسرے کمروں میں دیکھنے لگی، شاید ابو وہاں ہو۔ لیکن نہیں۔ ابو وہاں بھی نہیں تھا۔ وہ دوڑی دوڑی پھر باغیچے میں آئی اور اونچی آواز میں پکارنے لگی "ابو۔۔۔۔ بیٹا ابو۔۔۔۔ کہاں ہو بیٹا۔۔۔۔؟"

"یہیں کہیں ہوگا، کہاں جائے گا ابو۔۔۔۔!" بیگم بولیں "دیکھو باغیچے میں ہوگا۔۔۔۔"

"نہیں بیگم۔۔۔۔!" شمسہ پریشان سی بولی "میں نے گھر کا اور باغیچے کا کونہ کونہ چھان مارا ہے پر ابو دکھائی نہیں دیتا۔۔۔۔"

"ہیں! وہ جائے گا کہاں۔۔۔۔؟" بیگم حیرت میں پڑ کر بولیں، اور جج صاحب کے مونہہ کی طرف دیکھنے لگیں۔

جج صاحب مطمئن لہجے میں بولے "رفیق بازار گیا ہے۔ ابو کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا ہوگا۔"

"ہاں ہاں وہی اپنے ساتھ لے گیا ہوگا" بیگم بولیں۔ شمسہ کو کچھ ڈھارس بندھی۔ وہ واپس باورچی خانہ میں چلی گئی۔

"آٹھ بجے کے قریب جب کہ آدھی رات کا سا بھیانک اندھیرا چھا چکا تھا۔ رفیق بازار سے واپس لوٹا۔ شمسہ دوڑی دوڑی اس کے پاس گئی "ابو کہاں

ابو کی تصویر

ہے....؟" گھبراہٹ کے عالم میں اس نے پوچھا۔

"ابو....!" رفیق نے کہا۔ "یہیں کہیں ہوگا۔"

"نہیں یہاں تو اس کا کوئی پتہ نہیں۔" وہ حیرت سے اس کے مونہہ کی طرف دیکھتی ہوئی بولی "تم اسے اپنے ساتھ نہیں لے گئے تھے کیا؟"

"نہیں تو...." رفیق نے جواب دیا "میں تو اسے باغیچے میں کھیلتا چھوڑ گیا تھا۔ یہ باجہ لایا ہوں اس کے لئے، بہت ضد کرتا تھا نا!" وہ شمسہ کو باجہ دکھانے لگا۔

"ابو....!" شمسہ زور سے چیخی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "میرا ابو کہاں ہے دکھاؤ اسے....!"

بیگم اور جج صاحب باہر جاتے جاتے لمحہ بھر کو رُکے اور انہوں نے رفیق سے پوچھا "کیا ابو تمہارے ساتھ نہیں گیا تھا؟"

"نہیں...." رفیق جج صاحب سے بولا "میں تو اکیلا ہی بازار گیا تھا۔"

"تو پھر ابو کہاں چلا گیا....؟" جج صاحب نے بھی پریشانی کا اظہار کیا "ذرا آس پڑوس اور سڑک پر تلاش کرو۔"

ابو کی تلاش شروع ہو گئی۔ آس پڑوس میں پوچھ ہونے لگی۔ سڑک پر آدمی دوڑائے گئے۔ تھانے میں اطلاع دے دی گئی۔ ابو کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ ابو کھو گیا۔ ابو گم ہو گیا! شمسہ روتی رہی۔

رات کے وقت جج صاحب بیگم سے کہہ رہے تھے "بیگم اپنے سلیم کو گھر سے باہر نہ نکلنے دینا۔ میں جانتا ہوں یہ اس غنڈے کے ساتھیوں کی کرتوت ہے جسے میں نے آج پانچ سال قید سخت کی سزا سنائی ہے۔ وہ شاید سلیم کے دھوکے میں ابو کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ اکثر ایسی وارداتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔"

بیگم سلیم کو سینے سے لگاتی ہوئی بولیں "ہائے تو انہیں گرفتار کیوں نہیں کروا دیتے۔ بغیر ابو کے شمسہ بے چاری کا بُرا حال ہے۔"

جج صاحب بولے "کمبختوں کا کوئی سراغ لگے، تبھی گرفتار کراؤں نا!"

دوسرے دن پھر تلاش ہونے لگی، پر بے سود۔ صبح سے شام تک رفیق کئی جگہ مارا مارا پھرا۔ ابو کا کہیں کوئی پتہ نہ چلا۔ شمسہ رو رو کر ہلکان ہوتی رہی۔ تیسرے دن بھی یہی حال رہا۔ اس نے کچھ کھایا پیا نہیں۔ رات دنوں کی طرح آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی۔ چوتھا دن بھی اسی طرح گیا۔ پانچویں دن جب اس پر بے ہوشی کے دورے پڑ رہے تھے، گھر والوں نے بڑی کوشش سے اس کے مونہہ میں کچھ ڈالا۔ بہت کچھ سمجھایا بجھایا۔ اس بات کا یقین دلایا کہ ابو کو جلد ہی کہیں سے تلاش کر کے لایا جائے گا۔ خدا پر بھروسہ رکھنے کو کہا۔ مایوسی کی تاریکی میں اُمید کی بس یہی ایک کرن تھی۔ اس حادثے کو مہینہ بیت گیا۔ ابو کا کوئی پتہ نہ چلا پھر بھی اُمید لگی رہی، ابو ایک دن ضرور گھر واپس آئے گا۔ شمسہ کو کبھی محسوس ہوتا "ابو یہیں کہیں ہے۔ باغیچے کے کسی گوشہ میں چھپا بیٹھا ہے۔ ابھی وہ اچانک ہی باہر نکل آئے گا، اور اس کے پیروں سے لپٹ جائے گا، وہ پکارے گی، ابو....! اور ابو اپنی توتلی آواز میں "کیا ہے امّی....!" کہتا ہوا اس کے پاس آجائے گا کبھی ابو اسے خوابوں میں دکھائی دیتا، اور کبھی راہ چلتے بچوں میں۔ جو محض اس کا وہم تھا۔ وہ سوچتی "کاش سلیم کے فوٹو کی طرح ابو کا بھی ایک بڑا سا پھوٹو اس کے گھر میں ٹنگا رہتا، اور وہ اسے ہمیشہ دیکھتی رہتی۔ ابو ہمیشہ اُس کی آنکھوں کے سامنے رہتا۔"

دوپہر کا وقت تھا۔ شمسہ کام نبٹا کر گھر میں لیٹی آرام کر رہی تھی۔ دل اداس تھا اور طبیعت نڈھال۔ اچانک سلیم آیا اور اپنی توتلی آواز میں بولا "چلو امی بُلاتی ہیں....!"

"امی کس لئے بُلاتی ہیں سلیم؟" شمسہ نے پیار سے پوچھا۔

"مجھے معلوم نہیں!" سلیم بولا۔ شمسہ نے اُسے گود میں لے لیا۔ اس کا مونہہ چوما اور سینہ سے لگا لیا۔ اسے وہ ابو جیسا جو لگتا تھا۔

وہ بیگم کے کمرے میں آئی۔ بیگم اسے دیکھتے ہی بولی "لو دیکھو تمہارے ابو کی تصویر چھپ کر آگئی۔ وہ بھی پورے صفحہ پر۔" انہوں نے زینت کا پرچہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"ابو کی تصویر....؟" پرچہ لیتی ہوئی وہ بولی "وہی جو میاں صفدر نے بھیجی تھی۔!" وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تصویر دیکھنے لگی۔ "کتنی بڑی تصویر ہے۔ صفدر میاں نے تو شاید چھوٹی سی تصویر بھیجی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔ وہ فرش پر بیٹھ گئی۔

"دیکھو ابو کی تصویر کتنی صاف آئی ہے۔" بیگم بولیں "اور رسالے کے اندر پہلے صفحہ پر لکھا ہوا ہے" سرورق کی تصویر رفیق باغبان کا بیٹا ابو...."

شمسہ کچھ دیر تک تصویر کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ورق الٹا اور بیگم کے کہے ہوئے الفاظ تلاش کرنے لگی۔ آنسو اس کے گالوں پر لڑھک آئے تھے۔

بیگم افسوس ظاہر کرتے ہوئی بولیں "کسے خبر تھی کہ بے چارہ ماں باپ سے بچھڑ کر کہیں گم ہو جائے گا۔ کون جانتا تھا کہ سب اس کی تصویر دیکھیں گے اور وہ آنکھوں کے سامنے نہیں ہوگا۔ لیکن شمسہ میرا دل کہتا ہے وہ کہیں دُور

ابو کی تصویر

نہیں گیا، نہیں کہیں قریب ہی ہے۔۔۔۔ وہ ایک دن ضرور۔۔۔۔ پلٹ آئے گا۔ تیرا کھویا ہوا ابو ضرور مل جائے گا۔ خدا ضرور تجھ پر رحم کرے گا۔"

شمسہ کچھ نہیں بولی، وہ اور رونے لگی۔ روتی رہی۔

ان باتوں کے تیسرے چوتھے دن کا واقعہ ہے، شمسہ نے خواب دیکھا ابو باغیچے میں کھیل رہا ہے۔ کھیلتا کھیلتا وہ گھر کی طرف آیا اور امی امی کہتے ہوئے اپنے نازک ہاتھوں سے دروازہ پیٹنے لگا۔ جھٹ اُس کی آنکھ کھُل گئی پر سامنے ابو کی بجائے دیوار سے ایک چادر لٹکتی دکھائی دی۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی، اسی لئے دروازہ کھڑکھڑا رہا تھا۔ اس نے دست بدعا ہو کر خدا سے دُعا مانگی۔ "اللہ میرے لال پر رحم کر۔۔۔۔!"

دوپہر کا وقت تھا۔ بیگم صاحبہ نے اسے باورچی خانہ سے بلا بھیجا۔ فوراً ہی آنے کو کہا۔

جب وہ آئی تو دیکھا، بیگم صاحبہ مسکرا مسکرا کر ایک خط پڑھ رہی تھیں اسے دیکھتے ہی بولیں "مبارک ہو شمسہ تمہارا ابو مل گیا۔۔۔۔!"

شمسہ کو بیگم کی بات کا اعتبار نہ ہوا، وہ ہکا بکا سی اُن کے مونہہ کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے اس نے کوئی عجیب و غریب خبر سُن لی ہو۔

بیگم پھر بولیں "سنا نہیں تم نے۔ ابو کا پتہ چل گیا۔ دیکھ یہ خط آیا ہے۔" بیگم خط کا کچھ ضروری حصہ پڑھ کر سنانے لگیں "لڑکا اپنا نام ٹھیک طرح نہیں جانتا۔ ماں باپ کا نام بھی نہیں جانتا۔ ایک مہینے سے ہمارے یہاں ہے۔ ریلوے سٹیشن پر تنہا روتا دیکھا گیا تھا۔ پتہ نہیں کسی نے جان بوجھ کر چھوڑ دیا تھا یا کہ کسی سے چھوٹ گیا تھا، ہم اسے اپنے یہاں لے آئے تھے۔ تب سے جستجو جاری رہی۔ لیکن اب جو ماہ نامہ "زینت" میں اس کی تصویر دیکھی تو دفتر سے پتہ منگوایا اور آپ کو یہ خط لکھا، لڑکا آکر لے جایئے۔" بیگم خط پڑھتی پڑھتی رُک کر بولیں "سُن لیا نا۔ آج ابھی رفیق کو کہو موٹر سے چایں باسا چلا جائے، اور ابو کو لے آئے۔ ساتھ یہ خط بھی لیتا جائے، تاکہ انہیں یقین ہو جائے لڑکے والے ہی لڑکا لینے آئے ہیں۔"

شمسہ کا جی چاہا وہ فوراً ہی بیگم کے گلے لگ جائے۔ لیکن وہ مالکہ اور وہ ان کی خادمہ۔ شمسہ ان کے قدموں پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اسی دن رفیق ابو کو لینے چلا گیا۔ ابو ان سے صرف چالیس میل دُور تھا اور شمسہ سوچا کرتی تھی "اتنی بڑی دُنیا، ابو نہ جانے کہاں ہوگا۔۔۔۔ کہاں رہتا ہوگا، کیا کھاتا ہوگا اور کیسے دن کاٹتا ہوگا۔۔۔۔؟"

معجزات النبی

دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء آئے اور سب کو خصوصیات سے خدا نے نوازا رسول آخر الزماں فخر موجودات النبی الہاشمی العربی صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا سلسلہ زرین ختم ہو گیا اس لئے ضروری تھا کہ سارے خصائص و معجزات آپ پر تمام کر دیئے جائیں اس کتاب میں آپ کے سارے معجزات کا تحقیقی بیان نہایت دل نشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کنکریوں کی گواہی، درختوں کا چلنا، چوپایوں کا سجدہ، جنات کی شہادت رسالت، نجوم و قمر میں انقلاب کھانے اور پانی میں عجیب و غریب زیادتی، بیماروں اور دائمی اپاہجوں پر دست رسالت پھیرنے سے صحت و شفا کے مناظر، دشمنوں کے نرغہ سے محفوظ طور پر نکلنا، قتل کی نیت سے آنا اور کلمہ پڑھ کر واپس ہونا وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح کے غیر المعقول سیکڑوں معجزات کا بیان۔ وہ معجزات جن سے رسالت کی صداقت پر دلیل و برہان قائم ہوتی ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ سارے معجزات حدیث و سیر کی معتبر کتابوں سے لئے گئے ہیں۔

قیمت پچھتر نئے پیسے

معارف السنۃ

جن تعلیمات نے خاک نشین بدوؤں کو تخت جہاں بانی پر بٹھایا اور جن کی تجلیات سے آتش کدۂ فارس گل ہو گیا وہ تعلیمات آج بھی حرف بہ حرف ہمارے سینوں اور سفینوں میں محفوظ ہیں۔ اگر ہم ان کو آج بھی سمجھ کر اپنے لئے آئین حیات بنالیں تو خدا کی رحمتیں اپنی گود میں لے لیں۔ اس کتاب میں رسول اکرم کی مشہور اور زندگی میں انقلاب پیدا کرنے والی احادیث کو جمع کر کے ایسے دل نشیں عام فہم اور پر مغز انداز میں سمجھایا گیا ہے کہ آج تک اردو کا دامن اس دولت بے بہا سے خالی تھا۔

پڑھئے اور اپنا ایمان تازہ کیجئے۔

قیمت چار روپے

مکتبہ دینیات، آصف علی روڈ، نئی دہلی

شیر کی بیٹی

ایک شیر ننھی بچی کو کہیں سے اٹھالایا اور اُسے اپنی اولاد کی طرح پالا پوسا۔ جب لڑکی بڑی ہوئی تو اسے بہت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ لڑکی اصل میں کون تھی، اس پر کیا کیا مصیبتیں آئیں؟ قیمت ۴۴ نئے پیسے۔

مانو کے کارنامے

"بی مانو" تھیں تو ایک بندریا لیکن بڑے بڑے عقل مند انسان ان کی سوجھ بوجھ اور حیرت انگیز کارناموں سے حیران رہ گئے۔ مانو نے وہ وہ کام کئے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ قیمت ۶۵ نئے پیسے۔

ہلال کی کہانیاں

ایک ایسے بادشاہ کی کہانی جس نے مزدوروں کے ساتھ مل کر کام کیا۔ خود بھی مزدوری کی اور ایک مثال قائم کر دی۔ مزدور بادشاہ کی کہانی کے علاوہ اس میں دوسری دل چسپ کہانیاں بھی شامل ہیں۔ قیمت ۳۵ نئے پیسے

بیوقوفوں کہانیاں

بے وقوفوں کی چار مزے دار کہانیاں، ان چاروں بے وقوفوں کی حماقتیں پڑھ کر ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔ پڑھو اور خوب ہنسو۔ قیمت ۳۵ نئے پیسے۔

شاہی نجومی

ایک غریب سپاہی کی انوکھی اور دل چسپ کہانی جسے اتفاق نے نہ صرف بے حد دولت مند بنا دیا بلکہ بادشاہ کی لڑکی سے بھی اس غریب سپاہی کی شادی ہوئی، شاہی نجومی کی حیرت انگیز پیشین گوئی۔ راجہ مہدی علی خاں کی لکھی ہوئی ایک دل چسپ کہانی۔ قیمت ۴۰ نئے پیسے

چوہوں کی حکومت

چوہوں نے انسان اور خالہ بلّی کے مظالم سے تنگ آکر ایک کانفرنس کی جس میں تمام دنیا کے چوہوں کی حکومتوں کے نمائندے شامل ہوئے اور جس میں اپنی جان بچانے کے لئے عجیب عجیب ترکیبیں سوچی گئیں۔ قیمت ۴۰ نئے پیسے۔

تین ہیرے

مارکوپولو جس نے چین کا پتہ لگایا، کولمبس جس نے امریکہ دریافت کیا اور سلطانہ چاند بی بی جس نے بہادری سے بڑے بڑے بادشاہوں کے مونہہ پھیر دیئے۔ ان تین ہیروں کی حیرت انگیز کہانی قیمت ۴۴ نئے پیسے۔

چڑیا گھر

چڑیا گھر میں بڑے بڑے خطرناک جانور ہوا کرتے ہیں۔ خوفناک درندے، زہریلے سانپ، اژدھے، ہاتھی، شیر اور ایسے جانور جن کا تم نے نام بھی نہ سنا ہوگا۔ اس کتاب میں عجیب عجیب جانوروں کے حالات درج ہیں۔ قیمت ۴۴ نئے پیسے۔

بندروں کا تھیٹر

ایک مرتبہ بندروں نے تھیٹر کیا جس میں ایسی حیرت انگیز باتیں ہوئیں کہ بس مزا آگیا۔ جب اس کتاب کو شروع کرو گے تو ایسا معلوم ہوگا کہ خود بھی تھیٹر میں بیٹھے ہوئے تماشہ دیکھ رہے ہو۔ قیمت ۴۰ نئے پیسے

سرکس کے کھیل

سرکس کے عجیب و غریب کھیل، حیرت میں ڈال دینے والے کرتب۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوگا کہ خود بھی ایک بہت بڑے سرکس میں بیٹھے ہوئے اپنی آنکھوں سے سرکس دیکھ رہے ہیں۔ قیمت ۴۴ نئے پیسے۔

کھلونا بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی — شمع بک ڈپو، شاہ عالم گیٹ، لاہور

مظہر امام

تیرا دھیان

اے عروسِ نو! شبابِ وقت کی آئینہ دار — غنچہ و گُل تیرے اندازِ تبسّم پر نثار
تازگی بخشِ چمن ہے تیرے جلووں کی پھوار — اے فسونِ رنگ و نکہت! اے بہاروں کی بہار
کس کے انجانے تصوّر میں ہے تُو کھوئی ہوئی
کچھ پتہ چلتا نہیں، جاگی ہے یا سوئی ہوئی

مصحفِ عارض پہ تیرے رقص کرتی ہے سحر — ہیں خنک مرہم کی صورت تیری آنکھوں کے شرر
لہلہاتا ہے جبینِ ناز پر نورِ قمر — تیرے نازک لب سے "کٹ سکتا ہے میرے کا جگر"
تیرا جلوہ زندگی کے حُسن کی تصویر ہے
آدمی کے جگمگاتے خواب کی تعبیر ہے

مانگ میں تیری، اُتر آئی ہے بزمِ کہکشاں — بند آنکھوں سے چھلکتی ہے بہارِ جاوداں
کروٹیں لیتا ہے دل میں، تیرے خوابوں کا جہاں — دہم پر بھی ہو رہا ہے اب حقیقت کا گماں
اک نیا انداز پیدا تیرے ہر انداز سے
لے رہی ہے زندگی انگڑائیاں کس ناز سے

کھینچتا ہے اپنی جانب زُہد کو آبِ طہور — آشیانوں کی طرف پرواز کرتے ہیں طیور
ندیوں کو وسعتِ آغوشِ تلزم کا سُرور — ارتقا کے واسطے مضطر ہے انساں کا شعور
تُو بھی جانے کو کسی آغوش میں بے تاب ہے
آج تیرا دل ہے یا اِک پارۂ سیماب ہے

ہے رفاقت ہی سے قائم بزمِ فطرت کا نظام — ربط ہی پر ہے مدارِ "لذّتِ شربِ مدام"
تیری آرائش زمانے کو یہ دیتی ہے پیام — زندگی ہے زلف کی صورت سنور جانے کا نام
پا رہی ہے ابتدا سے قلبِ انساں میں نمو
زندگی کو خوبصورت دیکھنے کی آرزو

آدمی ہے آج خود اپنے عزائم کا خدا — فاش ہے آنکھوں کے آگے جلوۂ ارض و سما
فرش سے تا عرش بنتا جا رہا ہے راستا — چاند کی محفل سے آتی ہے نویدِ جاں فزا
ہم سفر تجھ کو بلا ہے، تُو شریکِ راہ بن
وقت کے فانوس روشن کر، جوابِ ماہ بن

وقت پر آنچل کو بھی پرچم بنا لیتی ہے زیست — دار پر چڑھتے ہوئے بھی گیت گا لیتی ہے زیست
تیز رو ساعت کے شہپر کو بھی جا لیتی ہے زیست — اپنا مقصد کوششوں سے اپنی، پا لیتی ہے زیست
کر دے تزئینِ گُل و سرو و سمن اپنی طرح
زندگی کو بھی بنا دے اک دُلہن اپنی طرح

آدمی کو نہ کھاؤ

ریوتی سرن شرما

دن بھر بادل گرجتا رہتا اور بجلی کڑکتی رہتی اور وہ ساس کی باتوں اور صلواتوں کے تازیانے کھاتی ہوئی کام کرتی رہتی۔ باتوں اور صلواتوں کا یہ سلسلہ مونہہ اندھیرے شروع ہو جاتا۔ جیوں ہی بہو اٹھ کر انگیٹھی سلگانے کے لئے انگیٹھی میں کچے کوئلے ڈالتی ساس آن بھکتی ——— "اتنے کچے کوئلے ڈال کر تو انگیٹھی سلگا رہی ہے یا چتا؟ آٹھ روپے من آتے ہیں یہ کوئلے۔ گھر کا خیال نہیں تو اپنے آدمی کا خیال کر جو دن بھر مرکھپ کر چار ٹکے لاتا ہے۔

اس کے بعد جھاڑو دینے کی باری آئی۔ بہو جب سارا گھر صاف کر چکی اور صرف آنگن کا آخری حصہ صاف کرنا رہتا ساس دھڑ دھڑاتی ہوئی آتی۔ اس کے ہاتھ میں جھاڑو کے دو تنکے ہوتے "اری تو جھاڑو دے رہی ہے یا مری بلیاں گھسیٹ رہی ہے؟ اور یہ دیکھو" وہ دو تنکوں کو بہو کے مونہہ کے پاس لے جا کر کہتی "تو نے ایسا کون سا قلعہ جھاڑا ابہارا ہے کہ جھاڑو کے اتنے تنکے نکال پھینکے؟ اری جھاڑو مفت نہیں آتی دھائی آنے کی آتی ہے۔ اگر کام کرنے کا جی نہیں ہے تو مت کر۔ جھاڑو پر تو جھونجل نہ نکال" اور ساس بہو کے ہاتھ سے جھاڑو لے کر بہو کو چولھے میں دھکیل دیتی۔ بہو چوکے میں جا کر کمنتر سے آٹا نکال کر گوندھتی اور پھر رات کی بھیگی دال دھونے بیٹھ جاتی۔ لیکن اس نے دال کا پہلا پانی ہی نالی میں گرایا ہوگا کہ ساس چنگھاڑتی ہوئی رسوئی میں آتی۔ "اری تو دال دھو رہی ہے یا نالی میں بہا رہی ہے؟" اس بار اس کے ہاتھ میں دال کا ایک دانہ ہوتا جو چھلکوں کے ساتھ بہہ کر نالی میں بہے چلا گیا تھا اور جسے اس نے ایک ایک چھلکے کا بغور معائنہ کرنے کے بعد نالی سے نکالا تھا۔ "اری یہ تو مجھ بڈھی ٹھڈی پھوٹی آنکھوں والی کو بھی دکھائی دے گیا۔ کیا تیری بھاڑ بھٹا سی کھلی آنکھوں کو دکھائی نہ پڑا۔ مت کر ان کی بے قدری نہیں تو دال کے اس دانے کو بھی ترسے گی" اور اس کے فوراً بعد اس کی نظر کا کیمرہ کمنتر کے گرد ہلکی سی سفیدی کو ابھارتا "یہ آٹا بھی گرا دیا؟ تیری مٹھی ہے کہ چھلنی؟ اری مت جلا میرا جی اور مت غرق کر میرے گھر کا بیڑا جس دن سے آئی ہے اوبیے ہی جھاڑو پھیر گئی ہے، رہے سہے کو مت آگ لگا۔"

ساس بہو کو چوکے سے اٹھا کر کپڑے دھونے غسل خانے میں بھیج دیتی۔ لیکن نظر اس کی غسل خانے کی نالی پر رہتی۔ جوں ہی اسے نالی کے پانی میں سفیدی کی گھلاوٹ نظر آتی یا صابن کا کوئی بلبلا بہتا نظر آتا، وہ پھر چلا اٹھتی "اری یہ کپڑوں کا میل کاٹ رہی ہے یا کورا صابن نالی میں بہا رہی ہے۔ دیکھ تو آ کر کیسا دودھ سا پانی اور کیسے پہاڑ سے جھاگ بہے چلے جا رہے ہیں نالی میں۔ اری ہاتھ ہلا، کپڑوں کو کوٹ کہ پانی کی رنگت بدلے، صابن کے ساتھ کچھ میل بھی کٹ کر نالی میں آئے"

صابن کا رونا پیٹنا ختم ہوتا تو روٹی بنانے کی باری آئی اور کبھی روٹی کے کچے مانڈ رہ جانے اور کبھی جل کر کوئلہ ہو جانے پر ہنگامہ اٹھتا۔ پھر برتن مانجھنے کے وقت بے کار پانی بہانے پر ہائے توبہ مچتی۔ جب سب کام ختم کر کے بہو دو گھڑی کمر سیدھی کرنے کو اندر جا لیٹتی تو ساس محلے والیوں کو بلا کر لاتی "اب آ کر دیکھ لو کہ رانی جی کیسے پڑی سستا رہی ہیں۔ صبح سے گلا پھاڑ پھاڑ کر مر گئی پر مجال کیا جو بندی نے پتہ توڑا ہو اور پھلی پھوڑی ہو۔

اور اب آرام کرنے ایسے گئی ہے جیسے دن بھر پہاڑ کاٹے ہوں اور سڑک کوٹی ہو۔

یہ رامائن پانچ بجے تک چلتی رہتی اور بہو جو دو گھڑی کمر سیدھی کرنے اندر جا لیٹتی، پھر اُٹھ کر شام کو کھانے کے لئے چولھے میں لکڑیاں جوڑنے لگتی۔ وہ چولہا جلا کر سبزی کاٹتی، آٹا گوندھتی اور کنوئیں سے پانی نکالتی۔ وقت ہوتا تو آنگن میں جھاڑو بھی دے ڈالتی۔ لیکن ساڑھے پانچ بجتے ہی ساس کے رویّہ میں ایک انقلابی تبدیلی وقوع پذیر ہوتی۔ اس کی چیخ پکار، اس کی جلی کٹی یک لخت بند ہو جاتیں اس کے گلے سے بہو کے لئے نہ جانے کہاں سے محبت اُمڈ آتی "بہو تو چائے پی لے"، "بہو تو کپڑے بدل لے"، "بہو تو کام چھوڑ دے"، اپنے بیٹے کے دفتر سے آنے سے ذرا پہلے وہ ہمیشہ بہو کو رسوئی سے نکال دیتی اور جب بیٹا گھر میں داخل ہوتا تو اسے ماں ہی کام میں لگی نظر آتی۔ اپنی ماں کو کام میں جتا دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ جاتی "ماں ——— تم کیوں کام کر رہی ہو؟ وہ کہاں ہے؟ اس کے کیا ہاتھ پیر ٹوٹ گئے ہیں؟" اس وقت ماں پیار اور ممتا کی دیوی بن جاتی بڑے دبے دبے لہجے میں گویا اس کے غصّے کی آگ سرد کرنے کے لئے کہتی کہ ارے جانے بھی دے۔ وہ کب کب آرام کرے گی۔ مجھے تو کام کرنے کی عادت ہے۔ جب تک جیوں گی گاڑی کھینچتی رہوں گی۔ وہ بیٹھی پڑھی لکھی۔ نہ کام کہیں کیا نہ کرنا سیکھا۔ ہائے توبہ بھی کروں گی تو کیا ہوگا۔ مار پیٹ کے ٹانڈے پہ بٹھا دو۔ پھر تو بھیا کون اڑائے؟"

ٹانڈ پر بیٹھنے والا گو بھیا اڑاتا کہ نہ اڑاتا۔ ماں کا فرماں بردار بیٹا ضرور اڑاتا۔ وہ جو صلواتیں اور گالیاں اپنی بہو کو سناتا۔ گھر کی دیواروں کو پھوڑ کر پڑوسیوں اور محلّے والوں کے در و دیوار سے ٹکراتیں۔ اس طرح ساڑھے پانچ بجے کے بعد ماں کا چارج بیٹا سنبھال لیتا۔ فاعل بدل جاتا مگر مفعول بنا مہلت کے رات گئے تک صلوات کے گولہ میں بدستور چلتا ہی رہتا۔

یہ پچھلے تین برس سے چل رہا تھا اور بہو کے لئے اس سے فرار ممکن نہ تھا۔ یہ ٹھیک ہے وہ امیر گھرانے کی نہ تھی، لیکن پھر بھی وہ پڑھی لکھی تھی۔ اس نے بی۔ اے پاس کیا تھا۔ لیکن یہ بی اے پاس کرنا ہی شاید اس کے حق میں زہر قاتل ثابت ہوا تھا۔ اس نے بی۔ اے پاس کر لیا تھا۔ لیکن اس کے ماں باپ بہت پرانے خیالات کے تھے۔ لڑکی کے لئے اچھا لڑکا نہ ملا اس لئے وہ لڑکی کو پڑھاتے رہے۔ اس میں اتنا خرچ نہ ہوتا تھا۔ الٹا وظیفے کے پندرہ روپے گھر آتے تھے۔ لیکن ان کا منشا اسے پڑھا لکھا کر آزادی دینا نہ تھا وہ تو اس کی شادی کے بارے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ لیکن شادی کرنا بھی آسان کام نہ تھا۔ جس کے بھی جاتے وہ چار پانچ ہزار سے کم نہ مانگتا اس کے علاوہ جو سنتا کہ لڑکی بی اے پاس ہے، وہ ویسے ہی کانوں پر ہاتھ دھرتا۔ بی۔ اے پاس بہو لا کر اپنی نیند کون خراب کرائے؟ اس لئے اس کے ماں باپ نے لوگوں کو بتانا ہی بند کر دیا کہ بہو بی اے پاس اگر وہ اس کی تعلیم کے بارے میں سچ بتاتے تو اس کی اس گھر میں بھی شادی نہ ہوتی۔ شوہر محض ایف۔ اے پاس تھا، ٹیلی فون ایکسچینج میں ۸۰ روپے کی نوکری کرتا تھا۔

لیکن شادی کے بعد یہ بات چھپ نہ سکی۔ اس کا سُسر ایک مڈل اسکول کا ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تھا۔ ایک دن ٹیچروں کے کسی جلسے میں اس کی ملاقات اس کالج کی پرنسپل سے ہو گئی جس نے اس کو بی۔ اے میں پڑھایا تھا۔ باتوں باتوں میں اسے معلوم ہو گیا کہ اس کے بیٹے کی بہو بی اے پاس ہے۔ یہ سن کر اس پر ایک غیر معمولی اداسی طاری ہو گئی، گو وہ نئے خیالات کا آدمی نہ تھا، لیکن پھر وہ ایک معلّم تھا جس نے بچوں کو علم دیا تھا۔ علم کی بے قدری پر وہ خوش نہ ہو سکتا تھا۔ اُسے محسوس ہوا اس کی بہو کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ اس کے ذہن کے ساتھ بے انصافی ہوئی ہے وہ اس کے بیٹے اور اس کے گھر کی بہو بننے کے لائق نہ تھی اُسے تو کسی بہتر گھرانے میں جانا چاہئے تھا۔ جہاں اس کے علم کا چراغ روشن ہو سکتا۔ بہو کے لئے ایک عزت، ایک ہمدردی، ایک قدر کا نیا جذبہ اس کے دل میں پیدا ہو گیا۔

لیکن اس کی ساس اور اس کے شوہر پر اس کا ردِ عمل بالکل مختلف ہوا۔ ساس تو پہلے ہی بہو کے ان نازک نازک ہاتھ پیروں سے پریشان تھی جو اس کے معیار کے مطابق نہ چکی پیس سکتے تھے نہ اس کے پیر دبا سکتے تھے۔ بی۔ اے پاس ہونے کی خبر سن کر اس نے سر ہی پیٹ لیا۔ شوہر بھی اس سے کچھ زیادہ مطمئن نہ تھا وہ شوہر سے زیادہ ماں کا بیٹا تھا۔ اس کے نزدیک بیوی ماں کی لونڈی اور شوہر کی جنسی تسکین کا آلہ تھی۔ ویسے بھی بیوی سے باتیں کرتے وقت اُسے ایک عجیب سی احساسِ کمتری کا احساس ہوتا۔ وہ نہ اس کی باتوں کا غلط خواہ جواب دے سکتا اور نہ ایسی کوئی بات کر سکتا جو اس کی بیوی کے ذہن کو خطاب کرتی ہو۔ اس لئے وہ گھر کا کام غلط خواہ نہ کرنے پر اس کی تذلیل کر کے اپنے جذبۂ کمتری کو تسکین پہنچانے کی کوشش کیا کرتا۔ لیکن جب اُسے معلوم ہوا کہ وہ بی اے پاس ہے تو اس کے احساسِ کمتری نے ٹھوس صورت اختیار کر لی۔ اب وہ ہر وقت دانستہ طور پر اس کی تذلیل کرنے لگا اور اُسے برابری کا درجہ دینے کا موقع ہی نہ آنے دیتا۔

اس طرح بہو جو پہلے ساس اور شوہر کے غیر شعوری عتاب کا شکار تھی، اب ان کی شعوری اذیت دہی کا شکار رہنے لگی۔ اس کی ہر حرکت، ہر عادت اور ہر خواہش پر زہریلی تنقید کی جاتی۔ اس صورتِ حال کو اس کی نند کی سگائی نے ابتر بنا دیا۔ اس کی نند نہ خوب صورت تھی، نہ عقلمند نہ پڑھی لکھی۔ گھر کی تمام بچت پونجی ڈھائی ہزار روپے دے اس کی سگائی کی تھی۔ شادی میں پانچ سو روپے اور دینے کی بات تھی۔ لیکن پانچ سو روپے کہاں سے آئیں اور شادی کے دیگر اخراجات کیسے پورے ہوں۔ گھر میں نہ زیور تھا اور نہ جائداد اس لئے ساس نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ بہو کے جہیز کی تمام چیزیں اس سے لے کر ضبط کر لیں، فہرست اٹھا کر ٹانڈ پر ڈال لیا اور بہو سے ہر چیز کے لئے کھینچا تانی شروع

کردی۔ ایک دو آنے کی چیز کی فرمائش پورا کرنا الگ رہی اس کے کھانے پر بھی ٹوکا ٹاکی ہونے لگی۔ جب بات یہاں تک پہنچی تو بیوی نے شوہر سے دبے الفاظ میں شکایت کی۔ لیکن حمایت کی بجائے اس نے الٹا اُسے لتاڑا۔ تیرے عیش کا سامان میں نہیں کر سکتا۔ میرے پاس حرام کی کمائی نہیں آتی۔ یہاں ہاتھ پیر کا کھیل ہے۔ اگر ہاتھ پیر نہیں ہلا سکتی تو بھوکی مر۔

تین سال تک وہ سنتی رہی۔ ایک دن اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا دن بھر ساس نے طعنے دیئے اور رات کو شوہر نے پھر وہی طعنہ دہرایا "میں کچھ نہیں کر سکتا اگر تجھے سوتی بلاؤز میں سردی لگتی ہے اور اونی بلاؤز چاہئے تو خود کما کر لا۔ میرے پاس تیرے لئے کچھ نہیں ہے۔" جس حقارت کے ساتھ اس کے شوہر نے یہ بات کہی، بہو کی خودداری برداشت نہ کر سکی۔

"تمہارے پاس میرے لئے کچھ نہیں ہے؟ میں خود کما کر لاؤں؟"

"ہاں اگر پہننے کا شوق ہے تو ہاتھ پیر ہلا۔ کما یا توڑ"

"تو پھر ٹھیک ہے میں کل سے باہر جاؤں گی۔"

"کہاں؟"

"نوکری کرنے"

"کیا؟" اس کا شوہر جیسے پلنگ سے نیچے گر گیا۔ "تو.... تو نوکری کرے گی؟"

"ہاں۔ میں نوکری کروں گی۔ میں نے بی اے پاس کیا ہے۔ میرے کالج کی پرنسپل یہاں آ گئی ہے۔ مجھے نوکری یا ٹیوشن ضرور مل جائے گی"

بہو کا یہ کہنا تھا کہ شوہر پر تو جیسے دورا پڑ گیا۔ اس نے چیخ چیخ کر گھر سر پر اٹھا لیا۔ ساس بھی اندر آ گئی لیکن اس دن بہو کے قدم نہ ڈگمگائے۔ شاید برداشت کی حد آ چکی تھی۔

"تو نوکری کرے گی؟" ساس نے استفسار کیا؟

"ہاں۔ اگر آپ لوگوں سے میرا بوجھ نہیں اٹھایا جاتا تو میں نوکری کروں گی"

"تو ہماری ناک کٹے گی؟ تو دوسروں کی چاکری کرے گی؟"

"اس میں دوسروں کی چاکری کی کیا بات ہے ـــــ کام کر کے روپیہ کمانا بری بات نہیں"

"لیکن اگر کام کرنا چاہتی ہے تو میری طرح گھر میں بیٹھ کر اپنا کام کر ـــــ بیج چھیل۔ سوت کات ....؟"

"لیکن یہ کیا اپنا کام ہے؟ آپ بیج چھیل کر اور سوت کات کر بازار میں بیچتی ہیں کیا یہ دوسروں کا کام نہیں ہے؟"

"یہ دوسروں کا کام ہے؟" ساس کے بری طرح پیر اکھڑ گئے۔ اس لئے اس نے بیٹے کو جھنجھوڑا۔ ارے تو نے دیکھا تیری بہو کیا کہتی ہے؟ وہ کہتی ہے میں دوسروں کی چاکری کرتی ہوں۔ میں بازاروں میں جھک مارتی پھرتی ہوں؟"

"ہاں ـــــ اگر اسکول میں پڑھانا دوسروں کی چاکری کرنا ہے تو بیج چھیلنا اور سوت کات کر بیچنا بھی دوسروں کی چاکری ہے"

ساس بہو اور بیٹے نے چونک کر دیکھا ـــــ دروازے پر سسر کھڑا تھا اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو رہا تھا۔

"ارے کمبختو کیوں اس پرائی بیٹی کو دکھ دے رہے ہو؟ کیوں ایک پڑھی لکھی بچی کی درگت بنا رہے ہو؟ کہاں تمہیں اس کے پاؤں دھو کر پینے چاہئیں اور کہاں تم اسے خاک میں گھسیٹ رہے ہو ارے اگر اس کی روٹی کا خرچ نہیں اٹھا سکتے تو اسے کام کرنے دو یہ تم کو کما کر کھلائے گی"

"اچھا بہو کی یہ ہمت تمہاری شہ پر ہوئی؟" ساس نے اب اپنے شوہر کا رخ کیا "بیٹے کی کمائی سے پیٹ نہیں بھرا تو اب بہو کی کمائی پر نیت ڈالی ہے شرم نہیں آتی تمہیں"

"کس بات کی شرم؟ کیا میں، تو اور یہ۔ ہم سب اس کی کمائی نہیں کھا رہے؟"

"اس کی کمائی کھا رہے ہیں؟" حیرت اور غصے سے ساس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"ہاں جو کام یہ کرتی ہے جو محنت یہ دن بھر کرتی ہے کیا یہ اس کی کمائی نہیں ہے؟ کیا ہم اس کے خون اور پسینے کی روٹی نہیں کھاتے؟ ارے گڑ کھاتے ہو اور گلگلوں سے پرہیز کرتے ہو؟"

"اوہ تو اب گلگلے کھانے کو جی کرتا ہے؟" ساس کے لہجے میں زہر بھرا تھا "اس بڑھاپے میں تمہاری مت تو نہیں ماری گئی ہے؟ ارے اگر لگائی کی کمائی کھانی ہے تو مجھے ننھی بنا کر بانس پر چڑھا دو۔ بیٹے کی بہو کو بیٹے کے بیچنے کے لئے چھوڑ دو"

بات بہت تلخ تھی۔ بات شاید بہت آگے بھی بڑھ گئی تھی۔ سسر کو بھی احساس ہوا وہ شاید حد سے تجاوز کر گیا۔ بہو سے کام کرانا یا نہ کرانا اس کے بیٹے کا فیصلہ ہوگا اُسے محض اپنی بیوی پر اختیار ہے۔ اس لئے وہ چپ چاپ لوٹ گیا۔ رات کے گیارہ بج گئے تھے۔ باہر سپاہی گشت کرنے آ گئے تھے اس لئے ساس نے بھی بات آگے نہ بڑھائی۔ سب سونے چلے گئے۔

لیکن بات نہ ہوئی۔ وہ سب کے ذہنوں میں جاگتی رہی۔ اس نے ایک طرف بہو کی قوت برداشت کو بہت کم کر دیا اور دوسری طرف ساس اور شوہر کے ذہن اور مزاج کو اور زیادہ چڑچڑا بنا دیا۔ گھر میں معمولی سی بات بھی ہوتی تو نوکری کی بات ذہن کے پس منظر میں آ کھڑی ہوتی" اور "تلخی کو بڑھاتی رہتی لیکن سسر کی زبان بند ہو چکی تھی اب وہ ایک ایسا بدنصیب تماشائی تھا جس کے ہاتھ پیر کاٹ ڈالے گئے ہوں۔

بہو کو ہمدردی کی جو کرن نظر آئی تھی، وہ بھی بجھ گئی۔

لیکن ایک دن وہ خاموش نہ رہ سکا اس کے سامنے ایک ایسا فیصلہ کیا جا رہا تھا جو اس کے ضمیر اور اس کی اخلاقی حس کیلئے قابلِ برداشت نہ تھا پچھلی رات اس لڑکے کا باپ آیا تھا جس کے ساتھ اس نے اپنی لڑکی کی سگائی کی تھی سگائی کے وقت یہ طے ہوا تھا کہ شادی میں تین ہزار روپیہ دیا جائے گا۔ جس میں سے ڈھائی ہزار دیا جا چکا تھا، پانچ سو دینا باقی تھا، لیکن وہ پچھلی رات آیا تو اس کی آنکھیں بدلی ہوئی تھیں۔ "ماسٹر جی دیکھئے اب میرا آپ کا رشتہ نہیں ہو سکتا یہ ٹھیک ہے میں نے تین ہزار روپے مانگے تھے لیکن اب مجھے یکایک روپے کی بہت سخت ضرورت آن پڑی ہے مجھے دو ہزار روپیہ اور چاہئے آپ دے دیں تو رشتہ قائم۔ ورنہ منسوخ۔"

"آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں منشی جی؟" ماسٹر جی نے کانپ کر اپنے ہونے والے سمدھی کے شانے پکڑ لئے۔ "آپ کو معلوم ہے یہ ڈھائی ہزار بھی میں نے بہو کے زیورات بیچ کر آپ کو دئے ہیں۔ میرے لئے تو باقی پانچسو کا بندوبست بھی ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔"

"لیکن جہاں تک آپ کے پانچسو کے بندوبست کا مسئلہ ہے" سمدھی بات کاٹ کر بولا "اس کو تو میں حل کر سکتا ہوں میں نہ صرف آپ سے پانچ سو روپے لے لوں گا بلکہ آپ کے دئے ہوئے بھی ڈھائی ہزار روپے واپس لوٹا دوں گا۔

"منشی جی"

"ہاں" ایک شیطانی مسکراہٹ منشی جی کے چہرے پر کھیل رہی تھی۔ "میں آپ کے سب روپے لوٹا دوں گا۔ آپ اپنی لڑکی کا رشتہ کہیں دوسری جگہ سستے داموں میں کر سکتے ہیں"

"آپ کو معلوم ہے آپ کیا کہہ رہے ہیں" ماسٹر جی نے اپنے سمدھی کے شانوں کو غیر دانستہ طور پر جھنجھوڑ کر کہا "آپ میری عزت ہی نہیں، میری لڑکی کی زندگی بھی خراب کرنے کی تجویز کر رہے ہیں ذرا سوچئے اگر آپ نے سگائی توڑ دی، پھر میری لڑکی کو کون لے گا؟ اس کی شادی کہاں ہوگی؟"

"لیکن اس ایک بات کا خیال کر کے ہی تو میں آپ کے پاس آیا ہوں، میں آپ کی لڑکی کی زندگی خراب کرنا نہیں چاہتا لیکن مجھے پانچ ہزار روپیہ فوراً چاہئے۔ مجھے ایک جگہ سے اتنا روپیہ مل رہا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں پہلا حق آپ کا ہے آپ ڈھائی ہزار اور دے دیجئے لڑکا آپ کا، ورنہ میں آزاد اور آپ آزاد"

"لیکن یہ تو سوچئے کہ میں اتنی رقم کا بندوبست کیسے کر سکتا ہوں؟"

"ماسٹر جی، یہ میرے سوچنے کی بات نہیں۔ آپ کے سوچنے کی بات ہے اور اس کے لئے میں آپ کو ایک ہفتہ کی مہلت دیتا ہوں میں اگلے سوموار کو آؤں گا اور آپ کا فیصلہ سن کر اپنا فیصلہ سنا جاؤں گا۔"

اتنا کہہ کر وہ چلا گیا اور اس کے پیچھے سارے گھر پر ایک دم گھومنے والا سناٹا چھا گیا۔ سب خاموش تھے۔ ڈھائی ہزار روپیہ پتھر کی سل کی طرح اس کی چھاتی پر آ کر ٹک گیا۔ بہت سوچا گیا۔ بہت بچارا گیا۔ بہت بحثیں ہوئیں۔ بہت مباحثے ہوئے لیکن کوئی راستہ نہ نکلا اور چھ دن نکل گئے۔ ساتویں دن میں صرف ایک رات باقی تھی لیکن یکایک ایک راستہ کھل گیا۔ ایک پٹھان ڈھائی ہزار روپیہ دینے پر تیار ہو گیا۔

"لیکن وہ کس چیز پر روپیہ دے گا؟" ماسٹر جی نے اپنی بیوی اور بیٹے سے پوچھا جو یہ راستہ نکال کر آئے تھے۔

"آدھی تنخواہ گروی رکھ کر؟" بیوی نے جواب دیا۔

"کیا کہہ رہی ہے؟"

"یہی کہ پٹھان ہر مہینے آدھی تنخواہ لے لیا کرے" بیوی نے وضاحت کی۔

"اور ہم کیا کھائیں گے؟ کیا پانچ آدمیوں کا چالیس پچاس روپے میں گزارہ ہو جائے گا؟"

"ہاں ہم روکھا کھا لیں گے۔ پھٹا پہن لیں گے اور اس پر بھی بس نہیں چلے گا تو ہم بہو کو اس کے میکے بھیج دیں گے۔"

"کیا کہا؟" غصہ سے اس کا سسر اٹھ کھڑا ہوا اس کے ہاتھ کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ "تو روٹیاں بچانے کے لئے بہو کو بن بلائے اس کے میکے بھیج دے گی؟ اپنی بیٹی کی زندگی بنانے کے لئے پرائی بیٹی کی زندگی تباہ کر دے گی۔ کان کھول کر سن لے بیٹی کی سگائی رہے یا ٹوٹے، بہو اس گھر سے نہیں جائے گی۔"

"نہیں پتا جی" یکایک بہو کی آواز سنائی دی۔ سب نے چونک کر دیکھا۔ بہو کے چہرے پر گھونگھٹ نہ تھا۔ اس کی آواز میں جھجک خوف یا تلخی نہ تھی اس کے چہرے پر خودداری کی چمک اور طاقت تھی "آپ میری فکر نہ کیجئے آپ قرض لے لیجئے، جب تک قرض نہیں اتر جاتا، میں اپنے میکے میں رہ لوں گی۔"

"بہو!" ساس نے حیرت سے بہو کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر وہی تھا جو اس کی زبان پر تھا "میری اچھی بہو" ساس کے سینے میں گویا بہو کے لئے محبت کے سوتے اُمڈ پڑے "میری اچھی بہو میں تجھ پر واری جاؤں تو نے مجھے اور میری بیٹی کو اُبار لیا۔"

"آپ مجھے اگلے اتوار کو میرے میکے چھوڑ آئیے گا" بہو نے ساس کی بات کا جواب دینے بنا شوہر کو خطاب کیا اور شوہر نے گردن جھکائے جھکائے جواب دیا "اچھا"

بہو اندر جانے لگی، لیکن سسر نے اسے روکتے ہوئے کہا "بہو ابھی ٹھیرو" اور بیوی اور بیٹے کو جلتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا "تو تم دونوں نے بہو کو گھر سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا؟ اب تو تمہارا اس پر کوئی حق نہیں رہا نا؟"

اس کی بیوی اور بیٹے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس لئے ان کے مونہہ سے یہی نکلا "حق؟"

"ہاں یاد ہے، اس رات جب بہو نے نوکری کی بات اٹھائی تھی اور میں نے اس کی حمایت کی تھی تو تم نے کیا کہہ کر میرا موہنہ بند کر دیا تھا؟ تم نے کہا تھا بہو پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔ لیکن آج جب تم اسے دو ٹکڑے بھی نہیں دے سکتے۔ جب اسے گھر سے نکالنے پر رضامند ہو گئے ہو تو میں کہتا ہوں اس پر اب تمہارا بھی کوئی حق نہیں ہے۔ اب وہ آزاد ہے!"

"آزاد؟"

"ہاں۔ آج سے یہ ہماری بہو ہے اور نہ اس کی بیوی۔ آج وہ اپنی مرضی کی مالک اور اپنی تقدیر کی خالق ہے۔ بہو کل سے تم جا سکتی ہو!"

"جی؟" نہ بہو کی سمجھ میں آیا اور نہ ساس اور بیٹے کی۔ سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماسٹر جی کی طرف دیکھنے لگے۔

"میری طرف ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟" اب ماسٹر جی کی آواز میں ایک نئے فیصلہ کی گونج تھی "اس لڑکی کو میں بیاہ کر لایا تھا۔ لیکن تمہارے بعد میں بھی اُسے آزاد کرتا ہوں بہو اب تم نوکری کر سکتی ہو"

"نوکری؟" ساس اور شوہر ایک ساتھ چیخے۔

"ہاں، نوکری" آج ماسٹر جی بھی رشتے کی پابندیوں سے آزاد ہو چکے تھے "یہ اب تمہاری میری کمپاری بن کر اپنی شخصیت کی ہتک نہیں کرے گی۔ یہ میکہ جا کر اپنی عزت اور خودداری کا خون نہیں کرے گی۔ یہ اپنی روٹی خود کما کر لائے گی اس کے لئے نوکری کا بندوبست میں خود کروں گا"

"تم؟"

"ہاں میں کمبختو تم نے کسی کو علم نہیں دیا اس لئے تم اس درد کو سمجھ نہیں سکتے جو علم کی بے قدری، علم کی ذلت ہوتے دیکھنے پر محسوس ہوتا ہے۔ تم نے اس پڑھی لکھی عورت کو کمپاری بنایا تم نے اس کو بھکارن کی طرح بھوکا ننگا بنایا۔ آج چالیس روپے بچانے کی خاطر تم اسے گھر سے بھی نکال رہے ہو اب تک تم نے اس کے پسینے کا نمک کھایا اب اس کے جگر کے خون سے تم اپنی بہن اور بیٹی کے سہاگ کا جوڑا رنگنے جا رہے ہو ارے ظالمو تمہیں اس کا پسینہ اور اس کا خون پیتے شرم نہیں آتی۔ لیکن اس کی محنت اور اس کی قابلیت کا میٹھا پھل کھاتے ہوئے تمہاری ناک کٹتی ہے؟ ارے جاہلو! آدم خور نہ بنو۔ آدمی کی خوشی اور اس کی ترقی کی شاخ پر پھلو پھولو کا کر اپنی بھوک مٹانا سیکھو" اور یہ کہہ کر بنا کسی جواب کا انتظار کئے دروازہ کھول کر وہ باہر چلے گئے ــــ لیڈی پرنسپل سے بہو کے لئے نوکری کی درخواست کرنے۔

اور جہاں اب تک بند دروازے کا اندھیرا تھا، وہاں کھلے کواڑوں کے درمیان تاروں بھرے آسمان کا ایک ٹکڑا آ کر جڑ گیا تھا۔

●●

مسلمان خواتین کی شہرۂ آفاق کتاب جس کا ہر گھر میں ہونا ضروری ہے

بہشتی زیور مکمل (گیارہ حصص)

مصنفہ: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی

اس شہرۂ آفاق کتاب کی مقبولیت کسی سے مخفی نہیں ہے۔ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ لیجاتی ہے۔ حضرت مولانا نے تمام ضروری اور روزمرہ کے مسائل کو عام فہم زبان میں یکجا کر کے "دریا در کوزہ" کا ثبوت دیا ہے۔ یہ کتاب گیارہ حصوں میں منقسم ہے۔

پہلا حصہ۔ اس میں عورتوں کے مسائل پاکیزگی، تعلیم و تربیت، کفر و شرک، ایمان و عقائد درج ہیں۔

دوسرا حصہ۔ اس میں حیض و نفاس، طہارت، وضو، غسل، طریق نماز وغیرہ کے مسائل کا بیان ہے

تیسرا حصہ۔ اس میں روزہ، زکوٰۃ، قربانی، حلال و حرام اور دوسرے مسائل کا ذکر ہے۔

چوتھا حصہ۔ اس میں پردہ، نکاح، طلاق، عدت، نکاح ثانی وغیرہ کے مسائل بیان کئے ہیں

پانچواں حصہ۔ اس میں لباس، زیور، شوہر کے حقوق، خرید و فروخت، رہن و بیع وغیرہ کے مسائل کا ذکر کیا گیا ہے۔

چھٹا حصہ۔ اس میں فضول و قبیح رسوم کی ممانعت، اسلامی رسوم اور بچوں کی بسم اللہ ختنہ اور شادی کا بیان ہے۔

ساتواں حصہ۔ اس میں آداب و اخلاق، شفقت و رحمت، ماں باپ کی خدمت اور پیری، مریدی کے حقوق کی تعلیم ہے۔

آٹھواں حصہ اس میں مقدس پیغمبروں کی مقدس بیویوں کے پاکیزہ حالات اور دوسرے بزرگوں کی نصیحتیں بیان کی گئیں ہیں۔

نواں حصہ۔ اس میں عورتوں کے امراض کی وجوہ اور ان کے علاج وغیرہ کا ذکر ہے

دسواں حصہ۔ اس میں گھر کا کاروبار، ہاتھ کے ہنر اور حساب لکھنے کا طریق وغیرہ درج ہے۔

گیارہواں حصہ۔ یعنی بہشتی گوہر۔ اس میں اسلام کے جملہ ارکان اور دوسرے مذہبی مسائل شرح و بسط سے درج کئے گئے ہیں۔

ہم نے اس کتاب کو نہایت محنت سے تصحیح کرا کر خوب صورت طریقہ پر شائع کیا ہے۔ قیمت کامل مجلد، جلد ڈاک وار چودہ روپے۔

مکتبہ دینیات: آصف علی روڈ، نئی دہلی

بنتِ سقراط

گھریلو بچت کے چند اچھے ڈھنگ

یہ کہنا مذاق نہیں تو کیا ہے کہ ہمارے متوسط طبقے کے اکثر گھروں کی مصیبت یہ ہے کہ انہیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ بچت کے روپے کا وہ کب استعمال کر سکتے ہیں؟ اس لئے کہ استعمال تو بعد کی بات رہی پہلی بات تو یہ ہے کہ روپیہ ہو۔ اور آج کل حالت یہ ہے کہ میاں کی ساری کی ساری تنخواہ بچوں کی اسکول فیس مکان کے کرائے اور چھوٹے موٹے گھریلو لین دین پر صرف ہو جاتی ہے اور یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ روپیہ کس ہاتھ سے آتا ہے اور کس ہاتھ سے چلا جاتا ہے۔ جہاں تک روٹی کپڑے کا تعلق ہے وہ تو بس اللہ ہی کی دین سے ملتا ہے ورنہ تنخواہ میں اتنی ہمت کہاں کہ اتنے ڈھیر سارے نوالے ہر روز مہیا کر سکے۔ ایک بار نہیں سو بار بی کنجڑن سے لے کر اپنی چہیتی سہیلی تک یہی باتیں ہم بار بار کر چکی ہیں۔ اور جب بھی کرتی ہیں تو ہمیں بہت سچی بہت درست اور بہت جان لیوا معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے۔ ہم میں سے بھی نے تو نہیں لیکن اکثر نے سونے کی کوئی نئی چوڑی، کوئی بھاری سا گلوبند، تولے دو تولے کے جڑاؤ کنگن بھی اپنی سگھی سہیلیوں کو دکھائے ہوں گے جو "ان" کی آنکھ بچا کر بنائے گئے۔ اور پھر ان کا مقصد کوئی سجاوٹ دکھاوٹ تھوڑے ہی ہے بلکہ محض یہ ہے کہ کہیں وقت پڑے تو کام آ جائیں۔ ورنہ اگر مردوں کے حساب کتاب پر چلا جائے تو نہ کسی کی ڈولی وداع ہو اور نہ کسی کا مردہ اُٹھے۔

ڈولی وداع کرنے اور میت اٹھوانے کے اسی خوف کی بدولت ہم میں سے تقریباً سب ہی حتی المقدور یہ کوشش ضرور کرتی ہیں کہ جیسے تیسے بھی ہو بُرے یا بھلے دنوں کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور بچا لیا جائے۔ اور بچانے کا سب سے بڑا طریقہ سونے کے زیور بنوانا یا روپے کو سب کی نظروں سے چھپا کر رکھنا ہے۔

لیکن تجربے نے بتایا ہے کہ اگر روپیہ بچایا جا سکے (اور آج کے دور کے غیر محفوظ حالات میں بچانا ضرور چاہیئے) تو وہ اس طرح سے ہرگز بچانا نہیں چاہیئے۔

اوّل تو یہی بات کہ سونے کی قدر روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ زیور کے طور پر اس کے استعمال کا رواج کم ہی نہیں ہو رہا بلکہ اعلیٰ سوسائٹی میں تو بہت اچھا بھی نہیں سمجھا جاتا۔ پھر ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ زیور کا رکھنا اب بھی بہت غیر محفوظ ہے اور سو طرح کے خطروں سے اٹا پڑا ہے۔ گھر میں یا زمینوں میں چھپا کر رکھنے والوں کا حشر جو ہوتا ہے اُس کی کئی مثالیں میرے ہی سامنے ہیں اور آپ کو بھی یاد ہوں گی۔ پھر برسوں بعد اگر زیور کا فیشن پرانا ہو جائے تو اُس کے دوبارہ بنوانے کی اُجرت بھی کبھی کبھی اس کی ایک تہائی قیمت تک جا پہونچتی ہے۔ گویا برسوں میں اس کی اصلی قیمت کم ہی ہونے کے امکانات ہیں۔ ہاں قیمت ضرور بڑھ سکتی ہے لیکن اگر اس کا مقابلہ اُس خوف اور پریشانی سے کیا جائے جو اس کی چوری کی پریشانی سے لگی رہتی ہے تو قیمت میں اضافہ بھی بہت معمولی ثابت ہوگا۔ سونے کو محفوظ رکھنے کا ایک دوسرا طریقہ بنک کے سیف میں رکھنا ہے۔ یہ گھر میں رکھنے سے محفوظ ضرور ہے لیکن اکثر حالات میں کافی مہنگا پڑتا ہے کیونکہ سیف کا کرایہ جتنا ہوتا ہے،

اُس سے کئی گنا زیادہ نفع اسی سونے کو روپیہ بنا کر کسی کاروبار میں لگانے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

پھر یہ بھی تو بات عام ہے کہ آج نہیں تو کل حکومت سارے سونے کو ایک "مناسب" قیمت دے کر ضبط کر لے گی۔ گویا آپ سونا گھر رکھیں یا بنک میں کسی صورت میں محفوظ نہیں ہے۔

رہی نقدی جمع کرنے کی بات تو چوری کا کھٹکا تو اس میں رہتا ہی ہے پھر یہ بچت محفوظ بھی نہیں کیوں کہ جوں ہی چھوٹے موٹے خرچ پڑتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ اسی بچت میں سے کچھ کر یدکر خرچ کر لیا جائے۔ یوں یہ تو یاد ہی ہوگی کہ جنگ کے بعد ۱۹۴۶ء میں جب کانگریس مسلم لیگ کی ملی جلی سرکار نے ایک ہزار روپے کے نوٹوں کو ناجائز سکہ قرار دے دیا تھا تو ہارٹ فیل کی کتنی وارداتیں ہوتی تھیں؟ نوٹوں کو دیمک کے حوالے کرنے سے تو بہتر ہے کہ ان کا کوئی مناسب استعمال کیا جائے۔

لیکن سوال یہی ہے کہ یہ مناسب استعمال کیا ہو! اس سلسلے میں یاد رکھنے کی ایک بنیادی بات یہ ہے کہ بچت کا اصلی فائدہ تب ہی ہے جب اُسے عادت کے طور پر اپنایا جائے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ بچت کا ڈھنگ ایسا ہو جس کی وجہ سے ہر مہینہ ہم لوگ کچھ نہ کچھ بچانے پر مجبور ہو جائیں۔ اس کے طریقے تو کئی ہیں لیکن یہاں پر محض اُن ہی طریقوں کا ذکر کیا جائے گا جو بہت عام ہیں۔ اور جن پر آسانی کے ساتھ عمل بھی ہو سکتا ہے۔

اِن میں سے اہم ترین ڈھنگ بیمہ پالیسی کا ہے۔ ہمارے ملک میں یہ ایک عام خیال ہے کہ بیمہ پالیسی کا مقصد محض ناگہانی حادثے ہی سے اپنے آپ کو بچانا ہے۔ اگر یہ بات بھی ہوتی تو کوئی بُرائی نہیں تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیمہ کا مقصد اس سے کچھ زیادہ اہم ہے آج کل اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہم ہر مہینے کچھ نہ کچھ بچاتے چلے جاتے ہیں جو ایک خاص مدت کے بعد ہمیں کچھ منافع (بونس) کے ساتھ مل جاتا ہے۔ مثلاً فرض کیجئے آپ نے یا آپ کے میاں نے پچیس برس کی عمر میں زندگی کا دس ہزار روپیہ کے لئے بیمہ کروایا۔ آپ کو یہ بتانا ہوگا کہ یہ دس ہزار روپیہ آپ کتنے برسوں میں ادا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ مدت تیس برس تک کی ہو سکتی ہے۔ اس طرح آپ جتنی کم عمر میں بیمہ کروائیں گی پریمیم کی اتنی ہی کم رقم ادا کرنا پڑے گی۔ اب آپ جتنی رقم کا بیمہ کروائیں گی اس کی پریمیم کی رقم آپ ہر مہینے تین مہینے، چھ مہینے یا سال بھر میں ادا کرتی جائیں گی۔ اگر خدانخواستہ پہلے دو برسوں کے پریمیم کی ادائیگی کے بعد کوئی بُری بات پیش آجائے تو بیمہ کنندہ کی موت پر، ادا کی ہوئی تمام رقم اس کے لواحقین کو واپس مل جائے گی۔ لیکن اگر زندگی ٹھیک طرح سے چلتی رہے تو اُس وقت یعنی آخری عمر میں جب کہ آپ کو روپے کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی یہ پوری رقم بعد بونس کے آپ کو واپس مل جائے گی۔ اندازاً دس ہزار روپے جیسے کی رقم پچیس برسوں میں کوئی تیرہ ہزار روپے بن جاتی ہے۔

اس میں ایک اچھائی اور بھی ہے وہ یہ ہے کہ فرض کیجئے آپ کو روپے کی اشد ضرورت پڑ گئی ہے۔ تو اپنی پالیسی کے سہارے آپ کارپوریشن یا کسی دوسری سرمایہ کار کمپنی سے اپنی ضرورت کے لئے خاصا معقول قرض معمولی سود کی شرح پر بھی لے سکتی ہیں

اسی طرح یہ خوف بھی نہیں ہونا چاہئے کہ اگر پریمیم کی ادائیگی بیچ ہی میں رک گئی تو وہ تمام رقم ضائع ہو جائے گی جواب تک آپ نے جمع کروائی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ اگر پہلے دو سال کی ادائیگی کے لئے تو رقم کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ دو سال کے بعد کی ادائیگی ہو چکی ہے کارپوریشن آپ کو خود قرض دے سکتی ہے۔ جس کے لئے کچھ معمولی سود تو دینا پڑتا ہے لیکن پالیسی برقرار رہتی ہے۔ یا پھر جب آپ دینے کے قابل ہوں تو بقیہ پریمیم (معہ سود) ادا کر کے اپنی پالیسی کی تجدید کروا سکتی ہیں یا اگر یہ بھی ممکن نہیں تو پھر کم از کم وہ رقم جو ادا ہو چکی ہے بیمے کی میعاد پوری ہونے پر یا ناگہانی موت کی صورت میں واپس مل ہی جاتی ہے۔

بڑوں کی زندگی کے علاوہ بچوں کی تعلیم یا دوسری ضروریات کے لئے بھی بیمہ ہو جاتا ہے۔ جس کے لئے پریمیم کی شرح مختلف ہوتی ہے۔ اس طرح کئی کمپنیوں کی آنیوالی کئی اہم ضروریات بڑے اچھے ڈھنگ سے پوری ہو سکتی ہیں۔

بچت کا ایک دوسرا ڈھنگ سیونگ سرٹیفکیٹ ہیں۔ یہ سرٹیفکیٹ کسی بھی ڈاکخانہ سے کسی بھی رقم میں مل سکتے ہیں۔ یہ بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو دس برس بعد ہی بھنائے جا سکتے ہیں لیکن دس برسوں بعد دس روپے کے تقریباً ساڑھے چودہ روپے بن جاتے ہیں۔ دوسرے سرٹیفکیٹ وہ ہیں جن کے سود کی شرح تو کم ہوتی ہے لیکن جو اصل قیمت پر کسی بھی وقت بھنائے جا سکتے ہیں۔ اگر آپ انہیں بھنانا نہ بھی چاہیں تو ان کے عوض آپ کو مناسب شرح سود پر قرض مل سکتا ہے حالات کے بہتر ہوتے ہی جس کی ادائے گی کی جا سکتی ہے۔

بچت کے سرٹیفکیٹوں میں ایک اچھی بات یہ بھی ہے کہ یہ ہر مہینے اپنی سہولت کے مطابق خریدے جا سکتے ہیں اور مدت مقررہ کے بعد اسی طرح دھیرے دھیرے واپس آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس طرح موت کے خاتمے کے بعد بھی جو رقم ملتی ہے وہ دھیرے دھیرے واپس ملتی رہتی ہے تاکہ آہستہ آہستہ ہی آپ کے کام آسکے۔ بات تو معمولی ہی سی ہے لیکن اہم ضرور ہے کہ ان سرٹیفکیٹوں کے گم، چوری یا تلف ہو جانے پر بھی رقم ضائع نہیں ہوتی کیوں کہ سرٹیفکیٹ کے اجرا کے وقت اس کا ریکارڈ ڈاک خانے میں بھی رکھا جاتا ہے اور ہمیشہ سرکاری ریکارڈ سے اُن کا نمبر نکلوا کر اُن کی دوسری یعنی ڈپلیکیٹ کاپی حاصل کی جا سکتی ہے۔

بچت کا ایک دوسرا اور عام طریقہ ڈاک خانے میں سیونگ اکاؤنٹ کھولنے کا

ہے۔ اس طرح آپ ہر ماہ جتنی رقم بھی چاہیں قریبی ڈاک خانے میں جمع کروا سکتی ہیں جو آپ کو ضرورت کے وقت واپس بھی مل سکتی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ بہتر ڈھنگ یہ ہے کہ کسی اچھے بنک میں سیونگ اکاؤنٹ کھول لیا جائے۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ آپ کی رقم بنک میں محفوظ رہتی ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے یہ انتظام کر لیا جاتا ہے کہ آپ ہفتے میں ایک بار سے زائد اپنا روپیہ نہیں نکلوائیں گی اور وہ بھی کُل جمع شدہ رقم کے ایک چوتھائی سے زیادہ نہیں ہوگا۔ بنک اس کے عوض آپ کو کچھ سود بھی دے گا اور بعض بنک تو سیونگ اکاؤنٹ رکھنے والوں کو اُن کی رقم کے مطابق کچھ بونس بھی دیتے ہیں جو اچھا خاصا ہوتا ہے۔

بنک میں حساب کھولنے کا ایک اور ڈھنگ فکسڈ ڈیپازٹ بھی ہے۔ اس کے مطابق ایک مخصوص رقم ایک خاص مدت کے لئے جمع کروا دی جاتی ہے۔ اُس سے پہلے یہ رقم نکالی نہیں جا سکتی اور بعد میں بنک یہ رقم بمعہ سود واپس کر دیتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے اگر ضرورت محسوس ہو تو بنک اگر چاہے تو اپنی طرف سے کچھ قرض آپ کو دے سکتا ہے جس کا سود عموماً فکسڈ ڈیپازٹ کے سود سے کچھ زیادہ ہوتا ہے اور جس کی رقم آپ کے ڈیپازٹ کے مقابلے میں کم ہوتی ہے۔ بعض مرتبہ یہ فکسڈ ڈیپازٹ مخصوص مقاصد کے لئے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً بنک آپ کی رقم آپ کو اسی وقت دیتا ہے جب کہ آپ نے وہ کام کرنے ہوں جن کے لئے آپ نے رقم محفوظ کروائی تھی۔ اس طرح بچوں کی تعلیم مکان کی تعمیر اور شادی بیاہ کے لئے ڈسپلن کے ساتھ بچت کرنے کی عادت ڈالی جا سکتی ہے۔

سنا ہے اگلے چند ماہ میں حکومت ہند ایک اور طرح کے بچت سرٹیفکیٹ جاری کرنے والی ہے۔ اب تک جو اطلاعات ملی ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ "انعامی بانڈ" کہلائیں گے، اور ان میں لگائی ہوئی رقم دس سال بعد اتنی کی اتنی ہی واپس مل جائے گی۔ پھر ان میں روپیہ لگانے والوں کو کیا فائدہ ہوگا؟ بس یہی، کہ ہر سال، چھ مہینے بعد سب انعامی بانڈ لینے والوں میں چند لاکھ روپے قرعہ اندازی سے تقسیم کر دئے جائیں گے۔ اس طرح کچھ لوگوں کو دس روپے کے بدلے لاکھوں روپے مل جائیں گے، باقی لوگوں کو سود تو نہ ملے گا، مگر ان کی اصل محفوظ رہے گی۔ اپنی بچت کا ایک تھوڑا سا حصہ انعامی بانڈز میں رکھنا بھی اچھا ثابت ہو سکتا ہے، لیکن چوں کہ جب تک قسمت ساتھ نہ دے، ان میں لگائی ہوئی رقم بڑھتی نہیں، اس لئے اپنی تمام بچت ان میں لگانا عقل مندی نہ ہوگا۔

عام گھریلو بچتوں کے یہ طریقے تو محض معمولی سے اشارے ہیں لیکن جو بہنیں اس ضمن میں زیادہ تفصیلی مشورہ چاہیں وہ بنتِ سقراط کو "بانو" کی معرفت جوابی خط لکھ کر پوچھ سکتی ہیں۔ انہیں مناسب مشورہ اور مکمل معلومات مہیا کرنے کی پوری پوری کوشش کی جائے گی۔

●●

دلچسپ نئی کتابیں

نرگسہ (رئیس احمد جعفری) ۶ روپے ۵۰ نئے پیسے
پگلی (شوکت تھانوی) ۳ روپے
انسانیت موت کے دروازے پر (مولانا آزاد) ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے
مولانا آزاد تنقید و تبصرہ کی نگاہ میں ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے
جوار بھاٹا (جمنا داس اختر) ۴ روپے ۵۰ نئے پیسے
چنگیز خاں (رئیس احمد جعفری) ۶ روپے

بدنام (رئیس احمد جعفری) ۶ روپے ۷۵ نئے پیسے
رقیب (عذرا جمال) ۷ روپے
کیا شادی کیا غم (قیصی رام پوری) ۵ روپے
فاتحہ مگہ (ایم اسلم) ۴ روپے ۲۵ نئے پیسے
میٹھے بول میں جادو ہے (گارگی) ۶ روپے ۷۵ نئے پیسے

قاشیں (نریش کمار شاد) ۳ روپے
میک اپ (راشد سہوانی) ۵ روپے ۲۵ نئے پیسے
ریحانہ (ایم اسلم) ۷ روپے
جانی ہوئی پہچان (وحشی محمود آبادی) ۴ روپے
آنچ (رئیس احمد جعفری) ۶ روپے ۳۷ نئے پیسے
بھائی بھائی (غلام جیلانی برق) ۵ روپے

نئے قدم ناول (ہاجرہ نازلی) ۴ روپے ۵۰ نئے پیسے۔ ایک دل ہزار غم ناول (عزیز بدایونی) ۲ روپے ۷۵ نئے پیسے۔ اندھیرے ناول نیا ایڈیشن (اختر عادل روپ) ۲ روپے۔ پہلی لڑکی نیا ایڈیشن (راز داں ایم اے) ۲ روپے ۹۵ نئے پیسے۔ اندھیرے ہندی (اختر عادل روپ) ۳ روپے ۹۵ نئے پیسے۔ دعوتِ حق (مولانا آزاد) ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے۔ عیدین (مولانا آزاد) ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے۔ حیاتِ سرمدؒ (مولانا آزاد) ۲۷ نئے پیسے۔ سارا جہاں اُداس ہے (قمر تسکین) ۴ روپے۔ عکسِ جام (عبدالحمید عدم) ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے۔ عیاد (ایم اسلم) ۳ روپے بُرے لوگ (عزیز احمد) ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے۔ بے بس (جگدیش بھارتی) ۳ روپے ۷۵ نئے پیسے۔ ایک عورت دو مرد (م۔ غوری) ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے۔ بزدل (م۔ غوری) ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے۔ آوارہ لڑکی (ریاض راشد) ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے۔ بس کرو (عابد رشید) ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے۔ عجمت (راقم صدیقی) ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے۔ بیوی (شوکت تھانوی) ۳ روپے نگاہِ جمال (عادل رشید) ۶ روپے۔ آواز دے کہاں ہے (بھاگ سنگھ) ۳ روپے ۵۰ نئے۔ چار دل چار راہیں (خواجہ احمد عباس) ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے۔ ان کا خیال (قیصی رام پوری) ۵ روپے ۵۰ نئے پیسے۔ گریز (عزیز احمد) ۶ روپے۔ بلندیاں (عارف ماہروی) ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے۔ سانجھ کی بیلا (گلشن نندہ) ۳ روپے ۷۵ نئے پیسے۔ رازداں (احسن فاروقی) ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے۔ ایک سوال (امرتا پریتم) ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے۔ دولت کے کھیل (خان محبوب طرزی) ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے۔

شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی

دین دنیا کی فلاح کیلئے اِن کتابوں کا مُطالعہ ضروری ہے

قرآن اور عورت	اردو پیپر ۲۵ نئے پیسے	رسول اللہ کی نعتیں اور سلام	۶۲ نئے پیسے	رنگین عکسی	۸۷ نئے پیسے		
نصائح زرّیں	۴۰ نئے پیسے	احسن المواعظ	۲ روپے ۵۰ نئے پیسے	رنگین عکسی مترجم	۱۲ نئے پیسے		
دربارِ رسالت کے فرمان	۴۰ نئے پیسے	تذکرہ ابوذر غفاری	۳۷ نئے پیسے	تعلیم الاسلام مکمل چار حصے	اردو پیپر ۵۰ نئے پیسے		
آخرت کا سفرنامہ	۲ روپے ۵۰ نئے پیسے	یازدہ سورہ عکسی مترجم رنگین مجلد	اردو پیپر ۲۵ نئے پیسے	شیرول خاتون	۲ روپے ۵۰ نئے پیسے		
اسلامی تاریخی کہانیاں	۲ روپے	سورہ کہف مترجم عکسی رنگین	۳۱ نئے پیسے	فضائل امت محمدیہ	۵۰ نئے پیسے		
شرعی نماز	اردو پیپر	بزرگوں کے بہترین اقوال	۲۵ نئے پیسے	دوسرا حصہ	۱۳ نئے پیسے		
معجزات النبی	۷۵ نئے پیسے	تقاریر	۲ روپے	صحابہ کرام کی سچی کہانیاں پانچوں حصے مکمل	۴ روپے		
اعمال قرآنی	اردو پیپر	فضائل ذکر	اردو پیپر ۶۲ نئے پیسے	مخصوص مسائل	۳۷ نئے پیسے		
اچھا خاندان	اردو پیپر ۲۵ نئے پیسے	تنہائی کا ہمنشین پہلا حصہ	۱۳ نئے پیسے	حالاتِ جہنم	۳۷ نئے پیسے		
اچھی بیوی	اردو پیپر ۲۵ نئے پیسے	رسول اللہ کی نصیحتیں	۳۷ نئے پیسے	برکات الصالحین (دو حصے)	اردو پیپر ۷۵ نئے پیسے		
درس قرآن	۲ روپے	تحفۃ المبلغین	۲ روپے	چالیس سبق	۲۵ نئے پیسے		
اسلامی اخلاق	اردو پیپر	حالاتِ برزخ	۷۵ نئے پیسے	شاہراہِ ترقی	۵۰ نئے پیسے		
اسلامی آداب	اردو پیپر ۵۰ نئے پیسے	فضائل نماز	۹۴ نئے پیسے	حکایاتِ صحابہ	۲ روپے		
خدا کا انعام	اردو پیپر ۲۵ نئے پیسے	نصائح امام غزالی	۵۰ نئے پیسے	صحابہ کرام کی جانبازیاں	۵۰ نئے پیسے		
اوصاف مومن	اردو پیپر	صلاح انقلاب	۳۷ نئے پیسے	انتخاب صحاح ستہ	۴ روپے	مضامین احمد سعید	۲ روپے
جنت کا ٹکٹ	۷۵ نئے پیسے	اسلامی نام	۲۵ نئے پیسے	مسلمان خاوند	اردو پیپر	شوکت آرا بیگم	۲ روپے
فضائل تبلیغ	۳۷ نئے پیسے	چھ باتیں	۳۷ نئے پیسے	خدا کی جنت	۷۵ نئے پیسے	حیات المسلمین	اردو پیپر ۷۵ نئے پیسے
مسلمانوں کی پستی کا واحد علاج	۲۵ نئے پیسے	تبلیغی تحریک کے سات نمبر	اردو پیپر ۷۵ نئے پیسے	صحابی عورتوں اور بچوں کی کہانیاں	۶۲ نئے پیسے	نماز کی باتیں	اردو پیپر ۲۵ نئے پیسے
اسلامی زندگی	۲۵ نئے پیسے	عطائے قدسی	۷۵ نئے پیسے	اردو آسان قاعدہ	۱۶ نئے پیسے	دین کی باتیں	۳ پیپر ۷۵ نئے پیسے
پارہ عم مترجم	۳۷ نئے پیسے	مسلمان بیوی مکمل	اردو پیپر ۳۷ نئے پیسے	عکسی جیبی مترجم نماز	۱۹ نئے پیسے	جنت کی کنجی	۳ پیپر ۲۵ نئے پیسے
لطائف فارسی	۵۰ نئے پیسے	ازواجِ مطہرات	۳۷ نئے پیسے	تذکرہ ابوذر و انصاری	۲۵ نئے پیسے	دوزخ کا کھٹکا	۲ پیپر ۲۵ نئے پیسے
پیغمبری دعائیں	اردو پیپر	تبلیغی بہشتی زیور	۲ روپے ۷۵ نئے پیسے	سورہ یٰسین عکسی مترجم	۱۹ نئے پیسے	مشکل کشا	۲ پیپر ۲۵ نئے پیسے
ہماری تعلیم مجلد	اردو پیپر	قرآنی قاعدہ	۱۳ نئے پیسے	نماز مترجم عکسی رنگین	۱۶ نئے پیسے	تعلیم الدین	اردو پیپر ۷۵ نئے پیسے
اخلاص نیت	۶۲ نئے پیسے	نماز مکمل	۱۹ نئے پیسے	وعظِ بے نظیر	اردو پیپر ۲۵ نئے پیسے	فاطمہ کا چاند	۲ روپے
خدا کا ذکر	۷۵ نئے پیسے	تذکرہ سلمان فارسی	۳۱ نئے پیسے	جانوروں کے حقوق	۲۵ نئے پیسے	انجمن حمایت اسلام کا قاعدہ	۱۳ نئے پیسے

فخرِ موجودات سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم
کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرنیوالی

ہمارے نبی کی پاک بیبیاں

مخالفین اسلام کے کھوکھلے اعتراضات کا
مدلل جواب دینے کیلئے رسولِ پاک کی ازواج
مطہرات کے بارے میں مفصل معلوماتی کتاب جسمیں
نبی کی شان اور وقار کو ملحوظ رکھ کر یہ بتایا گیا ہے
کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کونسی بیوی
سے کن حالات میں نکاح کیا؟ خدا کے احکامات
کی کس طرح پیروی کرتے ہوئے کس کس
عمر میں نکاح کئے۔ کون سی بیوی سے
کتنی اولادیں ہوئیں۔

قیمت ۶۲ نئے پیسے

شیخ بک ڈپو، کھٹوا بک ڈپو، بانو بک ڈپو اور مکتبہ دینیات کی
فہرستیں مفت منگائیے

مکتبہ دینیات، آصف علی روڈ، نئی دہلی

مسز موہنی دیوان کی چچازاد بہن روما دو ماہ کی چھٹی گزارنے کے لئے ان کے ہاں دہلی آئی ہوئی تھی۔ وہ شملہ سے آئی تھی اور اپنی دل چسپی کا سامان اپنے ساتھ ہی لائی تھی۔ اس کے اٹیچی میں مختلف ڈیزائن کے تاشوں کے کئی ایک پیکٹ موجود تھے۔ پہلے ہی روز ناشتہ کے بعد روما نے نوکر کو جلدی سے میز خالی کرنے کا حکم دیا اور تاش نکال کر میز پر پھیلا دیئے۔

ہرمنس دیوان بہت مشغول قسم کا آدمی تھا۔ اس کا پلائی وُڈ کا بزنس تھا اور اسے تاش سے کوئی خاص دل چسپی نہ تھی۔ لیکن روما کے ساتھ تاش کھیلنے سے وہ انکار نہ کر سکا۔

روما اور موہنی امرت سر کے ایک متمول خاندان کی لڑکیاں تھیں جن کا رنگ رُوپ شملہ کی صحت بخش و رومانٹک فضا میں پرورش پا کر خوب نکھر چکا تھا۔ شادی سے پہلے ہرمنس دیوان کو ان دونوں میں سے کسی ایک کو پسند کرنے کا موقعہ دیا گیا تھا۔ لڑکیوں کے والدین نے ڈیوی کو زمیں ڈنر کا اہتمام کیا تھا، ہرمنس دیوان کو دونوں لڑکیاں پسند آگئیں۔ دونوں ہی گوری چٹی تھیں، دونوں کے بال بڑے چمک دار اور خوبصورت ڈھنگ سے بنائے ہوئے تھے۔ پوشاک بھی دونوں نے بہت بڑھیا پہن رکھی تھی۔ بات چیت، لہجہ اور مسکرانے کا ڈھنگ بھی ایک جیسا ہی تھا۔

ہرمنس دیوان کے سامنے ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ وہ کسے پسند کرے اور کسے ناپسند؟ ڈنر کے خاتمہ پر وہ تھوڑی دیر کے لئے باتھ روم میں گیا اور وہیں جیب سے کاغذ نکال کر اس کے دو ٹکڑے کر کے ایک پر موہنی اور دوسرے پر روما کا نام لکھ دیا۔ پھر کاغذ مروڑ کر گولیاں سی بنا ڈالیں اور مٹھی میں بند کر کے مٹھی کو زور سے ہلایا۔ پھر ایک پرچی کھولی جس پر

لکھا تھا "موہنی"۔

باتھ روم سے باہر نکل کر اس نے اپنی میز کے قریب آکر موہنی کی طرف مسکرا کر دیکھا زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہ پڑی۔ ہربنس دیوان کی شادی موہنی سے ہوگئی۔

لیکن اس کے دل میں روما کے لئے بھی ویسی ہی عزت، ویسی ہی محبت اور اُتنا ہی خلوص تھا جتنا موہنی کے لئے۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ ان دو مہینوں میں وہ روما کو خوب سیر کرائے گا، خوب عیش کرائے گا تاکہ آئندہ زندگی میں ان دونوں کی یاد کبھی اس کے دل سے فراموش نہ ہو۔

لیکن اس وقت روما سے تاش کھیلتے ہوئے اسے وقت کی تنگی کا احساس ہو رہا تھا۔ آج ٹھیک ساڑھے دس بجے ریلوے بورڈ کے ایک ڈپٹی ڈائرکٹر سے اسے ملنا تھا، جہاں وقت پر پہنچنا بہت ضروری تھا ورنہ پلائی وڈ کے ایک بہت بڑے ٹنڈر کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ تھا۔

روما نے جلدی سے دو تین بازیاں جیت لیں اور جیجا جی پر ڈیڑھ سو پوائنٹ چڑھا دیئے۔ ہربنس نے تاش کے پتے میز پر پھینکتے ہوئے چھوٹے بھائی کو آواز دی۔

"او گلشن، چل ادھر آ۔ بڑا تاش کا چمپئن بنا پھرتا ہے۔"

اور گلشن کے آنے پر اس نے کہا "مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔ تم روما کے ساتھ تاش کھیلو، لیکن ایک نیا پیسہ فی پوائنٹ سے زیادہ نہ لگانا۔ لوٹ لے گی یہ تمہیں۔"

گلشن تاش کا چمپئن تو نہ تھا لیکن بڑے بھائی کی نسبت تاش میں زیادہ ہوشیار تھا۔ پہلی ہی بازی میں روما کو پتہ چل گیا کہ گلشن سے جیتنا آسان نہیں۔ لیکن گلشن کو تاش سے زیادہ روما میں دلچسپی پیدا ہونے لگی، اور وہ جان بوجھ کر ہارنے لگا۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک تاش کھیلنے کے بعد جب موہنی اٹھ کر دوسرے کمرہ میں چلی گئی تو گلشن نے پوچھا "روما، تم کبھی بنگلور بھی گئی ہو؟"

"نہیں، کیوں؟"

گلشن نے دونوں کہنیاں میز پر ٹکاتے ہوئے کہا "پہلی نظر دیکھنے میں تم پنجابی معلوم نہیں ہوتیں۔ میں بھائی صاحب کے ساتھ بنگلور گیا تھا۔ وہاں کی لڑکیوں کا جو پہناوا اور فیشن میں نے دیکھا اس کی ایک جھلک تمہارے اندر دکھائی دیتی ہے . . . ."

"اور آپ پہلی نظر میں کیا دکھائی دیتے ہیں! جانتے ہیں؟"

"نہیں۔ تم بتاؤ۔"

"فلم ایکٹر آغا" اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ گلشن کو بھی اس کے ساتھ ہنسنا پڑا۔

روما اور گلشن کا رومانس اور تاش کا کھیل ساتھ ساتھ شروع ہوا، موہنی اپنا زیادہ وقت گھر کی آرائش پر صرف کرتی۔ اسے تاش کا زیادہ شوق نہ تھا پھر بھی وہ کبھی کبھی برج کے کھیل میں شامل ہو جاتی تھی۔

گلشن اور روما کو ابھی 'بچہ' سمجھ کر کھلی چھٹی دے دی گئی تھی۔ زیادہ تر ان کا وقت تاش کھیلنے میں صرف ہوتا۔ گلشن نے دیکھا کہ روما کو تاش کا شوق دیوانگی کی حد تک ہے اور وہ ہمیشہ جیتنا ہی چاہتی ہے۔ اسے خوش کرنے کے لئے وہ جان بوجھ کر بازی ہار جاتا تھا۔

گھر سے باہر سینما، ریسٹورنٹ یا کسی پارٹی میں تو ہربنس دیوان ہی انہیں اپنے ساتھ لے جاتا۔ لیکن گھر کے اندر کیا ہو رہا ہے اس بارے میں ہربنس یا موہنی نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ موہنی اکثر گلشن اور روما کو تاش کھیلتے چھوڑ کر اڑوس پڑوس کی عورتوں سے نئے نئے زیوروں اور کپڑوں کے ڈیزائنوں پر گفتگو کرنے کے لئے چلی جاتی تھی۔

قریباً ڈیڑھ ماہ بعد پتہ چلا کہ گلشن اور روما 'بچہ' نہ تھے، جوان تھے اور انہوں نے جوانوں کی سی حرکتیں شروع کر دی تھیں۔

ہربنس اور موہنی نے سنجیدگی سے اس معاملے پر غور کرنے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی اور یہی فیصلہ کر لیا کہ ان دونوں کی جلد شادی ہو جانی چاہیئے۔

روما دو ماہ کی چھٹی گزارنے کے لئے چچازاد بہن کے گھر آئی تھی مگر اب مستقل طور پر وہیں رہنے لگی۔ موہنی اسے دیورانی کے روپ میں دیکھ کر بہت مطمئن تھی۔

ہربنس نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر یہ شادی کرا دی تھی ورنہ وہ کبھی نہ چاہتا تھا کہ روما اس گھر میں مستقل طور سے رہے۔ اس کے اپنے دل میں روما کے لئے جو کمزوری تھی اس پر غالب آنا ہربنس کے لئے دشوار تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ صرف اشد ضرورت کے وقت ہی روما سے بات چیت کرے گا۔ موہنی پر یہی ظاہر کیا کہ روما پر اسے بہت غصہ ہے۔

ہنی مون گزار کر واپس لوٹے تو گلشن کو بڑے بھائی نے ایک کمپنی میں ملازمت دلا دی۔ تنخواہ معقول تھی جس سے وہ اپنا الگ گزارہ چلا سکتا تھا۔ ہربنس کی خواہش تھی کہ گلشن کسی دوسرے علاقہ میں کرایہ کا مکان الگ لے کر رہے، لیکن موہنی متفق نہیں ہوئی۔ اُس نے کہا "لوگ کیا کہیں گے، شادی ہوتے ہی بھائی کو الگ کر دیا اور جب اتنا بڑا اپنا مکان موجود ہے تو گلشن اور روما کرایہ کے مکان میں کیوں جا رہیں؟"

ہربنس اپنی کمزوری موہنی پر ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

گلشن شام کو تھکا ہوا گھر لوٹتا تو روما چائے کی ٹرے کے ساتھ تاش بھی میز پر رکھ دیتی۔ اب گلشن میں تاش کھیلنے کا پہلا سا جوش و خروش نہ رہا۔ وہ کھیلتا تو سہی مگر بڑی غیر دلچسپی سے۔

دو تین ماہ کے بعد وہ روما کی تاش سے بے زار ہو گیا۔ ایک شام اس نے غصہ سے چائے کی پیالی میز پر ٹپکنے کے بعد تاش اٹھا کر روما کے مونہہ پر پھینک دیئے۔ ہربنس بنگلور گیا ہوا تھا۔ موہنی اپنے دیور کو زیادہ ڈانٹ ڈپٹ نہ سکی۔ ناراض ہو کر روما نے جلدی جلدی اپنا اٹیچی تیار کیا اور اسی رات شملہ روانہ ہو گئی۔

اور چھ ماہ کے بعد جب وہ دہلی واپس آئی تو اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ اب روما کا کچھ وقت بے بی کی دیکھ بھال میں گزرتا لیکن جتنا بھی وقت تاش کھیلنے کے لئے ملتا وہ تاش کھیلتی۔ اب اُسے تاش کھیلنے کے لئے گلشن کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے پڑوس میں ایک نئے کرایہ دار مسز کھنہ آکر رہنے لگے تھے۔ کھنہ کی ماں اور بیوی دونوں رمی اور فلاش میں بہت ماہر تھیں۔ اب عموماً دوپہر کو روما مسز کھنہ کے ہاں چلی جاتی اور شام تک وہیں تاش کھیلتی۔ اس دوران میں بچے کی دیکھ بھال زیادہ تر مومنی ہی کرتی تھی۔

رفتہ رفتہ محلے کی چند ایک اور عورتیں بھی اس کھیل میں شامل ہونے لگیں اور یہ چھوٹا سا جُوا گھر بڑی باقاعدگی سے چلنے لگا۔ روما اور مسز کھنہ شاذ و نادر ہی ہارتیں۔ ہارنے والوں میں مسز سنتوکھ سنگھ ایک نئی بیاہتا عورت تھی جس کا بوڑھا خاوند ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کا مالک تھا۔ وہ بڑی افراط سے بیوی کو روپیہ دیتا رہتا تھا۔ مسز سنتوکھ سنگھ زیوروں میں لدی ہوئی آتی، پتہ پھینکتے وقت اس کی کلائی میں پڑی ہوئی سونے کی دو درجن چوڑیوں کی کھنک بڑی سُریلی معلوم ہوتی تھی۔ ایسی ہی کھنک پیدا کرنے کے لئے تقریباً سبھی عورتوں نے حفاظت کے لئے بینکوں کے لاکرز میں رکھی ہوئی اپنی اپنی چوڑیاں نکلوالیں۔

کچھ دنوں کے لئے مومنی کو اپنے میکے جانا پڑا۔ ہربنس بھی جنوبی ہند کے دورہ پر گیا ہوا تھا۔ روما کی تجویز پر جُوئے کا پروگرام اب اسی کے گھر میں چلنے لگا۔ بے بی پنگھوڑے میں پڑا پڑا روتا رہتا۔ اس کی آواز عورتوں کے شور و غل میں دب کر رہ جاتی۔ وقت پر دودھ نہ ملنے کے باعث بے بی سوکھ گیا اور اسے ٹمپریچر رہنے لگا۔ گلشن شام کو گھر آکر اسے سنبھالتا۔ اس کی دیکھ بھال کرتا۔ ہر صبح دفتر جانے سے پہلے روما کو ہدایت دیتا کہ یہ دوائی دو دو گھنٹے کے بعد ضرور بے بی کو دے دینا۔ روما ایک آدھ خوراک دوائی کی دیتی اور اس کے بعد تاش کے کھیل میں ایسی مشغول ہو جاتی کہ دوائی ٹیبل پیس پر پڑی رہتی اور بے بی پنگھوڑے میں پڑا روتا رہتا۔

روما کو بچے سے محبت نہ ہو، یہ بات نہیں تھی۔ وہ بھی بے بی کی حالت دیکھ بہت متفکر تھی لیکن اسے تاش کا اتنا زیادہ جنون تھا کہ کھیلتے وقت وہ دین دنیا سے بالکل بے خبر ہو جاتی تھی۔

ایک ہفتہ بعد ہربنس دیوان گھر لوٹا۔ بڑے شوق سے بے بی کو پنگھوڑے سے اٹھایا لیکن بچے کی حالت دیکھ کر وہ ایک دم گلشن اور روما پر برس پڑا "کیا حالت بنا رکھی ہے بے بی کی۔ دنیا جہان کے ڈاکٹر مر گئے تھے یا دوائیاں ختم ہو گئیں تھیں۔" وہ غصّے سے بڑبڑایا اور پھر اپنے ایک دوست ڈاکٹر کو بُلوا بھیجا۔

ڈاکٹر نے بے بی کی حالت دیکھ کر بتایا کہ اسے کلینک میں رکھنا ضروری ہے جہاں ماں کو بھی ساتھ رہنا ہوگا۔

تین چار دن میں بے بی کی حالت میں معمولی سا افاقہ ہوا۔ روما کے دریافت کرنے پر ڈاکٹر نے بتایا کہ کم از کم ڈیڑھ ہفتہ ہسپتال میں مزید رہنا ہوگا۔

دوپہر ہوتے ہی روما کی حالت اُس شرابی کی سی ہو جاتی جسے وقت پر شراب میسّر نہ ہو۔ کلینک میں ایک پرائیویٹ کمرہ لے رکھا تھا۔ ہربنس دیوان اور گلشن صرف صبح و شام ہی ہسپتال آتے۔ دوپہر کو کوئی بھی نہ آتا تھا۔ اتنا بڑا خالی کمرہ روما کو کاٹنے کے لئے دوڑتا۔

نوکر کھانا لے کر آیا تو روما نے کہا "ذرا مسز کھنہ کو کہنا کہ وہ بے بی کی حالت تو دیکھ جائے۔"

لیکن مسز کھنہ اکیلی نہیں آئی، وہ اپنی پوری پارٹی کو ساتھ لے کر ہسپتال میں بے بی کی حالت دیکھنے پہنچی۔ نرس انہیں کمرہ میں پہنچا کر واپس چلی گئی تھی۔

روما نے مسز کھنہ سے کہا "ابھی دس بارہ دن اور یہاں رہنا ہوگا۔ مجھے تو یہ قید خانہ معلوم ہوتا ہے۔ بالکل قید خانہ! آؤ پانچ دس منٹ فلاش ہی کھیل لیں۔"

اور فرش پر ہسپتال کی دُھلی ہوئی سفید چادر بچھا کر وہ سب عورتیں تاش کھیلنے بیٹھ گئیں، کسی قسم کا شور و غل کئے بغیر، تاکہ ہسپتال کا کوئی آدمی آکر اُن کے رنگ میں بھنگ نہ ڈال دے۔ پتے پھینکتے ہوئے البتہ ان کی کلائیوں میں پڑی ہوئی طلائی چوڑیوں کے کھنکنے کی آواز ضرور آتی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد نرس کمرہ میں داخل ہوئی۔ مسز کھنہ نے پانچ روپے کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ نوٹ کو بلاؤز کے اندر رکھتے ہوئے نرس نے کہا "آپ کب تک کھیلنا چاہتی ہیں؟ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے پہلے یعنی چار بجے تک یہ کھیل ختم کر دینا ہوگا۔"

"ہو جائے گا۔" مسز کھنہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہی کہا "چار بجے آکر اپنا انعام لے جانا۔"

نرس نے دوائی کی ایک شیشی روما کو دکھاتے ہوئے کہا "آدھ آدھ گھنٹہ بعد اس دوائی کی ایک خوراک بے بی کو پلا دیویں۔ میں چار بجے سے پہلے اس کمرہ میں نہیں آؤں گی۔"

روما نے ایک سرسری سی نظر دوائی کی شیشی پر ڈالی اور پھر تاش میں محو ہو گئی۔ نرس دروازہ کے کواڑ بند کرتے ہوئے باہر چلی گئی۔

اڑھائی تین گھنٹے تک خوب زوروں سے فلاش چلی۔ آج مسز سنتوکھ سنگھ کی نند بھی ساتھ آئی ہوئی تھی جو اپنی بھاوج کی خوب مدد کر رہی تھی، لیکن روما کی قسمت زوروں پر تھی۔ تمام عورتوں کا روپیہ سمٹ کر روما کے پرس میں جا چکا تھا۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔

آخری بازی تھی۔ مسز کھنہ کی ساس پتے پھینک چکی تھی۔ دو تین چال کے بعد مسز سنتوکھ سنگھ کی نند نے اُسے مسز کھنہ سے مِل جانے کے لئے کہا مگر وہ بھی آپ ہو گئی۔

اب مقابلہ مسز کھنہ اور روما میں تھا۔

مسز کھنہ نے کہا "شو"

"روپیہ لگاؤ۔"

"روپیہ تو نہیں ہے۔ اُدھار۔"

"آج اُدھار نہیں چلے گا۔" روما نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔

اِسی دَوران میں نرس دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور میز پر دوائی کی شیشی جوں کی توں دیکھ کر بولی "بے بی کو دوائی نہیں دی گئی کیا؟"

"اوہ! میں بھول گئی۔" روما نے جواب دیا اور مسز کھنّہ سے مخاطب ہو کر بولی "روپیہ نہیں ہے تو یہ چوڑیاں ہی اُتار کر رکھ دو۔"

مسز کھنّہ کو غصّہ آگیا۔ اس کے پاس تین غلام تھے۔ اُنہیں کے بَل بُوتے پر اُس نے کلائی سے چوڑیاں اُتارنا شروع کیں۔

نرس دوائی کی خوراک بھر کر پنگھوڑے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

مسز کھنّہ نے چوڑیاں اُتار کر سامنے رکھتے ہوئے کہا "شو۔"

روما نے پتّے چُوم کر فرش پر پھیلا دیئے "تین بیگم۔"

مسز کھنّہ کا رنگ اُڑ گیا۔ تین غلام اُس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گر پڑے۔

عین اُسی وقت نرس نے چلّا کر کہا "بے بی تو مر چکا ہے میم صاحب۔"

روما کے مونہہ سے ایک چیخ نکلی۔ جلدی جلدی مسز کھنّہ سے جیتی ہوئی چوڑیاں سمیٹ کر پرس میں ڈالیں اور "ہائے بے بی" کہتے ہوئے پنگھوڑے کی طرف بڑھ گئی۔

●●

اپنی علمی اور ادبی قابلیت بڑھانے کے لئے

نول کشور پریس کی قابلِ قدر کُتب منگائیے

ایک عظیم الشان اُردو ڈکشنری لغات کشوری بلا جلد	۷ روپے
مجلد	۸ روپے ۵۰ نئے پیسے
تاریخ ادب اُردو	۱۰ روپے
الف لیلہ مکمل کلاں اُردو	۶ روپے
گلستان سعدی مترجم	۲ روپے ۵۰ نئے پیسے
بحر الفصاحت مجلد	۱۰ روپے
کلیات نظیر اکبر آبادی مجلد	۱۲ روپے
تفسیر قادری مکمل	۲۲ روپے
ہماری شاعری مجلد	۴ روپے

بانو بک ڈپو آصف علی روڈ نئی دہلی

تین اچھّے ناول

شاہد رعنا

گناہوں کا دَلدل، شباب کا نکھار، حُسن کی رعنائیاں اور پھر رقص و سرود کی محفلیں۔ اصلاحِ حال کی طرف بڑھتے ہوئے لرزتے قدم، کامیاب کمزور اصلاحی کوشش۔ یہ سب کچھ قاری سرفراز حسین کے اس ناول کا نچوڑ ہے جو ہر تعلیم یافتہ کی نظر سے گزر کر اصلاح و اخلاق کا پیغام دل کی گہرائیوں تک پہنچا ہے۔

موجودہ سماج کی ایک گھناؤنی تصویر کا دوسرا رُخ ہے جو انسان کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ ناول کئی بار چھپ چکا ہے اور کئی بار چھپے گا۔ اس کا پیغام ہمیشہ مختلف فطرتوں پر مختلف اثر چھوڑے گا، جو ہر صورت میں تعمیری ہوگا۔

کتابت، طباعت عمدہ بہترین۔ سہ رنگا گرد پوش۔ کاغذ سفید چکنا۔

قیمت مجلد ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے

فوزیہ

حضرت امیر معاویہؓ کے دَورِ خلافت کی ایک پرجوش داستان۔ فتح قسطنطنیہ کی دل ہلا دینے والی خونچکاں معرکہ آرائیاں۔ مسلمانوں اور رومیوں کی نبرد آزمائی جس میں شوقِ شہادت اور ذوقِ شجاعت کے عدیم النظیر معرکے۔ ایمان کی تر و تازگی کا سبب بنتے ہیں۔ ایک مردِ مجاہد کی اولوالعزمی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ عشق و محبّت کی خاموش رنگین داستان، جس میں رومانی دنیا کی رنگینی بھی ہے، جوشِ ایمان بھی ہے۔ بہترین زبان، بہترین خیالات کا بہترین مرقّع۔ قیمت آٹھ روپے۔

بھرم

ایک ایسے نوجوان کی داستانِ عشق و محبّت جس نے زندگی کی اندھیری راتوں کو اپنی جدوجہد سے نورِ سحر میں ڈھال لیا، جس میں ماں کی مامتا کے ساتھ ساتھ سوتیلی ماں کی نفرت بھی ہے، دو سلگتی ہوئی جوانیوں کی کہانی جس میں شعلے بھی ہیں، شبنم بھی۔ آنسو بھی ہیں اور مسکراہٹیں بھی۔ ایک ایسا دلچسپ ناول جو شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر نہیں چھوڑا جا سکتا۔

عشرت کرتپوری کا لکھا ہوا یہ ناول ضرور پڑھئے۔ قیمت مجلد تین روپے

شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی

قریب تصوّر

ابھی ابھی میرے جلتے ہوئے خیالوں میں
تمہاری یاد کسی ادھ کھلے کنول کی طرح
عجیب ناز سے شرما کے مُسکرائی تھی

وہ دل جو آج اندھیروں کی ایک بستی ہے
وہاں بھی جوت محبّت کی جگمگائی تھی
ابھی ابھی میرے جلتے ہوئے خیالوں میں

اور اس مہکتی ہوئی جوت کے اُجالے میں
ہمارے پیار کی یادیں نکھر نکھر سی گئیں
بس ایک لمحہ کو آئی تھی زندگی اِن میں
پھر اُس کے بعد وہ یادیں تو جیسی مر سی گئیں

اور اب یہ کس کو خبر ہے مری جوانی نے
چمکتے ہنستے ہوئے دِن کبھی گزارے ہیں
مری نظر بھی ستاروں کے ساتھ کھیلی ہے
پر اب نصیب میں اُجڑے ہوئے نظارے ہیں

میں اپنی آگ میں جلتی تو ہوں مگر پھر بھی
جُھلس دیئے ہیں غموں نے دل و جگر پھر بھی

ابھی ابھی میرے جلتے ہوئے خیالوں میں
تمہاری یاد کسی ادھ کھلے کنول کی طرح
عجیب ناز سے شرما کے مُسکرائی تھی

وہ دل جو آج اندھیروں کی ایک بستی ہے
وہاں بھی جوت محبّت کی جگمگائی تھی!

نیلائے شرما

ایک دل ہزار غم

میں ناگن نہ تھی مگر میرے جسم پر سانپ کا نشان ضرور تھا، میں منحوس نہ تھی مگر لوگ مجھے نفرت سے یاد کرتے تھے، میری جوانی اور رنگ و روپ میں دنیا نے زہر ملا دیا، زمانے کے ہاتھوں ستائے ہوئے ایک دل کی کہانی "ایک دل ہزار غم"

قیمت: ۲ روپے ۷۵ نئے پیسے

جاتی ہوئی بہار

دنیا کی نگاہوں میں رعنا جاتی ہوئی بہار تھی لیکن دو بار بیوہ ہونے کے بعد بھی اس کے ارمان کنوارے تھے، اس کے دل میں خواہشیں اور امنگیں تھیں۔ شباب و محبت کی پوری داستان وحشی محمود آبادی نے انتہائی دلدوز ناول کی صورت میں پیش کی ہے۔

قیمت: ۴ روپے

نئے ۴ ناول

نئے قدم

وہ محبت کی طرف قدم بڑھاتا رہا اور محبت دور بھاگتی رہی، شاید محبت امتحان چاہتی ہے۔

نئے قدم دو دھڑکتے دلوں کی ایک حسین رومانی داستان جو کہانی نہیں حقیقت ہے اس کا ایک ایک حرف محبت اور رومان میں ڈوبا ہوا ہے۔

ہاجرہ نازلی نے یہ ناول صرف ان لوگوں کے لئے لکھا ہے جو محبت کرتے ہیں یا محبت کبھی کر چکے ہیں، وہ لوگ جن کے دل میں محبت نہیں اس ناول کو ہرگز نہ پڑھیں۔

قیمت: ۴ روپے ۵۰ نئے پیسے

زرینہ

ایک غریب اور بے سہارا لڑکی ایسی دنیا میں آکر پھنس گئی جہاں سونے اور چاندی کا راج تھا، جہاں انسان کی قدر کردار اور سیرت سے نہیں بلکہ اس کی دولت سے ہوتی ہے، تقریباً پانچ سو صفحات کے اس ناول میں ایک دل بند ہے، زرینہ کا دھڑکتا دل، جو آپ کے دل سے کچھ کہنا چاہتا ہے، آج ہی منگا لیجئے، رئیس احمد جعفری نے لکھا ہے۔ جسے دیدہ زیب چھپائی، خوب صورت ڈسٹکور اور مضبوط جلد سے مرصع کیا گیا ہے۔

قیمت: ۶ روپے ۵۰ نئے پیسے

شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی

اولاد

اولاد کے سُکھ اور دُکھ کی چھ تصویریں

اثر زیدپوری

غازی آباد

۳ جنوری ۱۹۶۰

مخلص و مہربان۔ تسلیم!

تمہارا خط ملا۔ میرا حال کیا پوچھتے ہو۔ بیمار ہوں۔ صاحب فراش ہوں اور یہ سلسلہ کئی مہینوں سے قائم ہے۔ اب تو خداوند کریم سے یہی دعا ہے کہ وہ مجھے جلد سے جلد میری ابدی منزل پر پہنچا دے۔ میری دنیاوی مصیبتوں کا خاتمہ کر دے۔

انسان کے لئے دنیا میں دو ہی بڑی نعمتیں ہیں۔ اولاد اور دولت۔ میں ان دونوں ہی سے محروم ہوں۔ اولاد ہوتی تو اس بڑھاپے میں، اس بیماری اور لاچاری میں میرے کام آتی اور دولت ہوتی تو یہی بھائی اور بھتیجے جو آج دُور سے خط لکھ کر میری مزاج پرسی کر رہے ہیں، میرے قدموں سے چمٹے ہوتے ——— لیکن میرے پاس کیا رکھا ہے! ——— تمہاری بھابی زندہ تھیں تو ایک خبر گیر تو تھا۔ اب تو کوئی بات تک پوچھنے والا نہیں ——— خیر! زندگی کے یہ دن بھی گزر ہی جائیں گے۔ اب تو یہی دُعا کرو کہ خدا مجھ پر رحم فرمائے۔ زندگی سے دل بھرا نہیں چکا ہے بلکہ بیزار ہو چکا ہے۔

تمہارا دُور افتادہ دوست

ریاض انور

تاتار گنج

۳ جنوری ۱۹۶۰

بہن طاہرہ۔ خدا تمہیں سلامت رکھے!

مجھ دکھیاری کے دُکھ پر تم نے جس ہمدردی اور محبت کا اظہار کیا ہے وہ میرے زخمی دل کے لئے مرہم سے کم نہیں۔ بہن! مصیبت میں آدمی کا دل ہمدردی کے دو بول سننے کے لئے ترستا ہے۔ کسی سے اپنی بپتا کہنے کے لئے تڑپتا ہے۔ کوئی کسی کا غم بانٹ نہیں لیتا، لیکن ہمدردی کے بول سن کر بڑی تسکین ملتی ہے۔ اپنی حالت کیا سناؤں تمہیں۔ جی رہی ہوں لیکن مُردے سے بدتر ہوں۔ جس عورت کا سہاگ اُجڑ جائے اس کی زندگی ہی کیا! نہ جانے ابھی کیا کچھ سہنا اور جھیلنا باقی ہے۔ اپنی اکیلی جان ہوتی تو رو دھو کر جیسے بھی گزر جاتی، لیکن یہ چھوٹے چھوٹے بچے۔ ایک دو نہیں پوری چھ جانیں۔ میرے کمزور بازو انہیں کیسے پروان چڑھا سکیں گے!! لوگ کہتے ہیں، اپنے بچوں کو دیکھو، ان سے آس لگاؤ ——— خدا کا شکر ہے کہ اُس نے مجھے اولاد جیسی دولت دی ہے لیکن یہ دولت اتنی فیاضی سے دی تھی تو میرا دامن بھی بڑا بنایا ہوتا۔ میرا سہاگ نہ لوٹا ہوتا۔ لوگ اولاد کے لئے ترستے ہیں۔ منتیں اور مرادیں مانگتے ہیں اور میں ماں ہو کر ایسی بات کہہ رہی ہوں لیکن یہ ننھے ننھے معصوم جب بھوک سے بلکتے ہیں، سردی میں ٹھٹھرتے ہیں اور میں ان کے لئے کچھ نہیں کر پاتی، اس وقت میری ماتا پر کیا گزرتی ہے؟ اس کا بھی تو تصور کرو! سارا سارا دن اور رات گئے تک محنت مزدوری کر کے بھی جب میں اُن کے پیٹ نہیں بھر پاتی ہوں۔ ان کی معصوم مانگیں پوری نہیں کر پاتی ہوں تو مجھے اپنی زندگی سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ سوچتی ہوں۔ اچانک ایک دھماکہ ہو اور ہم ساتوں جانیں زمین کی گہرائیوں میں سما جائیں ——— زندگی کی طرح اب موت بھی میری نہیں رہی۔ میں اکیلی مرجانا نہیں چاہتی۔ میرے بعد ان معصوموں کا کیا انجام ہوگا۔ میری رُوح بھی تو چین نہ پا سکے گی

محلّے کی بعض بڑی بوڑھیاں مجھے مشورہ دیتی ہیں کہ میں دوسری شادی کر لوں ایک سہارا ٹوٹ گیا ہے تو دوسرا سہارا ڈھونڈ لوں ——— طاہرہ بہن! تمہیں کہو۔ ایسا ہو سکے گا؟ ——— میرا سب سے بھاری گناہ یہی ہے کہ میں چھ بچوں کی ماں ہوں اور اس مہنگائی کے زمانے کسی مرد کے بازوؤں میں اتنی سکت کب ہے کہ وہ سات سات زندگیوں کا بوجھ خوشی سے اُٹھا لے۔ اگر ایسا ممکن بھی ہو تو وہ میرے بچوں کے ساتھ انصاف کبھی نہ کر سکے گا۔ وہ اُن پر ظلم ہی کرے گا۔ نا بہن، یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ اس تصور ہی سے میری رُوح کانپ

کانپ جاتی ہے۔ کیا لکھوں، اور کہاں تک لکھوں۔ غم کی داستان تو بہت لمبی ہے۔
بس میرے لئے دعا کرو ـــــ خدا میری مدد کرے ـــــ کاش تم یہاں ہوتیں ـــــ
میرے پاس ہوتیں ـــــ اپنی خیریت ضرور لکھنا ـــــ فقط

تمہاری بدنصیب بہن
عقیلہ

فرخ آباد
۳ جنوری ۱۹۶۰

شریمان لالہ گھنشیام جی۔ تسلیم!

آپ کا فرستادہ رقعہ ملا۔ آپ لکھتے ہیں کہ آپ کا اصل روپیہ معہ سود (جس کی مجموعی تعداد دو ہزار کے قریب ہے) اگر جلد ہی ادا نہ کر دیا گیا تو آپ میرے خلاف عدالتی چارہ جوئی کریں گے ـــــ ظاہر ہے میں آپ کو کسی ایسی کارروائی سے روک نہیں سکتا۔ جہاں تک روپیوں کی ادائے گی کی بات ہے، میرے سامنے کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے آپ کے روپیوں کی ادائے گی فوراً ہو سکے۔ عدالتی چارہ جوئی کر کے آپ کیا پائیں گے؟ میرے پاس کیا رکھا ہے۔ گرہستی کا معمولی سامان اتنا بھی تو نہیں، جسے نیلام کر کے آپ اپنے مطالبہ کا چوتھائی حصہ بھی پا سکیں میری استدعا ہے کہ جس طرح آپ نے اب تک مروّت اور محبت سے کام لیا ہے اُسی طرح چند ماہ اور صبر کریں۔ سرکار مجھے "امدادی رقم" کے بانڈس دینے ہی والی ہے۔ بانڈس ملتے ہی میں آپ کی پائی پائی ادا کر دوں گا۔

آپ نے مجھے میرا وعدہ یاد دلایا ہے۔ وعدہ مجھے یاد ہے۔ نسیمہ کی شادی اور عابد کی تعلیم کے سلسلے میں آپ سے روپیہ قرض لیتے وقت مجھے یہی توقع تھی کہ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی عابد کوئی اچھی سی ملازمت پا جائے گا اور اسی بھروسے پر میں نے آپ سے وعدہ کر لیا تھا کہ عابد کو نوکری ملتے ہی میں آپ کا روپیہ ادا کر دوں گا۔ نوکری تو عابد کو ضرور مل گئی ہے لیکن اُس سے ملنے والی تنخواہ اتنی کم ہے جو خود اس کے ذاتی مصارف کے لئے پوری نہیں پڑتی۔ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکنے پر مجھے افسوس ہے لیکن میری معذوری آپ کے لئے بھی قابل توجہ ہے۔

اُمید ہے آپ چند ماہ کی مہلت مجھے ضرور دیں گے۔ اس عرصے میں بانڈس کا مل جانا یقینی ہے۔ اطمینان فرمائیں۔

نیازمند
اشرف نیازی

جمال پور
۳ جنوری ۱۹۶۰

ڈیر مسعود!۔ اُمید ہے تم بخیریت ہو گے۔

بھئی ایک بہت ہی ضروری کام کے سلسلے میں تمہیں زحمت دے رہا ہوں۔ سنا ہے کہ مسٹر مہیش جیسوال سے تمہارے بہت قریبی تعلقات ہیں اور وہ تمہارے پڑوس میں رہتے بھی ہیں ـــــ مسٹر مہیش کے بڑے بھائی مسٹر رمیش جیسوال اُس محکمے میں افسر اعلیٰ ہیں جس میں اپنا فیروز کلرک ہے۔ ایک مہینہ ہو رہا ہے فیروز کا تبادلہ اچانک خیر نگر کے پہاڑی علاقے میں ہو گیا ہے۔ جاتے ہوئے وہ بہو اور بچوں کو میرے پاس گھر چھوڑتا گیا تھا۔ خیال تھا کہ جب وہاں مکان وغیرہ کا بندوبست ہو جائے گا تو انہیں بھی اپنے پاس بُلا لے گا، لیکن اب حالات مختلف ہیں۔ خود فیروز کو وہاں آرام نہیں ہے اور یہاں میری ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا جب بوڑھے ماں باپ جوان اولاد کی کمائی سے سُکھ اُٹھاتے تھے۔ آج مہنگائی کے اس دَور میں اولاد اپنی کمائی سے اپنے بال بچوں کا خرچ چلا لے، یہی غنیمت ہے ـــــ لیکن جب ایسا بھی نہیں ہو پاتا ہے تو ضعیف باپ کی کمر واقعی ٹوٹنے لگتی ہے۔ خیر نگر میں رہ کر فیروز کے لئے حالات سازگار ہونے کی اُمید بالکل نہیں وہاں خرچ بھی اتنا زیادہ ہے کہ تنخواہ کے روپے خود فیروز کی اپنی ذات کے لئے مشکل سے کافی ہو رہے ہیں، اس لئے تم مہیش صاحب سے کہہ کر فیروز کا تبادلہ کسی اچھی جگہ کرا دو۔ تبادلے کے سارے اختیارات رمیش صاحب ہی کے ہاتھ میں ہیں اور ظاہر ہے وہ بھائی کی بات ٹال نہ سکیں گے۔ تبادلہ اگر رام نگر، پیری گھاٹ، یا نصرت گنج میں سے کسی ایک جگہ ہو سکے تو زیادہ اچھا ہو گا۔ یہ جگہیں جمال پور سے قریب ہیں۔ امید ہے تم اس ضروری کام کو اپنا کام سمجھ کر پہلی فرصت میں انجام دو گے۔

عزیزی انور اب تو ماشاءاللہ سے ایم۔ اے۔ کے آخری سال میں ہو گا۔ خدا اُسے کامیاب کرے۔ تمہیں پنشن کب تک مل رہی ہے؟ اپنی خیریت اور حالات سے مطلع کرنا۔ خط کے جواب کا انتظار ہے۔

تمہارا ساتھی
پرویز

کانپور
۳ جنوری ۱۹۶۰

رئیسہ بہن!۔ بہت بہت سلام

تمہارے خط کا جواب دیر سے دے رہی ہوں۔ معاف کرنا! ـــــ حامد کے ابا کی طبیعت اب ٹھیک ہے لیکن فکروں نے جی نڈھال کر رکھا ہے۔ بڑے لڑکے پر

رشوت خوری کا مقدمہ چل گیا تھا۔ دشمن اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرنے کی سوچ رہے تھے، لیکن خدا نے عزت رکھ لی۔ حاکم نے صاف بری کر دیا۔ بہن! خدا لگتی کہنا۔ اس زمانے میں رشوت کون نہیں لیتا ہے، لیکن میں نے تو کسی پر مقدمہ چلتے نہیں دیکھا۔ لوگ تو ہاتھ پسار پسار کر لیتے ہیں، مول تول کر کے لیتے ہیں، اور میرے حامد نے تو کبھی کسی سے ایک نئے پیسے کا بھی سوال نہیں کیا۔ لوگ خود ہی دے جاتے رہے۔ اُس نے لینے سے انکار کیا تو روپیہ اُس کے قدموں میں ڈال گئے۔ اب تمہیں کہو، اس میں حامد کا کیا قصور! خیر! دشمنوں نے اپنی سی کر دیکھی ——— میں تو کہتی ہوں یہ حامد کے ابا ہی کا دم ہے جو حامد کا بال بیکا نہ ہوا۔ اس بوڑھاپے اور بیماری کی حالت میں کہاں کہاں نہیں دوڑے۔ لکھنؤ گئے۔ بڑے بڑے افسروں سے ملے۔ کیسی کیسی سفارشیں اُٹھوائیں۔ کیا کچھ نہیں کیا۔ رات دن ایک کر دیئے تب جا کر حامد کی جان بچی ہے۔ سچ مانو بہن! حامد نے کبھی ایک پھوٹا پیسہ بھی گھر نہیں بھیجا۔ اُسے تنخواہ ہی کتنی ملتی ہے اور پھر بال بچوں والا ٹھہرا لیکن اب جو اُس پر پڑی تو ہمیں خرچ کرتے ہی بنی۔ بہن تم سے کیا پردہ۔ اس مقدمے کے پیچھے حامد کے ابا کئی سو کے قرضدار ہو گئے ہیں۔ خیر بزرگوں کی عزت اور گھر کی بات رہ گئی ——— ہاں تو حامد اپنی نوکری پر بحال ہو کر ابھی گیا ہی تھا کہ چھوٹا لڑکا صابر میعادی بخار میں مبتلا ہو کر گھر آ گیا۔ میں نے کہا، بیٹا! تمہارے بھائی جان کے مقدمے میں تمہارے ابا کافی قرضدار ہو چکے ہیں، اب تمہاری دوا دارو کے لئے بھی پیسوں کی ضرورت ہے۔ بہو کے پاس کچھ روپئے رکھے ہوں تو دلا دو! پھر کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ ——— کہنے لگا ——— بہو کے پاس کیا رکھا ہے۔ ہاتھ گلے کے زیور ہیں، بس!۔ مجھے تنخواہ ہی کتنی ملتی ہے جس میں سے کچھ بچایا جا سکتا ——— میں چپ ہو رہی۔ کیا کہتی سچ ہے، اولاد پر جب مصیبت پڑتی ہے تو وہ ماں باپ کے دامن ہی میں پناہ لینے دوڑتی ہے ——— خدا کا شکر ہے بہن! کہ اُس نے صابر کو شفا عطا فرمائی اور ایک ہفتہ ہوا چاہتا ہے وہ بھی اپنی نوکری پر واپس گیا۔ لیکن یہ دو مہینے ہم پر کیسے گزرے؟ بس اللہ ہی جانتا ہے ——— حامد کے ابا اسی دوڑ دھوپ اور فکر اندیشوں میں بیمار پڑ گئے۔ دوران خون میں تیزی کی شکایت انہیں پہلے ہی سے ہے، اور تم جانو یہ موا قلبی مرض کتنا ظالم ہوتا ہے ——— خدا خدا کر کے اُن کی طبیعت سنبھلی ہے تو اب قرضخواہ چین سے نہیں بیٹھنے دیتے ——— میں تو کہتی ہوں قرضخواہ تقاضہ کرتے ہیں تو کرنے دو! اپنا جی کیوں ہلکان کرتے ہو۔ ہم اُن کا روپیہ مار تو لیں گے نہیں، جب اللہ دے گا دیدیں گے لیکن وہ میری کب سنتے ہیں۔ بس یہی سوچ سوچ کر ہلکان ہوتے رہتے ہیں کہ قرض خواہوں کو کیا جواب دیا جائے۔ یہ قرضہ کیسے ادا ہوگا۔ کیا ہوگا اور کیا نہ ہوگا۔

میں نے حامد اور صابر کو خط لکھایا تھا کہ ہو سکے تو تمہیں کچھ بھیجو۔ تقاضے داروں کے مونہہ میں کچھ تو نوالہ دیا جائے۔ بڑے نے پندرہ اور چھوٹے نے بیس روپئے بھیجے ساتھ ہی چھوٹے نے یہ بھی لکھ بھیجا کہ اُس کی بچی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ آئندہ وہ روپیہ گھر نہ بھیج سکے گا۔ بڑی بہو کے بچہ ہونے والا ہے۔ خیر سے ساتواں مہینہ چل رہا ہے۔ آنے والے خرچ کے لئے حامد کو آپ روپیوں کی ضرورت ہوگی ———

رئیسہ بہن! تمہیں بتاؤ، دونوں نے مل کر جو یہ پینتیس روپے بھیجے ہیں کیا ان سے سیکڑوں کا قرض ادا ہو جائے گا۔ کیسا نامراد زمانہ آ گیا ہے کہ آدمی کو کسی بھی حالت میں چین نہیں۔ بہن رئیسہ! اپنے خط میں تم نے گلہ کیا ہے کہ کاش خدا نے تمہیں دو بیٹیوں کی جگہ ایک بیٹا دیا ہوتا تو تمہارا یہ بوڑھاپا بھی سکھ سے گزر سکتا۔ تمہاری یہ بات پڑھ کر میرے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ آئی ہے کاش اُسے تم دیکھ سکتیں۔ اور کیا لکھوں۔ اللہ پاک کا فضل ہے۔ اپنی خیریت ضرور لکھنا۔ نجمہ اور نسرین سے میری دعائیں کہو۔

تمہاری مونہہ بولی بہن

ہاجرہ

شہاب نگر

۳ جنوری ۱۹۶۰

پیاری پروین! ۔ خوش رہو

پچھلے ہفتے تمہیں ایک خط لکھ چکی ہوں۔ آج یہ خط تمہیں فاخرہ کے سلسلے میں لکھ رہی ہوں۔ ارے وہی اپنی فاخرہ۔ نسیم احمد ہیڈ کلرک کی بہو۔ تم تو اُس سے مل چکی ہو، زیادہ دنوں کی بات ہے، شائد یاد نہ ہو۔ ہاں تو فاخرہ کو سسرال آئے یہ ساتواں سال ہے لیکن غریب کی گود اب تک سونی ہے۔ مجھ سے اُس کی اُداسی دیکھی نہیں جاتی ——— سچ ہے عورت ماں بن کر ہی سچی خوشی پاتی ہے ——— کل میرے ہاں آئی تھی۔ بچے کی بات نکل آئی تو بیچاری کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے۔ دوا علاج۔ دعا تعویذ۔ منتیں، مرادیں، سب کچھ کر کے تھک ہار گئی ہے ——— مجھے یاد پڑتا ہے کسی خط میں تم نے لکھا تھا کہ تمہارے شہر سے قریب پہاڑ پر "بابا پیر جنگلی" کا مزار ہے۔ اولاد کے آرزومند وہاں سے کبھی مایوس نہیں لوٹتے۔ شاید تم بھی اپنی کسی سہیلی کے لئے وہاں جا کر مراد مانگ چکی ہو اور سال اندر ہی اُس کی گود آباد ہو گئی تھی۔

اچھی پروین! تم فاخرہ کے لئے بھی "بابا پیر" کے مزار جا کر مراد مانگو۔ غریب کی گود آباد ہو گئی تو تمہیں ثواب بھی ملے گا اور فاخرہ اور اُس کے گھر والے ساری عمر تمہارا احسان مانیں گے۔ اس سلسلے میں جو کچھ بھی خرچ آئے اُس کی تفصیل لکھو ——— فاخرہ خوشی سے دے گی۔ جواب کی منتظر ہوں۔

تمہاری اپنی

نوشابہ

درد

جس چیز سے محبت کی جائے اگر اُسے حاصل کرلیا جائے تو محبت کی آنچ میں دھیما پن آجاتا ہے اور پھر وہ محبت اس منزل پر آکر ختم ہوجاتی ہے محبت قربانی کا نام ہے۔ جس کے بعد ہمیشہ انسان اپنے دل میں کسک، ہوک اور درد محسوس کرتا ہے۔ یہی کسک، ہوک اور درد اس کی محبت کی معراج ہوتی ہے اور ہمیشہ کے لئے امر کردیتی ہے۔ رئیس احمد جعفری نے ایک ایسی ہی محبت کو بڑے دل چسپ انداز میں تحریر کیا ہے۔ اس ناول کو پڑھتے ہوئے۔ آپ ناول کے ہر کردار کے لئے اپنے دل میں ہمدردی محبت اپنا پن محسوس کریں گے۔ قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے

حنا

تاریک فضائیں روشن سرشت پر اثر انداز نہیں ہوسکتی ہیں ـــــ پاک فطرتیں ماحول کے گھناؤنے سائے سے اثر پذیر نہیں ہوتیں ـــــ اگر تاریک فضاؤں میں گھر کر نور کی تلاش کرنی ہو تو ضمیر کے چراغ کو روشن کر کے منزل مقصود پر کس طرح پہنچ سکتے ہیں۔ ایم اسلم کے اُس شاہکار کا نچوڑ ـــــ جو عبارت کے لحاظ سے تو ضخیم ہے ہی مگر مضامین کے نقطۂ نظر سے اُس کی ضخامت ضمیر کے دھیلے تاروں کو جھنجھوڑ کر ایک ایسا نغمہ پیش کرتا ہے ـــــ جس سے اخلاق کی مُردہ رگوں میں خون کی گردش پیدا ہوجاتی ہے ـــــ ضخامت صفحات ۶۰۸، سفید چکنا کاغذ۔ قیمت مجلد چھ روپے پچاس نئے پیسے۔

احمد ایاز

ایک ایسے شخص کی داستان جو اسلامی حکومت سے دل کھول کر لڑا۔ گرفتار ہوا۔ پھر آزاد ہوا۔ مگر مسلمانوں کا یہ جانی دشمن علاؤالدین خلجی کے دربار میں بحیثیت سفیر اس لئے بھیجا گیا تاکہ مسلمانوں کی کمزوریوں سے والئ کرناٹک راجہ رام دیو کو مطلع کرتا رہے دہلی کے قیام میں اُس کی دوستی بادشاہ کے محافظ اعلیٰ حسن سنجری سے ہوئی جو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے معتقد تھے ہردیو حسن سنجری کے ساتھ اکثر حضرت سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ حضرت محبوب الٰہی کا رنگ کچھ اس طرح ہردیو پر چڑھا کہ وہ اسلام قبول کرنے کے بعد مسلمانوں اور حکومت وقت میں اتنا ہر دل عزیز ہوا کہ وہ دربار تغلقی میں وزیر اعظم بن گیا۔ رئیس احمد جعفری کا مایۂ ناز قلمی تراشہ۔

قیمت مجلد چھ روپے پچاس نئے پیسے

بانو بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی

دہ سورہ

یوں تو تمام قرآن مجید اس لائق ہے کہ ایک ایک آیت سوچ سمجھ کر پڑھی جائے مگر خصوصیت کے ساتھ چند ایسی سورتیں ہیں کہ اگر پورے قرآن مجید کی تلاوت کا وقت نہ مل سکے اور صرف ان ہی سورتوں کو مداومت کے ساتھ بطور وظیفہ پڑھا جائے تو نہ صرف تعلیمات قرآن مجید کو سمجھنے میں کماحقہ آسانی ہوگی بلکہ دینی اور دنیاوی مدارج میں وہ عروج ہوگا جس کو ہر صورت سے کامیابی کی معراج بجا طور سے کہا جاسکتا ہے۔ برکت اور فلاح کا یہ مجموعہ ترجمہ کے ساتھ اور سورتوں کے علیحدہ علیحدہ مستند آزمودہ، مجرب خواص کے ساتھ اس لئے پیش کیا جارہا ہے تاکہ یہ جاذب نظر مجموعہ جس میں حسن الٰہی جلوہ گر ہے اس کو دینی اور دنیاوی ترقیات کے حاصل کرنے میں پوری پوری امداد دے اس مجموعہ میں سورہ یٰسین سورہ خلق۔ سورہ الناس۔ سورہ الواقعہ۔ سورہ الملک۔ سورہ مزمل۔ سورہ النبا۔ سورۂ عمّ۔ سورہ الفتح۔ سورہ الرحمٰن۔ درود تاج۔ درود لکھی۔ دعائے ختم قرآن۔ عہد نامہ شامل ہیں۔

قسم اوّل: آرٹ پیپر پر بلاکوں سے چار رنگ میں اس مجموعہ کو زیور طبع سے آراستہ کیا گیا ہے۔ ترجمہ بین السطور سہ رنگا، سنہری حاشیہ، جلد سنہری۔ ہدیہ صرف ایک روپیہ پچاس نئے پیسے۔

قسم دوم: چکنا کاغذ، لیتھو یک رنگی چھپائی، ترجمہ بین السطور، حاشیہ پر جملہ مسائل و احکام اور قصۂ طلب آیات کی مکمل تفسیر۔ متن حناشدہ۔

ہدیہ مجلد پارچہ صرف ایک روپیہ۔ عمدہ

ارشاد محبوب

جب دنیا مال و منال کی چمک میں بصیرت کھو چکی تھی اور جب انسانیت کا مقصد غریب کو غریب اور امیر کو امیر بنانا تھا۔ جب مذہب کی راہیں سونی معلوم ہوتی تھیں۔ جب جاہ پرست انسانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کا شغل کرتے تھے جب کفر کی ظلمت کا اثر دنیا کو گمراہ کر رہا تھا۔ اس وقت ارشاد محبوب نے مجروح دلوں پر مرہم کا کام کیا۔ حضرت علی سنجری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت محبوب الٰہی سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات "فوائد الفواد" کے نام سے پیش کر کے بیچین دلوں کو پیغام سکون دیا۔ یہ ملفوظات عرصۂ دراز سے نایاب تھے اس لئے تصوف کی دنیا میں اس کمی کو دور کرنے کیلئے حضرت محبوب الٰہی کے ملفوظات کا اردو ترجمہ انتہائی خوبصورت انداز میں پیش خدمت ہے۔ قیمت تین روپے۔

مکتبہ دینیات: آصف علی روڈ، نئی دہلی

لطیف فاروقی

نشہ

ثریا کا اسلم کو دیکھ لینا شرط ہو گیا، اس کے دن رات خوشگوار قسم کی بیقراری میں گزرنے لگے۔ اس کی نظر میں اپنے خاندان کے حسین سے حسین نوجوان آئے تھے، لیکن جو بات اسے اجنبی اسلم کے چہرے میں نظر آئی وہ کسی دوسرے چہرے میں نہ دیکھی۔ اس کی بے تکلف سہیلیاں طعن کرتی تھیں کہ اگر پروانہ بننا ہی تھا تو کسی شمع کا بنا ہوتا مگر وہ اپنی سہیلیوں کو یہی جواب دیتی کہ اسلم اس کی نظر میں شمع سے کم نہیں۔ وہ خود بھی اسلم پر نقادانہ غور ڈال کر اس فیصلے پر پہنچی کہ اس کے چہرے میں خوبی کی کوئی بات نہیں، لیکن پھر بھی اس کی دل کشی میں بھی کلام نہیں۔ یہ دل کشی کس وجہ سے ہے؟ اس کا بھی اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، لیکن ایک مخفی مقناطیسی طاقت اس کے اندر ایسی تھی جس کی طرف وہ لوہا بن کر کھنچی چلی جاتی تھی۔ اس کا اس کشش سے عملاً انکار کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔ اپنے سوا ہر کسی کے طعن تشنیع اور اظہارِ نفرت کی بنا پر اس نے اپنے دل کو اسلم کے دل کی طرف جانے سے کئی بار روکا لیکن وہ اس کے روکے سے بھی نہ رکا، گویا وہ حالی کی زبانی کہتی تھی کہ ؎

دل کو سب باتوں کی ہے ناصح خبر
سمجھے سمجھائے کو ہم سمجھائیں کیا

اس وقت اس کے ناصح تھے اس کے چہیتے والدین، چہیتے بھائی، چہیتے بزرگ، عزیز، چہیتی بہنیں اور چہیتی سہیلیاں۔ یہ سب ناصح ایک طرف اور یہ اکیلی ایک طرف۔ ہوا صرف یہی کہ اس کے بھیّا کے ایک دوست پہلی بار سو میل کا سفر طے کر کے آئے اور ایک دن اور ایک رات گذاری۔ ایک منٹ کے وقفے میں دونوں کی نگاہوں کا ٹکراؤ ہوا اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کے ہو جانے کے عہد و پیمان ہو گئے۔ بات اور وقفہ کتنا مختصر سا تھا لیکن لیل و نہار کے اسی مختصر وقفے نے پھر کسی وقفے میں دونوں کو چین نصیب نہ ہونے دیا قدرت نے کتنی فیاضی بخشی کہ الوداع سے تھوڑی ہی دیر پہلے دونوں کو ملاقات کا موقع بخش دیا، ثریا کے بھائی اور والد گھر سے باہر تھے والدہ اور بہنوں کو ہمسایہ کے مکان میں جانا پڑا۔ ثریا کے دل نے آؤ دیکھا نہ تاؤ کہ اپنے دل کا گھاؤ اسلم کو دکھا دیا۔

"آداب بجا لاتی ہوں۔"

"مگر آنسوؤں کے ساتھ۔"

"اس لئے کہ وقت بہت کم ہے۔"

"وقت کی کمی کا آنسوؤں کے ساتھ کیا تعلق؟"

"صرف یہ تعلق کہ لمبا وقفہ زبان سے التجا کر سکتا ہے مگر وقت کی کمی کے باعث میرے پاس صرف خاموش التجا ہے۔"

"دیکھئے کوئی آتو نہیں رہا؟"

"اسی لئے کہتی ہوں کہ قول دے دیجئے۔"

"قول دینے کو تو دے دوں مگر آپ شاید مجبور ہو جائیں اور میں برباد ہو جاؤں۔"

"یہی مجھے ڈر ہے کہیں آپ مجبور نہ ہو جائیں ورنہ ——؟"

"ورنہ کیا؟"

"ورنہ یہی کہ میں آپ کے بغیر کانٹوں کی سیج پر ——"

"دیکھئے کوئی آرہا ہے۔"

"تو پھر جلد کیجئے۔"

"میں قول دیتا ہوں۔"

"میں بھی قول دیتی ہوں۔"

والد کے سیڑھیوں پر چڑھنے کی آواز آئی تو ثریا زنانے میں چلی گئی

"یہ لو بیٹی یہ میں تمہارے بھیا کے دوست کے لئے پھل لایا ہوں کہ وہ سفر میں کھاتا رہے گا —— اور تمہارا بھیا کہاں گیا ہے؟"

ثریا نے جواب دیا "بھیا نے دیر بہت لگا دی، کہہ کر گئے تھے کہ ابھی آتا ہوں۔"

"عجیب آدمی ہے" باپ نے کہا "بھلا مہمان کے ساتھ یہ سلوک کیا جاتا ہے؟ اسلم اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے، ورنہ آپے سے باہر ہو جاتا۔"

اسلم کی تعریف سن کر ثریا کا دل ناچنے لگا۔ اس نے اس تعریف کو اپنے حق میں نیک فال سمجھا۔ بولی "ہاں ابا جان بھائی کو ایسا چاہیئے نہیں تھا۔"

"لیکن بیٹی" اس کا باپ کہنے لگا "وہ کہیں ٹھہرنے پر مجبور ہو گیا ہوگا، سوچتا ہوگا کہ اسلم مہمان تھوڑا ہے، بالکل اپنوں کی طرح بے تکلف ہے، وہ کیوں بُرا ماننے لگا۔"

اس پر ثریا کی زبان سے بھی بے اختیار نکل گیا "ہاں ابا جان ٹھیک ہی تو ہے، اسلم مہمان تھوڑا ہے۔"

یہ فقرہ کہنے کے دوسرے ہی لمحے بعد اسے خیال آیا کہ اسلم کے ساتھ اپنایت اور بے تکلفی کا ایسا دعویٰ اپنوں ہی کے ساتھ ہوتا ہے چنانچہ وہ کچھ شرما گئی دانتوں میں انگلی دبائی اور پھر اسی انگلی کو پیار کرنے لگی۔

اسلم جانے کو تو چلا گیا اور اسے ثریا کا بھیا سٹیشن پر چھوڑ کر واپس آگیا لیکن ثریا کے نزدیک وہ نہیں گیا تھا بلکہ اسی کے شہر —— شہر ہی نہیں اسی کے گھر میں فروکش تھا۔ دن ہو یا رات مگر تصور کو امرِ حقیقت بنا کر ثریا اس سے برابر باتیں کرتی رہتی تھی۔ یہی حال اسلم کا تھا وہ بھی سو کوس دور جا کر یہی یقین کرتا رہا کہ وہ اپنے دوست کے گھر میں بیٹھا ثریا کے اشکوں سے ہم کلام ہے۔ دونوں کے سروں پر محبت کا بھوت اس طرح سوار ہوا کہ سروں کے منقطع ہونے ہی سے اتر سکتا تھا۔ باوجود اس کے کہ ثریا کے بھیا افتخار کو اپنے بے تکلف دوست سے بہت تعلق تھا لیکن وہ اسے اتنا قریب نہیں لانا چاہتا تھا جتنا اس کی بہن ثریا چاہتی تھی۔ اسی وجہ سے اسے ثریا اور اسلم دونوں سے نفرت ہو گئی ادھر ثریا کے ناصحوں نے اسے سمجھایا اور ادھر اسلم کے ناصحوں نے اسے راہ پر لگانا چاہا لیکن ثریا اور اسلم کے بھوت ایک دوسرے کی طرف ایسی جنونی قوت کے بل پر چل کھڑے ہوئے کہ ان کی سُنی گئی نہ ان کی۔ آخر دونوں گھر مجبور ہو گئے اور ثریا اور اسلم کی شادی ہو گئی۔

ثریا اور اسلم کے گھروں میں ان کے دائمی تعلق کی جتنی مخالفت تھی وہ شادی سے پہلے پہلے تھی مگر شادی ہو جانے کے بعد دونوں مطمئن ہو گئے اور اب اس بات کے خواہشمند ہو گئے کہ میاں بیوی دونوں کامیاب زندگی گزاریں۔

اب ثریا اور اسلم بار بار سوچتے تھے کہ ان کی دائمی رفاقت کس قدر معجزہ ثابت ہوئی کہ جمعہ جمعہ آٹھ دن گزرنے نہیں پائے کہ شادی ہو گئی۔ اتنے مختصر وقفے میں اپنی دائمی رفاقت کو وہ اپنی سچی محبت کی کامیابی سمجھ کر آپے سے باہر ہوتے رہے۔

الغرض اسلم اور ثریا نے ایک ہو جانے کے بعد اس طرح چاہا کہ بھونرا اور پھول ایک دوسرے کو کیا چاہیں گے۔ نیازمندیوں کے ساتھ ناز برداریاں بھی ہوتیں اور ناز برداریوں کے ساتھ نیازمندیاں بھی ہوتیں۔ وہ انگیٹھیاں جن میں آگ رفتہ رفتہ سلگ رہی تھی، اب لال انگارے بن کر روشنی دینے لگی۔ دونوں انگیٹھیاں پوری طرح تپ گئیں۔ دونوں کی اس سرگرمی نے ایک دوسرے کی طلب کے لئے کوئی کمی روا نہ رکھی۔ اسلم اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کو بھول گیا، اور ثریا اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کو فراموش کر بیٹھی۔ باوجود اس کے کہ والدین کو فراموش کرنا وجہ شکایت تھا لیکن لڑکے اور لڑکی کے دونوں فہمیدہ والدین نے اس کو بھی بسا غنیمت خیال کیا کہ آپس میں تو ٹھیک ہیں نا۔

ابھی چار ماہ گزرے ہوں گے کہ اسلم اور ثریا کی محبت کا گھر گھر چرچا ہو گیا اسلم کوئی ادیب نہ تھا لیکن اسے نہ جانے کیا خیال آیا کہ اپنی کامیاب محبت پر ایک افسانہ فرضی کرداروں کے نام سے ایک رسالہ میں شائع کرا دیا۔ اس افسانے کو پڑھ کر اسلم کے دوست اور ثریا کی سہیلیاں بہر حال خوش ہوتی رہیں۔

یہ مقولہ بڑا ہی معنی خیز ہے کہ "دُور کے ڈھول سہانے"۔ اسی طرح دو اچھے دوست دور دور رہنے کے بعد جب نزدیک آجائیں گے تو طبائع کا اختلاف ان کی محبت کے شعلے کو رفتہ رفتہ مدھم کرنے کا باعث بنے گا۔ اسی لئے لازوال محبت قائم کرنے کے لئے اہلِ محبت کا قربت سے گریز زیادہ سود مند ثابت ہوتا ہے۔

ثریّا اور اسلم کی محبت ایک نشہ تھا جو اپنی کیفیت سے باہر نہیں آیا تھا اس نے یہ سوچا ہی نہ تھا کہ جوش اور ہوش میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ چنانچہ جب نشہ اترا تو ثریّا اور اسلم بھی اس مقام پر اتر آئے جس کا نام نباہ ہے۔ یہ ایک حسنِ اتفاق ہوتا اگر اس مقام پر بھی دونوں ہم خیال نکلتے لیکن معمولات اور محسوسات کی دُنیا میں ایک دوسرے کے تعلق کا تجربہ شروع ہوا تو دونوں کی طبائع کا اختلاف رفتہ رفتہ سر اٹھانے لگا۔ مزاج ایک ایسی چیز ہے جس کے کسی کے ساتھ متفق ہونے نہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہوتی، بس اس کا اپنا رُخ ہے اور جب وہ اپنے دائمی ساتھی کو اس رُخ کی طرف مائل نہیں دیکھتی تو اسے پسند کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ یہی معاملہ چھٹے مہینے اسلم اور ثریّا کو پیش آیا۔ شروع میں تو ٹھٹکی کے ساتھ لبوں کی خفیف مسکراہٹ نے دل پر بجلی گرادی لیکن جب نباہ کا وقت آیا تو دونوں کے مزاجوں نے ہم آہنگ ہو کر کہا کہ "اب دیوانگی اور جنون کا نہیں بلکہ فرزانگی کا تقاضا پورا کرنا ضروری ہے"۔

پہلے بڑے بڑے معاملات میں اختلاف نہ ہوتا تھا اور اب معمولی سی معمولی باتیں وجہِ نزاع بن رہی ہیں۔ مثلاً بیگم صاحبہ کو اپنے میاں کا یہ فعل ناقابلِ برداشت معلوم ہوا کہ وہ اس کے لئے نیا سنگار بکس لانا بھول گئے۔ بولیں "سنگار بکس لانا بھولنے کے یہ معنی ہیں کہ آپ کو میری کوئی پروا نہیں"۔

اور میاں کو بیگم صاحبہ کی یہ حرکت سخت مذموم معلوم ہوئی کہ وہ مہمان خواتین کے سامنے غرارہ کی جگہ شلوار کیوں پہنے رہی ـــــ اس طرح ان کے خیال میں مہمان دوستوں کے سامنے ان کی کرکری ہوئی کیوں کہ خواتین اپنے مردوں سے بیگم صاحبہ کی جدید فیشن سے ناواقفیت کا اظہار کریں گی۔

ساتویں مہینے میں میاں بیوی کے درمیان روزانہ کے معمولات پر اس قدر اختلافات رونما ہو گئے کہ وہ گھر جو کچھ عرصہ پہلے خوشی کی جنت بنا ہوا تھا، اب دوزخ میں تبدیل ہو گیا۔ لڑکے یا لڑکی کے والدین ایسا کب چاہتے ہیں لیکن جدائی ہو گئی ہو گی کہ سات ماہ قبل ایک دوسرے کو قبول کرنے والے میاں بیوی اب علیحدگی کو آئندہ مطمئن زندگی کا ضامن سمجھنے لگے۔

اس ماہ کی نئی کتابیں

خاتون، انتصار حسین — تین روپے
سائرہ، قیسی رام پوری — ۶ روپے ۵۰ نئے پیسے
ڈارلنگ، نریش کمار شاد — ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے
لرزتے آنسو، عادل رشید — ۴ روپے
تحریک آزادی، مولانا آزاد — ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے
مدوجزر، شفیق الرحمن — ۲ روپے
شعلہ و شبنم، جوش ملیح آبادی — ۶ روپے
فرصت کے دن، قیسی رام پوری — ۵ روپے
سمگر، رئیس احمد جعفری — ۶ روپے ۵۰ نئے پیسے
اچھے دن، قیسی رام پوری — ۳ روپے
سفینۂ غم دل، قرۃ العین حیدر — ۶ روپے
سوز میر، میر تقی میر — ۷ روپے ۵۰ نئے پیسے
شبنم، عزیز احمد — ۵ روپے

گہرے گھاؤ، ماہر رشید — ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے
ایک کشتی سو طوفان، عشرت امیر — ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے
حیات غالب، ایس ایم اکرم — ۴ روپے
فراق، رنگین بھارتی — ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے
پیاسا، رنگین بھارتی — ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے

بچوں کی کتابیں اردو میں:

بہن کی محبت — ۶۰ نئے پیسے
جادو کا برج — ۸۰ نئے پیسے
چاندی کے پھل — ۳۰ نئے پیسے
نرگس (ہندی)، ایم اسلم — ۳ روپے ۷۵ نئے پیسے
تعلیمی تاش (انگریزی) — ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے
تعلیمی تاش کلاں (اردو) — ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے
تعلیمی تاش خورد (اردو) — ایک روپیہ ۱۲ نئے پیسے
تعلیمی تاش (ہندی) — ایک روپیہ ۶۲ نئے پیسے
تعلیمی تاش (اردو ہندی) — ایک روپیہ ۷۵ نئے پیسے

مکتبہ دینیات کی نئی کتابیں:

انسانیت کا پیغام، مولانا وحید الزماں قاسمی — ایک روپیہ ۷۵ نئے پیسے
کتاب الطہارت، مفتی حفیظ الدین — ۶۲ نئے پیسے
روحانی عورت، مولانا مجاز اعظمی — ۲ روپے
سیرت حضرت عثمانؓ غنی، دردکاکوری — ایک روپیہ
سیرت ابوبکر صدیقؓ، دردکاکوری — ایک روپیہ
سیرت حضرت عمر فاروقؓ، دردکاکوری — دو روپے
رسول خدا کا دشمنوں سے سلوک، امداد صابری — ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے
اسلام اور آزادی، ابوالکلام آزاد — ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے

آئندہ ماہ آنے والی کتابیں:

ناول اجالا — ۵ روپے
نظم خم ابرو — ۳ روپے
ناول حال دل — ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے

بانو بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی

ہر کتاب کی قیمت ۱۹ نئے پیسے

بونے کا بٹوا
بونے کی کہانی
بونے کی انگوٹھی
جادو کی گڑیا
مصنوعی بارش
جادو کا کھلونا
رحم دل پری
نیلم پری
پرستان کی سیر
خونی دیو
مٹی کی شہزادی
شہزادی نیلوفر
ہنسی کا بازار
میاں اینچی
شیطان کے چچا
گلگلے کی دوڑ
شیخ چلی نے شادی کی
کنجوس مکھی چوس
آفتابِ عالم
نبی جی کی بیٹی
پیارے نبی
چنن منن
لوٹ کے بدھو گھر کو آئے
اچھی اچھی کہانیاں
ننھی منی کہانیاں
اندھا گائے بہرہ بجائے
خاک کا پتلا
میاں جی کی بکری
پرستان کی ملکہ
جگت کی خالہ

بیٹے کی قربانی
خدائی پریڈ
کوا چلا ہنس کی چال
ڈھول کا بول
علم کی قیمت
عجیب تحفے
پھوسو بیگم
کھودا پہاڑ نکلا چوہا
سنہری پرندہ
جنگل میں منگل
فولاد خاں
ایک تھا مُرغا
گرم چائے
نجومی کی پیشین گوئی
تارا کا ڈنڈا
رامو موچی
آنکھ مچولی
انار راجہ
آگ کا چمن
جان بچی لاکھوں پائے
سنہری کھال
بنّی خرگوش
اندھیر نگری
چور کی داڑھی میں تنکا
چاندی کا گھوڑا
انمول ہیرا
عجیب تحفے
چٹورا ڈاکو

ہر کتاب کی قیمت ۲۰ نئے پیسے

وفادار کتا
جادو کا محل
انوکھی پہیلیاں
نرالی پہیلیاں
بتاؤ تو جانیں
ماں باپ کی دُعا
بہادر جاوید
بی بی رابعہ بصری
جادوگر کی ملکہ

سنہرا کچھوا
جھٹ پٹ
حضرت خالد بن ولید
بُوجھو تو جانیں
جوابات پہیلیاں
چوری پکڑی گئی
شہزادی شیریں
بی بی فاطمہ
بادشاہ کی ستار

ہر کتاب کی قیمت ۲۲ نئے پیسے

طالوت جالوت
نبی جی کا بیٹا
بے گناہ وزیر

رحم دل لڑکی
خدا کی اونٹنی
دعائے گنج العرش

ہر کتاب کی قیمت ۲۵ نئے پیسے

ہیرے کا پھول
قاضی اور ٹھگ
ترقی کے راز
آخری نبی
مداری کا ڈنڈا
شہزادی نسیم
تاڑو مچھیرا
انوکھا پیغام
نقلی شہزادی
خاموش شہزادی
بطخ شہزادی
نمک کا شہزادہ

جاسوسی کہانیاں
محنت کا پھل
ایک تھے میاں گپّی
انوکھا راجہ
شاہی لباس
شاہی موچی
پری کی چھڑی
ناگ شہزادہ
غریب شہزادہ
میں گھر جاؤں تو کیسے
اچھی باتیں
کمّھن کا ڈبہ

شکاری لڑکا
ہوشیار حسن

جادو کی تصویر
بڑھوسیٹھ

ہر کتاب کی قیمت ۲۸ نئے پیسے

عقل مند شہزادی
میرا نام کیا ہے

جادو کا کوڑا
نماز عکسی مترجم

ہر کتاب کی قیمت ۳۱ نئے پیسے

مرمر کی مُورتیاں
رحم دل شہزادی
شہر کی شہزادی
انوکھی شہزادی
مسکین شہزادی
فقیر شہزادی
چاند شہزادی
پھولوں کی شہزادی
وفادار شہزادی
شہزادی گوہر بار
شہزادی کا ہار
شہزادی شاہینہ
شہزادی کا انعام
جادو کی گیند
جادوگر کی لڑکی
جادوگر ملکہ
بندر والا
جادو کی سُرنگ
جادوگر چچا
جادو کا سیب
جادو کا صندوق

جادو کی انگوٹھی
بھولی نمّہ
بھوتوں کا صندوق
لنگڑا دیو
طلسمی مینا
منّی کا پرستان
گوہر پری
چھم چھم پری
پری زاد شہزادہ
خوفناک سفر
پھول شہزادہ
بادشاہ کا ظلم
جھوٹوں کا بادشاہ
بادشاہ کا خواب
سونے کا راجہ
ایک تھا راجہ
انوکھی کشتی
پاپ کی ناؤ
رستم چور
بے رحم لٹیرا
وفادار سانپ

مزے دار لطیفے
چٹ پٹی پہیلیاں

کھلونا بک ڈپو۔ آصف علی روڈ۔ نئی دہلی
ISBD-12

رضیہ احمد

رنگوں کا انتخاب اور ترتیب

رنگوں کی تربیت کا شعور خود رَو گھاس کی طرح تو اگتا نہیں ہے۔ وہ تو چند بنیادی اصول ہوتے ہیں، جن کی مدد سے رنگوں کو پُر تاثر ڈھنگ سے استعمال میں لانے کا سلیقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ "ہیُو (وضع) ویلیُو (گہرائی) اور انٹینسٹی (تیزی) وہ قسمیں ہیں جو کہ رنگوں کی خوشگوار ترتیب میں ہماری معاونت کرتی ہیں۔

ہیُو، یہ رنگوں کی تفریق کو ظاہر کرتا ہے، جس کی وجہ سے رنگوں کی پہچان میں مدد ملتی ہے۔

ویلیُو، کسی بھی رنگ کے ہلکے یا گہرے پن کا نام ہے۔

انٹینسٹی رنگوں کی شوخی و سنجیدگی پر دلالت کرتی ہے۔

اکثر رنگوں کا نام تو وہی رہتا ہے، لیکن شیڈ کے اعتبار سے کوئی نہ کوئی دم چھلا لگ جاتا ہے ـــــ گہرے (سلیٹی) کو ہی لیجئے۔ لائٹ گرے میں آسمانی کی جھلک اس کو اسموک گرے (دھوئیں جیسے سلیٹی) کا لقب عطا کر دیتی ہے۔ ڈوور گرے میں سرمئی کی آمیزش ہوتی ہے جو نیلاہٹ مائل گہرا ہونے پر ائرویز بلو کا رنگ اختیار کر لیتا ہے پرنسس گرے (ابر کی) گہرا یعنی سرمئی ہوتے ہی اتھینا گرے کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کیملن گرے میں اُودا ہٹ ہوتی ہے۔ ایڈمر پلیٹی گرے کو ہم اپنی زبان میں فاختئی کہتے ہیں۔

فیروزی، آسمانی اور نیلا ایک ہی رنگ کے مختلف اوزان ہیں۔ لیکن ہیز بلو میں سرمئی کی خفیف آمیزش ہوتی ہے۔ جس کی بناء پر وہ صوفیہ رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ سنگ بلو میں ہرے رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ٹرکوئسی سنگ بلو سے قدرے گہرا ہوتا ہے۔ اول الذکر میں فیروزی رنگ کا پلّہ بھاری رہتا ہے۔ جب کہ موخر الذکر میں کپاسی پیس ہوتا ہے۔

ٹریفک بلو اور ایورا بلو کھلتے ہوئے نیلے رنگ ہوتے ہیں۔ ہاں دوسرا پہلے سے کچھ گہرا ہوتا ہے۔ کنگ فشر بلو، اوکسفورڈ بلو اور ڈیپ بلو نیلے رنگ کی آخری منزلیں ہیں۔ فاؤنٹین بلو کو ہم اپنی یہاں کی اودی گھٹاؤں میں تلاش کر سکتے ہیں۔ پی کوک بلو یعنی طاؤسی تعارف کا محتاج ہی نہیں ـــ

ہرے رنگ کے بھی بہت سے مزاج ہوتے ہیں۔ ان میں سے انگوری دھانی، سبز، پستئی، مونگیا، کاہی اور ماشی ہمارے جانے پہچانے رنگ ہیں۔ لیکن رنگوں کے بارے میں ہم اتنی معلومات پر ہی اکتفا کر لیں، یہ مشکل ہے۔ اگر آپ کو بُنائی، کڑھائی (پوری، پکوڑی جس میں تلی جاتی ہے، وہ والی نہیں) سے شوق ہے، اور آپ اپنی محنت کے نتیجے کو واقعی دیدہ زیب بنانے کی خواستگار ہیں، تو رنگوں کی زیادہ سے زیادہ قسموں سے واقفیت بڑھانا ہوگی ہم آہنگی کا خاص خیال رکھنا ہوگا، اور ترتیب کے معاملے میں بے حد محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی۔ یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس مد میں آپ کی معلومات وسیع ہوں، ورنہ اوندھے سیدھے رنگ استعمال کر کے اپنی محنت اور شوق سے بنائی چیز میں وہ حُسن اور تاثر پیدا نہ کر سکیں گی جس کی امید میں آپ نے اس کو بنایا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ نمونے کی کتابوں میں سب ضروری رنگوں کا نام دیا ہوا ہوتا ہے، اور آپ بھی بڑے آرام سے ان کو پڑھتی چلی جائیں گی لیکن بہت سے رنگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہماری روزمرہ کی بول چال میں نہیں آتے ہیں۔ کتاب سے ان کے نام بھلے ہی پڑھ لئے جائیں۔ لیکن شکل سے واقفیت بھی تو ایک چیز ہے۔

انگریزی میں اوپلن گرین ہمارے انگوری رنگ کا ہم شکل ہوتا ہے۔

لیف گرین اس سے دو شیڈ گہرا ہوتا ہے۔ برلینٹ گرین کھلتا ہوا ہرا ہوگا لیکن اتنا بھی نہیں کہ آنکھوں میں چبھنے لگے۔ سالون گرین گہرے ہرے کا نام ہے۔ اس میں فیروزی کی مقدار قدرے زیادہ ہوتی ہے۔ لارچ گرین کے دو قطعی مختلف شیڈ ہوتے ہیں۔ ایک صوفیانہ ہوتا ہے، جس کو ہم مونگیا کہہ سکتے ہیں۔ دوسرا سبز کاہی ہوتا ہے۔ وُڈلینڈ گرین کاہی ہوتا ہے لیکن لارچ گرین کی طرح سبزی لئے ہوئے نہیں ہوتا۔ ٹارٹن گرین میں سیاہی کی آمیزش نمایاں ہوتی ہے، جس کی وجہ سے اس کو ماشی (ماش کی دال کے چھلکے جیسا) کہا جا سکتا ہے ——— سی فوم گرین کے تو نام ہی سے ظاہر ہے کہ وہ سمندر کی چنچل لہروں کی آغوش میں پلا ہے۔ یہ وہی خوش نصیب رنگ ہے جو شاعر نے اپنی محبوبہ کی آنکھوں میں پایا ——— !

شوخ رنگوں میں سگنل ریڈ کو گلنار اور پوسٹ آفس ریڈ کو سُرخ کہہ کر پکاریں گے۔ امپیریل کرمزن گہرے سرخ رنگ کا نام ہے۔ سیاہی کے اشتراک سے اس کی شوخی دب جاتی ہے۔ اور یہ ہمارے عنّابی رنگ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

مراکو مرُون، رِچ مرُون اور وکٹورین مرُون، سرخ سے عنّابی بنے ہوئے رنگ کے بتدریج آگے بڑھتے ہوئے قدم ہیں۔ یوں رنگ کے لحاظ سے ہر نام کے ساتھ وہ زیادہ ہی گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ بیج براؤن، کشمشی رنگ کا انگریزی نام ہے۔

لیمن کو ہم پیلا اور پیل گولڈ کو جوگیا کہیں گے۔ سن بیج اور ٹیمپکو بیج دو صوفیانے رنگوں کے نام ہے۔ ایک میں سُرخی جھلکتی ہے دوسرے میں سیاہ کی خفیف آمیزش اس کو مٹیالا بنا دیتی ہے۔

روئل آئیوری، پیل کریم، پنک بیج، جیسمن یلو بالترتیب پیلاہٹ لئے ہوئے سفید، بادامی، پیازی اور کیاسی کے نام ہیں۔ یہ سب ہلکے رنگ ہوتے ہیں۔ لہٰذا گرما میں استعمال کئے جانے کے لائق ہیں۔ ان کے علاوہ سفید بھی سرما کے لئے موزوں رہتا ہے۔ کیوں کہ سفید کا استعمال فرحت بخش ہوتا ہے۔

ہلکے رنگ، دراصل گہرے رنگ کی نسل سے ہی ہوتے ہیں مثلاً پیازی اور گلابی سُرخ رنگ سے تعلق رکھتے ہیں۔ گلیزیر، سی فوم گرین اور سنگ بلو، ہرے رنگ ہی کا حصہ ہیں ——— گہرے رنگ میں سفید کی آمیزش اس کو ہلکا کرتی چلی جاتی ہے اور یہ سرما کے مطلب کا بن جاتا ہے جب کسی عام رنگ میں سیاہ کی آمیزش کی جائے تو وہ بقدر مقدار اپنی شکلیں تبدیل کرتا ہے۔ اور اس طرح سے مختلف شیڈ وجود میں آتے ہیں۔

ہلکے رنگ روشنی سے متاثر ہونے والے ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم ہلکے رنگوں کو پہن کر قدرے فربہ نظر آتے ہیں۔

گہرے رنگ روشنی کو جذب کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہ پسِ منظر کے لئے موزوں رہتے ہیں۔ یا ان لباسوں کے لئے مناسب رہتے ہیں جو زیادہ تر استعمال میں آتے ہوں ——— ہلکے یا شوخ رنگ کے کپڑے سفر، پکنک اور عام خریداری وغیرہ کے موقع پر مناسب نہیں رہتے۔ ایسے رنگوں کو تو خاص مواقع اور تقریبات کیلئے منتخب کرنا بہتر ہوگا۔

کچھ رنگ اتنے شوخ ہوتے ہیں کہ ان کو بجنسہ استعمال کرنا ٹھیک نہیں رہتا ایسے رنگوں کو گرے کے امتزاج سے سنجیدہ بنایا جانا ممکن ہے۔

کھلتے ہوئے رنگ جاذب نظر ہوتے ہیں۔ ہاں! زیادہ گہرے ہوں یا غلط موسم میں استعمال کئے جائیں، تو ناگوار لگتے ہیں ——— کھلتے ہوئے رنگ، مثلاً آسمانی، گلنار، شہابی، سبز اور سُرخ بچوں کے لباس کے لئے موزوں رہتے ہیں۔ بچوں کے لباس میں ایک رنگ ہلکا یا صوفیانہ ہو تو اس کے ساتھ کوئی گہرا یا شوخ رنگ ضرور استعمال کرنا چاہیئے۔ عموماً دو مختلف رنگوں کے اشتراک سے بچوں کے لباس میں شوخی اور مستعدی کی جھلک آجاتی ہے ——— شیر خوار بچوں کے لئے تو ہلکے ہلکے رنگوں کے فراک (پیچھے سے کھلے ہوئے) مناسب رہتے ہیں لیکن جب وہ پالنے سے نکل کر اپنی چھوٹی سی دنیا میں مست رہنا شروع کر دیں، تب ان کے لباس کے لئے شوخ اور میل خورے رنگوں کا انتخاب کرنا چاہیئے۔ جیسے ——— سُرخ کے ساتھ آسمانی، گرے کے ساتھ ارغوانی، عنابی، گہرا ہرا، کھلتا ہوا سُرخ مونگیا یا کاہی کے ساتھ سُرخ و گلابی، عنّابی کے ساتھ پیلا، کشمشی کے ساتھ سرخ یا کپاسی۔ براؤن کے ساتھ سُرخ یا پیلا اسی طرح دوسرے میل کھاتے ہوئے رنگوں کی یکجائی۔

بچوں کے لباس کے لئے ایسا رنگ ہرگز منتخب نہ کیجئے۔ کہ ہم صبح سے شام تک روکتے ٹوکتے ہی گزرے۔ اور آپ بار بار کہیں "دیکھو! گندے نہ کر لینا ورنہ مار پڑے گی۔" "میلا کیا تو اچھا نہ ہوگا۔" "خبردار جو مٹی سے کھیلے، ہڈیاں توڑ دوں گی۔" اور ان کے ننھے منے سے دل کو یہی دھڑکا لگا رہے، کہ کپڑے نہ خراب ہو جائیں، پٹائی نہ ہو جائے۔ اب یہ معصوم اپنے دل کے فطری تقاضوں کو پورا کریں یا کپڑوں کا غم کھائیں؟ غنیمت ہے کہ وہ بھولے سیدھے ہوتے ہیں۔ اگر ذرا بھی کائیاں ہوتے تو کپڑے لتے اتار والدہ ماجدہ کے حضور میں پیش کر دیتے، اور کہتے "لیجئے! اب ان کو پرنس آف ویلز میوزیم میں رکھوا دیجئے، ہم تو چلے مٹی سے کھیلنے۔"

رنگوں کا انتخاب اور ان کی ترتیب میں مصوّر فطرت سے بڑی مدد ملتی ہے

گہرے نیلے آسمان پر روئی کے گالے ایسے سفید سفید ابر پارے، ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے کتنے دل چسپ معلوم ہوتے ہیں۔ اور جب وہی آسمان سرمئی لبادہ اوڑھ کر، بوڑھی نانی اماں کا نقشہ کھینچتا ہے، تو دل پر آپ ہی آپ سنجیدگی سی طاری ہونے لگتی ہے ——— اور وہ گھڑیاں جب تھکا ماندہ سورج افق کے دامن میں پناہ لینے بڑھتا ہے، کون ہے جو دیکھتا نہ رہ جائے! ادھر بارش تھمی، ادھر قوس قزح لہرائی کیا بچے، کیا بڑے خوش ہو ہو کر دیکھ رہے ہیں۔ دوسروں کو دکھا رہے ہیں ——— برسات آئی، سبزے کا آنچل سرسرایا، اور دھانی اوڑھنیا گلے سے آ لگیں۔ سرسوں پھولی، اور بسنتی رنگ کی بن آئی ——— موتیا کھلا اور ہلکے پھلکے، صاف شفاف کپڑوں کے دن آئے ——— تو سچ! قدرت کے اشارے بڑے ہی لطیف اشارے ہوتے ہیں۔ بس ایک لمحہ فکریہ کی ضرورت ہے۔

سرما کو ہی لیجئے ——— اس میں ان رنگوں کا استعمال مناسب ہوتا ہے جن میں حرارت ہو، شوخی ہو، سرگرم عمل رہنے کا پیغام ہو۔ یہاں سرخ، نارنگی اور شہابی اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ ان شوخ رنگوں کے علاوہ ہر گہرا رنگ آپ کی نظر عنایت کا منتظر ہے۔

"سرد مہر" رنگ وہ ہوتے ہیں جن میں فیروزی یا آسمانی کی آمیزشی ہو ——— رنگوں کے طبقے میں ایک دوسرے سے تعاون کا دستور ہے۔ کچھ تو ایسے ایثار پسند واقع ہوتے ہیں، کہ اپنی شمولیت سے ایک رنگ کو دوسرے رنگ کی شکل عطا کر دیں گے۔ لیکن خود منظر عام پر آنا گوارہ نہیں کرتے۔

کچھ رنگ ایسے بھی ہیں جو ایک دوسرے سے قریبی رشتہ رکھتے ہیں لیکن ان کا اصول 'محبت دور کی' ہوتا ہے۔ نارنگی، شہابی، جوگیا، نارنجی اور سرخ ایسے رنگوں کی بہترین مثال ہیں۔ یہ سب رنگ سرما میں استعمال کئے جا سکتے ہیں لیکن ان کو یکساں اوزان کے ساتھ ایک ہی وقت میں نہ استعمال کریں۔ ورنہ آنکھوں میں کھٹکنے لگیں گے۔ مختلف رنگوں کو شرافت سے پیش آنے پر رضامند کر لینے کا بہتر طریقہ یہی ہے کہ کسی برعکس رنگ سے متعارف کرا دیں۔ ایسا امتزاج دلچسپ اور پرکشش ہونا چاہیئے۔ مانا کہ یہ آسان نہیں ہے لیکن اس کو آسان بنانے کا گر رنگوں کے معاملے میں منصوبہ بندی کا شعور پیدا کرنا ہے۔ چند مثالیں یہ رہیں:

سرخ: گرے کی ساری قسموں مثلاً لائٹ گرے، ڈوور گرے، اسموک گرے، پرنس گرے، اتھینا گرے، اور کیملن گرے کے ساتھ بھلا لگتا ہے۔ ان کے علاوہ سرخ رنگ ایرویز بلو، ڈیپ بلو، بیج براؤن، وکٹورین مرون، رچ مرون، ٹارٹن گرین، لارچ گرین، وڈلینڈ گرین، ماؤنٹین بلو، ٹیمپکو بیج، پیلے کے مختلف شیڈز، فالسئی، بنفشئی اور سیاہ کے ساتھ موزوں رہتا ہے۔

سیاہ: سن بیج، ہیز بلو، امپیریل مرون، سی فوم گرین، لارچ گرین، اوپلن گرین، برلینٹ گرین، سالون گرین، ٹرکوئس بلو، پیل گولڈ، پنک بیج، جیمسن بلو، اور سرخ کے کئی کھلتے ہوئے شیڈ چل جاتے ہیں۔

نارنگی رنگ کے دیگر شیڈ یعنی شہابی اور جوگیا وغیرہ سرما میں پہنے جائیں تو مناسب رہتے ہیں۔ ان رنگوں کو ہم ہرے کے مختلف شیڈوں کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں۔ پیلے اور جوگیا کے ساتھ سرخ بھلا لگتا ہے۔ کشمشی، عنابی اور کالا بھی ان رنگوں کے ساتھ استعمال کئے جائیں تو ٹھیک رہے گا۔

پرنس گرے کے ساتھ طاؤسی یا عنابی اچھا لگتا ہے۔ گہرا ہرا، کچھ شیڈ نیلے کے (اکسفورڈ بلو، ڈارک بلو) بھی خوب رہتے ہیں۔

متاثر گرے والے رنگوں کی اسکیم میں دو سے زیادہ رنگوں کا انتخاب بھی ممکن ہے۔ آسمانی یا آسمانی مائل ہرا (سنگ بلو، سی فوم گرین) دو قریبی رنگ ہیں۔ ان کے ساتھ نارنگی، شہابی یا ایسے ہی کسی اور ہم آہنگ رنگ کی شمولیت آپ کے لباس کو بارونق بنا سکتی ہے۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ہرا رنگ ٹھنڈک پہنچاتا ہے اور گرما کے لئے مناسب ہے لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ پیلے رنگ کی زیادتی پر ناراض ہو کر سبز رنگ کا پارہ کچھ اونچا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس شکل میں اس رنگ کا لباس کسی دوسرے رنگ کے اشتراک سے سرما کے لئے موزوں بن جاتا ہے اس کے علاوہ گرم مزاج، رنگ وہی ہوتے ہیں جو اپنے دامن میں سرخ یا نارنگی رنگ کو سمیٹے ہوں۔

رنگوں کے انتخاب کے وقت موسم، عمر اور موقع مناسب کا خاص خیال رکھنا چاہئے۔ ہم میں سے کچھ ایسی بھی ہوں گی جن کو اپنے چہرہ کے رنگ اور جسم کی ساخت کی مناسبت سے کسی کمی بیشی کی ضرورت محسوس ہو گی۔ خود کو سمجھنا اور بہتر بنانے کی کوشش کرنا ایک بڑی خوبی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم اپنی باگ ڈور رائج الوقت رواج یعنی فیشن کے حوالے کر دیں ——— فیشن کا اصل مقصد گوارہ لگنا ہے۔ اور گوارہ نظر آنے کے لئے ہم کو اپنے لباس کی تراش خراش اور رنگ میں حسب ضرورت ترمیم کرنے کا پورا حق ہے۔

ہم میں سے کچھ کو نسبتاً ہلکے رنگ منتخب کرنا ہوں گے۔ ہاں! ہلکے یا صوفیانے رنگ میں جان لانے کے لئے کسی گہرے یا کھلتے ہوئے رنگ کی شرکت ضروری ہو گی۔ کوئی بھی ہلکا رنگ کسی بھی شوخ رنگ کی نظر التفات پڑتے ہی شاد ہو جاتا ہے۔ شوخ رنگوں کو اعتدال پر لانے کی بہترین ترکیب یہی ہے کہ کسی صوفیانے رنگ کے پلے باندھ دیا جائے۔ ان کو مزید سنجیدہ بنانا ہو تو سیاہ یا سفید

کو شامل کرلیں۔ بھڑکیلے رنگ ہلکے یا صوفیانے رنگ کی گرفت میں آتے ہی ساری چوکڑی بھول جاتے ہیں۔ تجربے کے طور پر نارنجی یا شہابی کو کشمشی اکتھی یا سیاہ کے ساتھ پہن کر دیکھئے۔

اگر آپ کے بالوں اور آنکھوں کا رنگ ہلکا ہے لیکن آپ ان کا قدرے گہرا ہونا پسند کرتی ہیں، تو کوئی گہرا رنگ جس میں نیلاہٹ یا سیاہی جھلکتی ہو اپنے لئے منتخب کریں۔ ہاں اپنے لباس میں کسی دوسرے میل کھاتے ہوئے رنگ کا اضافہ کرنا نہ بھولئے ——— ویسے آج کل ہم رنگ ساری اور بلاؤز کا رواج ہے۔ اگر آپ قد میں اونچی ہیں اور اونچی ایڑی پہننے کے بعد ضرورت سے زیادہ لمبی یا پتلی نظر آتی ہیں، تب تو آپ کو ساری اور بلاؤز جداگانہ لیکن میل کھاتے ہوئے رنگوں کے پہننا چاہئیں بھپی ہوئی یا ڈیزائن دار ساریوں کے لئے بلاؤز کا انتخاب کرتے وقت احتیاط برتئے۔ ورنہ ان کی دل کشی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

کچھ رنگ ایسے بھی ہیں جو صرف معمر خواتین کے لئے ہی موزوں ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ صوفیانے رنگوں کے جملہ حقوق ان کے حق میں محفوظ ہو چکے۔ چاہیں تو آپ بھی استعمال کر سکتی ہیں۔ لیکن ایسے رنگوں کی متانت سے پھیکا پڑ جانے کے لئے کسی شوخ رنگ کی موجودگی ازبس ضروری ہے۔

کئی شوخ رنگوں کو ایک ساتھ استعمال کرنے سے پرہیز کریں کیونکہ رنگوں کا ٹکراؤ نظروں پر بار گزرتا ہے۔ اور اس کا اثر آپ کی ہر دلعزیزی پر بھی پڑ سکتا ہے ——— رنگوں کے امتزاج کو دل کش بنانے کے لئے قطعی مختلف یا قریبی رنگ کا سہارا لیجئے۔ اگر آپ کی الماری میں رہنے بسنے والے لباس سلیقے اور ہوشیاری کے ساتھ ادل بدل کر کے پہنے جائیں، تو نہ آپ ہی ان سے اکتا سکتی ہیں نہ دوسرے ہی آپ سے غیر متعلق رہ سکتے ہیں۔

رنگوں کی موزوں ترتیب اور برمحل انتخاب آپ کو قابل توجہ بناتا ہے لیکن اس کا دھیان رہے کہ باہم استعمال کئے جانے والے دو یا دو سے زیادہ رنگوں کے دل میں ایک دوسرے کے لئے گنجائش بھی ہے۔ یا آپ ان کے ساتھ زبردستی کر رہی ہیں۔

دیکھئے نا! ہمارے اعمالوں کی خیر خبر رکھنے کے لئے تو غیر سے فرشتے مقرر ہیں۔ سُنا ہے ذرا ذرا لکھ لیتے ہیں۔ ان کو تو بس ہمارے اعمالوں سے مطلب ہے نیک بخت ہماری شخصیت میں ذرہ برابر بھی تو دل چسپی نہیں لیتے۔ ایسے حالات میں اپنی شخصیت کی فکر ہم خود نہ کریں تو کون کرے؟ تو آیئے نا! اب کریں فکر کیوں کہ ہماری شخصیت اور مقبولیت کا ایک اہم جز موزوں لباس، مناسب رنگ اور جاذب نظر ترتیب ہے!!!

تین مفید اور یادگار کتابیں

آمنہ کا لال

غیر مستند میلادوں کی کتابوں کو چھوڑ کر مستند میلاد پڑھنا منظور ہو تو صرف "آمنہ کا لال" پڑھئے جو مصورِ غم علامہ راشد الخیری کی وہ تصنیف ہے جس پر مصنف کو ناز تھا۔ اس میلاد کو پڑھ کر غیر مستند روایات جو میلاد رسول کے سلسلے میں لوگوں کے ذہن میں بیٹھ گئی ہیں یک قلم جاتی رہیں گی۔

مستند اسلامی میلاد۔ کتابت اور طباعت دیدہ زیب۔ کاغذ چکنا۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے

سیّدہ کا لال

تاریخ اسلام کا اہم ترین واقعہ۔ تاریخ شہادت کی مکمل داستان جب خون سستا تھا اور پانی مہنگا تھا۔ جب انسانیت کا گلا گھٹ رہا تھا۔ جب رسول کے نام لیوا آلِ رسول کے سینے چھلنی کر رہے تھے۔ جب ذاتی افتخار کے لئے مذہب کی دھجیاں اُڑائی جا رہی تھیں۔ جب معصوم اور نوجوان بیدردی سے قتل ہو رہے تھے اس وقت درسِ محمدؐ کا سوار حق و صداقت کا علمبردار امام نامدار پرچم محمدی لے کر کربلا کے تپتے ہوئے میدان میں ایک پیغام دے رہا تھا۔ یہ پیغام کیا تھا؟ جو اس پر ایمان رکھتے تھے ان کا کیا حشر ہوا؟ حق کی فتح اور باطل کی شکست کا یہ رنگین فسانہ جو خونِ شہیداں کی سُرخی اپنے اندر لئے ہوئے ہے کس طرح ختم ہوا۔ یہ ایمان افروز داستان علامہ راشد الخیری کی تصنیف "سیّدہ کا لال" میں ملاحظہ فرمایئے۔

قیمت ۲ روپے، ۵۰ نئے پیسے

بچّوں کی نماز

اگر بچوں کو شروع سے ہی نماز کی اہمیت کا احساس دلایا جائے تو بڑے ہو کر نہ صرف وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہوں گے بلکہ شریعتِ محمدیہ کو اچھی طرح سمجھنے کا وہ شوق ان میں پیدا ہوگا جو ان کو مسلمان کامل بنا کر دنیائے اسلام اور دنیائے انسانیت میں قابلِ قدر ہستی بنا دے گا۔ یہ مختصر رسالہ مولوی مسلم احمد صاحب ایم اے نے بچوں کے مخصوص انداز میں ترتیب دیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ

مکتبہ دینیات، آصف علی روڈ، نئی دہلی

کام کا علاج

جیلانی بانو

دن بہت ہی دھندلے اور ٹھنڈے ہوئے سے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وقت ایک سیاہ بادل کی طرح ٹھہر گیا ہے اور ہر چیز اس دھند میں چھپ کر اپنی اہمیت کھوتی جا رہی ہے۔

گھر میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بس رہ رہ کر نفی کی سسکیاں گونج اٹھتیں۔ وہ گردن موڑ کر ناک سنکتی یا پھر کبھی کبھار اماں بے ضبط آہ کو روک کر اللہ کو پکار تیں۔

بات اتنی بڑی نہ تھی، مگر نفیسہ کو تو گویا ہر وقت سسکیاں بھرنے اور اپنے مظلوم ہونے کا سارے گھر سے اعتراف کروانے کا ایک سنہری موقعہ مل گیا۔

نفیسہ کی عدت پوری ہو چکی تھی۔ اور یہ بات سبھی کو معلوم تھی کہ غم کی شدت سے وہ بالکل نہ روئی تھی۔ ادھر میاں نے دم توڑا ——— ادھر وہ موٹہ کھولے آنکھیں پھاڑے ایک کونے میں سرک کر بیٹھی تو بیٹھی ہی رہ گئی۔ عورتوں نے اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر رُلانے کا کونسا جتن نہ کیا۔ یہاں تک کہ محلے والی مامی نے بالکل تحرم کے بیان والے انداز میں مرنے والے کی یوں خوبیاں بیان کیں اور ایسی پٹن ڈالی کہ حاضرین زار و قطار رونے لگے۔ عورتیں یوں رو رہی تھیں جیسے ان کے اپنے میاؤں کی لاشیں سامنے پڑی ہوں اور وہ اپنی ننگی کلائیاں اٹھا اٹھا کر پٹک رہی ہوں۔ مگر نفی یوں ہی چپ چاپ ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھی رہی۔ جیسے اس کے آس پاس فضا بڑی پر سکون ہو۔ جیسے وہ گھر کا سارا کام کاج کر کے، بناؤ سنگار کے لئے، میاں کا انتظار کر رہی ہو۔ یا ریاض سامنے بیٹھا اسے مہندی لگانے کے نئے اسٹائیل سمجھا رہا ہے اور وہ نگاہیں اٹھائے بغیر اس کی باتوں کے سحر میں کھو چکی ہے۔

پھر رفتہ رفتہ وہ ہوش میں آئی بھی تو یوں جیسے اسے حامد کی موت کا یقین ہی نہ ہو۔ یہ حالت دیکھ کر اور تو اور اس کی ساس کا بھی کلیجہ پھٹنے لگا، اور وہ زندگی میں پہلی بار

بہو پر سے صدقے قربان ہوئی اور اس کی بھاوجوں نے رو رو کر اختلاج کے پرانے مرض کو جگا لیا۔ وہ پہلے بھی کب چہکتی تھی ——! مگر بیوہ ہونے کے بعد تو بس سفید سفید کفن کی طرح کپڑے چاروں طرف پھیلائے ان میں چھپی رہتی۔ اس نے اپنی چوڑیاں اس خاموشی سے تڑوالیں کہ نئی دلہنیں سہاگ کا جوڑا بھی ایسی خاموشی سے نہ پہنیں گی۔ اپنے بدن کے سارے زیور بڑے صبر سے اتار پھینکے، ان بالوں کو جنہیں دن بھر سنوارنے سے فرصت نہ ملتی تھی، اب اس نے کھلا چھوڑ دیا۔ اور اپنے سارے جھلملاتے رنگین کپڑے تہہ کر کے بڑے اطمینان سے اپنے لئے سفید کپڑے سینے بیٹھ گئی۔

اٹھتی عمر کی لڑکیاں بیوہ ہو جائیں تو یہ قدرت کی بہت بڑی زیادتی لگتی ہے۔ مگر نفی کو دیکھ کر تو لوگ آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ جس دن سے بیاہ ہوا وہ دلہن بنی پھر رہی تھی کوئی زیور دم بھر کو نہ اتارا۔ جہیز کے سارے بھاری بھاری جوڑے گھر میں پہن ڈالے۔ رنگ برنگی چوڑیاں کہنیوں تک بج رہی ہیں۔ بیاہ کو چار سال ہو گئے مگر اس کے ہونٹوں کی مستی کبھی پھیکی نہ پڑی۔ ہر وقت ہاتھوں پر مہندی کے نئے نئے ڈیزائن دکھائی دیتے۔ یہ ڈیزائن اس کا چھوپی زاد بھائی ریاض اس کے ہاتھوں پر بناتا تھا۔ سب اسے چڑاتے تھے۔ شہر کا اتنا مشہور ڈاکٹر، بیوی بچوں والا سمجھدار انسان، اور حرکتیں دیکھو تو بالکل چھوٹے بچوں جیسی۔ ڈرائنگ تو اس کی ایسی غضب کی تھی کہ بڑے بڑے مصور ہار جائیں۔ اور ایک ڈرائنگ ہی کیا! رنگوں کا انتخاب کوئی اس سے سیکھے۔ بلاؤزوں اور فراکوں کے نئے اسٹائل وہ جانتا تھا۔ یہاں تک کہ اماں رضائی سینے بیٹھتیں تو گوٹ کے لئے موزوں کپڑے کا انتخاب وہ کرنے کو بیٹھ جاتا۔ مگر اماں کبھی اس کی بات نہ مانتیں۔

"میاں مجھے تو بخشو۔ اپنی یہ فن کاری بہنوں کو دکھاؤ۔"

بہنیں بھی بچارے کے نصیبوں میں کہاں تھیں۔ لے دے کر صرف ماموں کی یہ لڑکیاں تھیں جنہیں بہنیں بہنیں پکار کر خوش ہو لیتا تھا۔ سو ان میں سے بھی بڑی آپا الہ آباد میں رہتی تھیں۔ اچھی آپا ایسی آدم بیزار کہ بات کہتے بگڑ جائیں۔ صرف نفیسہ تھی کہ بچپن سے ریاض کی ہر بات مانتی آئی تھی۔

ہر وقت یوں سنگار پٹار میں مصروف دیکھ کر کوئی اسے ٹوکتا تو وہ بڑے ناز سے اٹھلاتی "ہائے میں کیا کروں، اُن کی ضد ہے —— پوری کرتی ہوں۔"

مگر ایک دن میاں بیوی میں بڑی لڑائی ہوئی۔ دولہا میاں نے سسرال میں آکر خوب بیوی کے بکھان کہے۔ "وہ تو جانے دن رات کن خیالوں میں رہتی ہیں۔ مجھے تو یوں نظر انداز کر دیا ہے جیسے میں پتھر کا بت ہوں۔ قسم لے لیجئے، اچھی آپا جو آپ کی بہن نے کبھی محبت سے میرا ہاتھ بھی تھاما ہو۔ بس دن رات آئینے کے سامنے بیٹھی سنگار کئے جاتی ہیں۔ نفرت ہے مجھے اس لیپا پوتی سے ——"

"تم ہی تو کہتے ہو سنگار کرنے کو۔ بیویوں کو تو میاں کا کہنا ماننا ہی پڑتا ہے۔"

اچھی آپا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"لعنت بھیجئے ——" وہ اتنی زور سے چیخا کہ اچھی آپا اچھل پڑیں۔ "مجھے تو زہر لگتی ہے یہ سرخی پوڈر —— آپ ہی بتائیے چوبیس گھنٹے مہندی میں ہاتھ سرخ کرنا دیوانہ پن نہیں تو اور کیا ہے ——؟"

مگر ننھی صفیہ ابھی چار برس کی بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ جنت نصیب اپنے ساتھ نفیسہ کا سارا سنگار پٹار لے گیا۔

کئی دن کے بعد جب لوگ اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر رُلانا چاہ رہے تھے تو وہ اپنی خشک آنکھیں خلا میں گاڑھے چپ چاپ بیٹھی تھی۔

"اماں انہیں کچھ نہیں ہوا ہے۔ بس وہ میرے ہاتھوں کی مہندی چھین کر لے گئے ہیں۔ انہیں تو میری چوڑیوں سے ہمیشہ کا بیر ہے۔"

اس کی یہ بات جیسے بجھتی ہوئی چنگاریوں پر پٹرول کا ڈرم بن کر بھڑک اٹھی تھی۔

اب جو مدت کے بعد لوگوں نے اسے دیکھا ہے تو یوں لگا جیسے کسی بے درد دھوبی نے اسے پٹک پٹک کر دھو ڈالا ہو —— سفید بگلے کے پروں جیسی ساری، سیاہ بلاؤز، جس کا گریباں اتنا بڑا تھا کہ سفید گردن کی ویرانی پوری طرح نمایاں تھی۔ گوری گوری ننگی کلائیوں پر گرتا مچلتا ہوا سیاہ بالوں کا آبشار، اداس اور بے رنگ چہرے کو بار بار چھپا لیتا تھا۔ وہ بار بار اپنی سفید ہتھیلیاں کھول کر یوں دیکھتی جیسے کوئی مبہم سی تحریر پڑھ رہی ہو۔

سب ہی نے آنکھیں پونچھ کر اور سسکیاں روک کر اسے دیکھا تو بچارہ ریاض بھی تو پتھر دل نہ تھا ——! کہتے ہیں ان ڈاکٹروں کی نظریں تو آدمی کے آر پار دیکھ سکتی ہیں۔ تو اس نے بھی نفیسہ کو دیکھا اور سر جھکا کر چلا گیا، حالاں کہ سب دوستوں اور رشتے داروں پر یہ فرض تھا کہ ننھی صفیہ کو گود میں اٹھا کر سو پچاس روپے اس کے ہاتھ میں تھمائیں۔ اور تھوڑی دیر نفیسہ کے پاس بیٹھ کر اسے خوب رولائیں۔

پھر شام کو ریاض کی بیوی بھی تعزیت کو آئی۔ ان کے بیاہ کو پورے پانچ برس بھی نہ ہوئے تھے۔ مگر اسے سنگار کے نام پر رنگین کپڑوں سے بھی نفرت تھی۔ اتنے دنوں میں تین بچے پیدا کر کے ریاض کی بیوی نے اپنا ناس مار لیا تھا۔ پانچ پانچ دن بال سنوارنے کی فرصت نہ ملتی۔ نوکروں کے ہوتے ہوئے خود دن بھر چولھے کے پاس گھسی رہتی، کبھی برسوں میں آئی، تو بچوں میں الجھتی۔ حواس باختہ، ہونقوں کی صورت بنائے۔ اسے اپنے میاں سے بے حد شکایتیں تھیں۔ جتنی دیر بیٹھتیں ریاض کی برائیاں سن لیجئے۔

کوئی کہتا "ارے دلہن بھابی، آپ تو ہمیں بھول ہی گئیں۔"

اور وہ مونہہ بنا کر ٹھنڈی سانس بھرتیں۔ "اری کیا ملنے کو آئیں بہنو ——

تمہارے بھیا نے تو عاجز کر دیا ہے۔ اللہ قسم جو ایک منٹ کو فرصت ملتی ہو۔ دوستوں سے گھر بھرا رہتا ہے۔ وہ تو ایک منٹ گھر میں نہیں بیٹھتے۔ ہر بات بے تکی ہے ان کی۔"

تعزیت کو آئیں تو نفیسہ سے مل کر خوب روئیں۔ "ہائے اللہ کو بھی وہی پیارے ہوتے ہیں جنہیں بندے چاہیں۔ انہیں موت بھی نہیں آتی جن سے سب بیزار ہوں۔" پھر انہوں نے اپنے میاں پر تبرہ شروع کر دیا۔ "تمہارے بھائی کو بھی بے حد دکھ ہوا ہے ان کی تو ہر بات ہی بے تکی ہوتی ہے۔ جب سے حامد میاں کا انتقال ہوا ہے بس ہر وقت روئے چلے جاتے ہیں ——— میں نے کہا۔ یہ کیا عورتوں کی طرح ٹسوے بہا رہے ہو، جا کر بہن کو تسلی کیوں نہیں دیتے! بس ایکدم غصہ میں آ گئے۔ کہنے لگے۔ "میں اپنی آنکھوں سے نفیسہ کو بیوہ بنا نہیں دیکھ سکتا۔ تم نہیں جانتیں وہ سالا حامد تو صرف مجھے جلانے کے لئے مرا ہے ——— "بھلا بتاؤ ——— ! کوئی سنے تو کیا کہے!" انہوں نے ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر کہا۔

یہ سن کر نفیسہ چونک پڑی۔ اس نے اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھے بغیر بھابی کے ہاتھ پکڑ لئے "اللہ بھابی، کسی طرح ڈاکٹر بھائی کو بھیج دیجئے۔ میں تو مر جاؤں گی۔ اب میرا کون رہا ہے ان کے سوا؟"

حامد کے مرنے کے بعد پہلی بار وہ رو رہی تھی۔ اور سب حیران تھے کہ دلہن بھابی نے ایسی کونسی دل ہلا دینے والی بات کہہ دی!

"ریاض کو سچ مچ بہت محبت ہے ہم سب سے۔" اچھی آپا نے گلا صاف کر کے کہا۔

"یہ دور کی رشتے داری اس نے کبھی نہ سمجھی۔ ہمیشہ سگی بہنوں کی طرح سب کو چاہا۔ اور نفیسہ سے تو بہنوں سے بڑھ کر محبت کی ہے۔"

"بچپن سے نفیسہ کا اتنا خیال رکھتا تھا ——— کہ سگے بھائی شرما جائیں۔" اماں بھی وظیفہ ختم کر کے پاندان لے آ بیٹھیں۔

"ایک بار تمہیں یاد ہے اچھی بی! میلے میں سے نفی کے لئے مسی کی پڑیاں لایا تھا۔ سب خوب ہنسے تھے۔ میں نے اور خدا بخشے تمہاری دادی نے بڑی مشکل سے سمجھایا تھا کہ کنواریاں مسی نہیں لگاتیں۔ تو وہ پڑیا میرے پاندان میں رکھ گیا تھا۔ بس اس دن سے ہر وقت پوچھا کرتا تھا کہ نفی کا بیاہ کب ہوگا۔ کب اس کے مسی اور مہندی لگے گی!"

یہ سن کر آج بھی سب ہنس پڑے۔

"رہنے دیجئے۔ اب اتنے بھی بے وقوف نہیں ہوں گے۔" ریاض کی بیوی جھینپ گئی۔

"اللہ قسم میں جھوٹ تھوڑی کہہ رہی ہوں۔ ایک دن ماموں جان نے چڑانے کے لئے کہہ دیا کہ "بھئی تم ہر وقت نفی کو دلہن بنانے کی تیاریاں کرتے ہو لاؤ تمہارے ہی ساتھ اس کا بیاہ کئے دیتے ہیں ———" یہ سن کر سہم گیا۔ بس اس دن سے نفی کے بیاہ کا کوئی نام لے دیتا تو شرما کے بھاگ جاتا تھا۔" اماں کی بات تو شیطان کی آنت بن جاتی تھی۔ نفیسہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھے، مونہہ کھولے، ماں کو تکے جا رہی تھی۔

"اچھی آپا قسم کھا کر بتانا ———" ریاض کی بیوی نے ایک بڑا سا پان کا بیڑا مونہہ میں ٹھونس کر کہا۔ "میں نے بھی آپ سب کو کبھی سگی بہنوں سے کم سمجھا ——— ہاں مگر آپ کے بھیا نے مجھے کبھی بیوی نہ جانا۔ وہ تو مجھے اپنے گھر کی ماما سمجھتے ہیں۔"

"اوئی اللہ دلہن اللہ کا شکر ادا کرو ———" اماں نے فوراً اپنے ساس پن کا حق جتایا۔ "تم تو مہارانی ہو۔ اتنا بڑا گھر بار۔ پیسہ دولت سب ہی تو ہاتھ میں ہے اور بچارا ریاض ایسی نیک طبیعت کا ہے کہ کبھی چلا کر بات تک نہیں کرتا۔"

"یہ پھوپو کیسی باتیں کرتی ہیں!" ان کی بیوی نے جھنجلا کر اچھی آپا سے کہا۔ "انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ دل کا چین کیا ہوتا ہے ——— !"

سب اپنی باتوں میں مگن تھے اور یہ کسی نے نہ دیکھا کہ نفی پر ایک بار پھر وہی سکتے کا دورہ پڑا ہے جو حامد میاں کے دم توڑتے وقت پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ——— بتیسی بیٹھ گئی اور وہ اکڑ کے لکڑی کا تختہ بن چکی ہے۔

اللہ میاں نے کیسے کیسے عبرتناک مرض دنیا میں بھیجے ہیں ——— لوگ نفیسہ کو گم سم بیٹھا دیکھ کر سوچتے، بچاری کا دماغ ہی الٹ گیا ہے۔

اب ایک ہی ترکیب سمجھ میں آ رہی تھی کہ اداس نفیسہ کے آگے صفیہ کو جھنجھنے کی طرح بجائیں۔ مگر وہ اب سارے کھلونوں سے بیزار ہو چکی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ ننھی کے نخروں اور تنک مزاجی کی وجہ سے کوئی اس سے بات نہ کرتا۔ یا اب اسے چھوئی موئی کا پیڑ سمجھا جاتا۔ جیسے وہ کچی مٹی کا بنا ہوا گھروندا ہو۔ ذرا سی ٹھیس لگی اور ٹوٹ گرا۔

مرض ہی ایسا تھا۔ نروس بریک ڈاؤن کے حملے کوئی معمولی بات تھوڑی ہیں ——— ریاض نے آنکھیں مل کر کہا تھا۔ "بس اب آپ لوگوں کو چاہئے کہ نفیسہ کو ذرا بھی اداس نہ ہونے دیں۔"

لوگ چاہے کتنی ہی دلجوئی کریں، مگر اصل ٹانک تو ڈاکٹر تھا۔ وہ بھی کون سا ڈاکٹر ——— ! جس نے عمر بھر نفیسہ کا دل میلا نہ کیا۔ اس سے بڑھ کر اور کون سمجھتا اس کے مرض کو ——— ! تو بس شروع ہو گئیں دوائیں۔

ریاض ہسپتال جانے سے پہلے بڑے ماموں کے ہاں ضرور آتا تھا یہی کوئی ساڑھے دس گیارہ بجے۔ جب رضوان بھائی کورٹ چلے جاتے، بچے اسکول میں ہوتے، سلطانہ اور واحدہ کالج چلی جاتیں۔ صرف اماں ہوتیں کہ ابھی تک وظیفوں کی کتابوں میں غرق ہوتیں۔ یا پھر اچھی آپا سلطانہ کا جہیز نکال کر سینے بیٹھ جاتیں۔

کمرے میں اکیلی پڑی ہوئی نفیسہ بڑے بھائی کی کتابیں پڑھے جاتی۔ یا اٹھتی تو

اچھی آپا کے پاس بیٹھ کر ان کے جہیز کے پرانے کپڑوں کو نیا کرنے کی ترکیبیں بتا دیتی، مگر اس طرح کہ اس کا دھیان کپڑوں میں بالکل نہ ہوتا۔ نگاہیں بار بار دروازے کی طرف دوڑتیں اور وہ اپنے پلنگ پر منہ ڈھانپ کر لیٹ جاتی۔ میلا سا پردہ اٹھتا اور جوتوں کی چرچر سنائی دیتی تو اس کے ہاتھ اپنے بال سنوارنے لگتے۔ اب اسے عادت ہو گئی تھی کہ صبح ہی اٹھ کر اپنے بال کھول پھینکتی۔ پھر سنوارنا یاد ہی نہ رہتے۔

مگر ہر بار دروازے میں کوئی اور ہی نمودار ہوتا۔ کبھی دھوبی حساب کرنے آیا ہے۔ کبھی بڑے خالو اپنے کھیتوں کی ترکاریاں لئے چلے آ رہے ہیں۔ ایک ذرا کی ذرا چہل پہل ہو جاتی۔ اس کے بعد پھر وہی پیلی دھوپ میں سونا آنگن پڑا سنسنا رہا ہے۔ کبھی کبھی چھت کی منڈیر پر کوئی کبوتر اپنی بیوی سے لڑنے لگتا اور خفا ہو کر اڑ جاتا۔ پھر بڑی دیر تک اس کے پروں کی آواز آنگن میں ڈولتی پھرتی، گونجتی رہتی ——— کبھی بڑی آپا کی قینچی تک اٹھتی۔ یا اماں دعا مانگنے میں کھانسنے لگتیں ——— دور کہیں سڑک پر قلفی ملائی والا آواز لگاتا۔ کبھی چھن چھن کرتا کوئی تانگہ گزر جاتا۔ یا پھر بچوں کی ایک ٹولی چیختی چلاتی گلی میں داخل ہوتی۔ پھر اچانک دور کہیں موٹر سائیکل کی دھڑ دھڑ کا شبہ ہوتا اور نفیسہ کتاب رکھ کر چونک پڑتی تھی۔ آواز قریب آتی ——— جیسے پہاڑ کے اوپر سے پتھر لڑھکتا ہوا آ رہا ہو ——— وہ کانپ جاتی۔ ذرا دیر میں پردہ پھڑ پھڑاتا۔ آنگن میں چھایا ہوا سکوت ریاض کے بھاری بوٹ کی ضرب سے پاش پاش ہو جاتا۔ دھپ۔ دھپ۔ دھم۔ دھم ——— وزنی جوتوں تلے جانے کیا کیا روندتا ہوا ریاض اندر آتا۔ دہلیز پر چمکدار بوٹ کی ایڑی دکھائی دیتی اور وہ اپنی سونی باہیں تکیے پر پھیلا کے گر جاتی تھی۔

"کیسی طبیعت ہے ——— ! دوا دی تھی ——— صبح کتنا ناشتہ کیا ———

وہ سفید نائیلون کی ساری بھی نہیں پہنی!"

جانے کتنی باتیں ہونٹوں میں سرگوشیوں میں ——— وہیں فرش پر اچھی آپا کے پاس بیٹھا وہ قینچی سے ایک دھجی کی ہزار کترنیں کاٹ کاٹ کر پھینکے جاتا۔ پھر کسی بات کا جواب دیتے دیتے بڑی آپا رک جاتیں "بھیا مجھے یاد نہیں آتا۔ جانے کتنی خوراکیں پلائی ہیں ——! اے نفی، آج تم نے دوا کی کتنی خوراکیں پیں ——— ؟" وہ مشین چلاتے میں ہاتھ روکے بغیر نفی سے پوچھتیں۔

"مجھے کب یاد رہتا ہے! آپ یہاں آ کر شیشی دیکھ جایئے۔" وہ کروٹ بدل کر بڑی بیزاری سے جواب دیتی۔

"میرا چندا بھیا ذرا اٹھ کر دیکھ لے۔" اچھی آپا اپنے بھاری بدن کو اٹھانے کی ناکام کوشش کے بعد کہتیں۔

"میں نہیں جاؤں گا۔" وہ بڑے عزم سے جواب دیتا۔

"ادئی اتنی بھی کیا کاہلی! ہماری عمر کو پہنچ کر جنیں کیا حال ہو گا!"

حالانکہ اچھی آپا اچھی طرح جانتی تھیں کہ اس کمرے میں جانے کے لئے کاہلی کا کوئی دخل نہ تھا۔ بھلا سوچئے تو بال بچوں والا اتنا مصروف ڈاکٹر دو میل دور سے عین آفس کے وقت چل کر آ سکتا ہے تو پھر نفیسہ کے کمرے تک جانے میں کیوں اس کے پیر ٹوٹ جاتے ہیں ——— ؟ اس بات پر پچاسیوں بار تو اماں نے ٹوکا۔ بڑی آپا نے بھی ڈانٹا۔ بڑے بھیا نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اب ریاض کو اپنی بہنوں کا خیال ہی نہیں رہا ہے۔

نفیسہ بھی اس کے جانے کے بعد خوب جھنجلاتی تھی۔ "وہ تو مجھے جوگن سمجھنے لگے ہیں۔ کبھی جو اپنے ہاتھ سے باہیں پکڑ کر انگیٹھی دیں۔ بات کریں گے تو کسی اور سے مخاطب ہو کر ——— ہائے اماں آخر کیا بات ہو گئی ہے جو مجھے سب ہی منحوس سمجھنے لگے ہیں۔"

اور اپنی بیٹی کے اس دکھ پر اماں کا کلیجہ پھٹنے لگتا تھا۔ وہ کمرے میں جا کر خوب روتیں ساتھ ساتھ بچاری بھابی کو بھی خواہ مخواہ اپنی آنکھیں رگڑنا پڑتی تھیں۔ مگر ریاض ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ نفیسہ کو انگارہ سمجھتا رہا۔ کبھی اتفاق سے نظر بھی پڑ جائے تو یوں جیسے خلا کو تک رہا ہو۔ ایک بار زبان دیکھنا تھی تو صرف زبان ہی دیکھی۔ اللہ جانے ان بیقرار آنکھوں کو اتنا قرار کیسے مل گیا تھا۔ اور پھر یہ ضد کہ نہیں یہ ساری تو بالکل ہلکے رنگ کی ہے اس کے پہننے میں کیا حرج ہے۔ سونے کے کنگن تو سب ہی بیوائیں پہنتی ہیں۔ مگر ریاض کے اصرار کرنے پر بھی نفیسہ نے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا۔ وہ کیوں پہنے کوئی چیز جب دیکھنے والا ہی نہ رہا۔ اب تو وہ ساری زندگی یوں ہی کھلے بالوں اور سفید ساری سے گزار دے گی۔

سب اس کی طرف دیکھتے۔ جیسے صبح کے وقت پھیکا سیٹھا چاند دیکھ رہے ہوں۔ جیسے کوئی بھرا پرا گھر اچانک ڈھنڈار ہو جائے۔

پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ ڈاکٹر ماموں کو اپنی بھانجی نظر آ گئی، جسے انہوں نے ہمیشہ نظر انداز کر دیا۔ فراک پہنے، بالکل اپنی ماں کے انداز میں مٹکتی پھر رہی تھی۔ مگر ریاض نے اس کے چیخنے چلانے کے باوجود اسے گود سے نہ اتارا۔ اپنے سفید شارک اسکن کے پینٹ پر اس کے کیچڑ سے بھرے پاؤں رگڑ ڈالے اور اپنی کلائی پر اس کے دانتوں کے زخم بھی سہہ لئے۔ مگر صفیہ کو گود میں اٹھانے کا نشہ کسی ترشی سے نہ اترا ——— پھر جب وہ زبردستی اس کی باہوں میں سے پھسل کر بھاگ گئی تب بھی ریاض اسے گھورے گیا۔

آج صفیہ کیسی اچھی لگ رہی ہے ——— ! وہ سورج مکھی کا پھول بن گیا۔

کتاب بند کر کے نفیسہ نے اسے دیکھا ——— آہستہ آہستہ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پلنگ پر گر گئی اور وہ آنگن میں دوڑتی ہوئی صفیہ کو دیکھنے لگی۔ اس کے مہندی میں رنگے ہاتھوں کو، اس کی چمکتی ہوئی فراک کو اور اس کے بالوں کے لچھوں میں پھنسی

ہوئی سرخ رہن کو۔

دوسرے دن جب دروازے میں بھاری سے بوٹ نے زمین کو ہلایا تو نفیسہ جلدی سے کتاب رکھ کر لیٹنے کی بجائے سنبھل کر بیٹھ گئی اور کان باہر کی سرگوشیوں پر لگا دیئے۔

اچھی آپا ریاض کی فضول خرچیوں پر خوب برس رہی تھیں۔

وہ جانے کیا الا بلا صفیہ کے لئے اٹھا لایا تھا۔ آج پہلا دن تھا کہ اس کے ہاتھ میں نفیسہ کے لئے نہ تو کوئی دوا تھی نہ کوئی اور چیز۔ وہ صرف صفیہ کے لئے چوڑیاں، مہندی، ریشمی فراکیں اور جانے کیا کیا لایا تھا۔

"بھلا کہیں بال بچوں والے یوں ہاتھ کھول کر خرچ کرتے ہیں! ابھی تو بچاری دلہن چوبیس گھنٹے کڑھتی رہتی ہیں۔"

"دلہن! ہماری بھی کوئی دلہن ہے!" ریاض نے اداس لہجہ میں کہا۔

"اللہ سلامت رکھے دلہن اور اس کے بچوں کو۔ ایسی باتیں کیوں مونہہ سے نکالتے ہو ——؟" اچھی آپا نے کہا۔ مگر وہ جانے کتنے شدید کرب سے تلملا رہا تھا۔ اس کا مونہہ سرخ بھبوکا ہو گیا۔ ایک بڑے سے گھونٹ میں اس نے اپنے لہجے کی ساری تلخی نگل لی۔

"وہ تو ہمیشہ سلامت رہینگی میرا سوگ منانے کے لئے۔ لیکن میری زندگی کی دعائیں آپ کبھی نہیں مانگتیں!" اس نے بگڑ کر کہا۔

"اللہ توبہ —— کیسا احسان فراموش بھائی ہے!" اچھی آپا کو ہنسی آ گئی۔

"ہماری دعائیں تو کام آئیں جو اتنے بڑے ڈاکٹر بنے، اتنی اچھی دلہن ملی۔"

"ہشت" اس نے نفرت سے مونہہ بنایا۔ "مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے میں مر چکا ہوں اور لوگ میرا سوگ منا رہے ہیں۔ آپ نے کبھی دیکھا کہ میرے لئے کسی نے اچھے کپڑے بھی پہنے ہوں!" غم کے مارے اس کی آواز رندھ گئی۔

"ذرا سادگی پسند ہے تمہاری دلہن —— بچاری کو بچوں سے فرصت بھی کہاں ملتی ہے! اور بھئی سچ بات تو یہ ہے کہ تم بھی تو کبھی اس کی طرف توجہ نہیں دیتے۔"

"اونہہ —— چھوڑو بھی آپا اس ذکر کو ——" وہ بیزار ہو گیا۔ "آپ یہ باتیں کیا جانیں!"

اس دن بڑی آپا نے اس کا موڈ ایسا خراب کیا کہ وہ صفیہ کو بلا کر چیزیں بھی نہ دے سکا اور غصہ میں ٹائیں ٹائیں کرتا چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد پہلی بار نفیسہ نے اٹھ کر خود سب چیزیں اٹھائیں اور دیکھیں، فوراً فراک قطع کر کے سی ڈالی۔ اور مہندی گھول کر خود ہی صفیہ کے ہاتھوں پر لگانے بیٹھ گئی۔ صفیہ نے شرارت میں اس کے بھی ہاتھ سان دیئے۔ بلکہ جان بوجھ کر اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے رگڑ ڈالے تو اس نے اٹھ کر دھڑا دھڑ صفیہ کو پیٹ دیا۔

بعد میں جب نفیسہ بار بار اپنے سرخ ہاتھ سفید ساری میں چھپا رہی تھی تو اماں نے ڈانٹ دیا۔ "ذرا سی مہندی ہاتھ کو لگ گئی ہے تو کونسی آفت آ گئی۔ ہماری ساس تو گرمیوں بھر اپنے ہاتھوں میں مہندی لگایا کرتی تھیں۔"

"مگر ننگی کلائیوں پر مہندی کیسی بری لگتی ہے۔" اس نے اپنی سفید سفید کلائیاں دیکھ کر کہا۔ یہ سن کر اس کی بڑی بھابی اٹھیں اور زبردستی اپنی سونے کی چوڑیاں اس کے ہاتھوں میں ڈال دیں۔

"آج کیسی گرمی ہے۔ میرا کمرہ تو تندور بنا ہوا ہے ——" وہ دالان میں لیٹی رہی۔

ہر روز کی طرح ریاض آیا —— اپنی نگاہوں کو زمین پر بچھائے۔ اچھی آپا سے سرگوشیوں میں مصروف ہو گیا۔

"اماں مجھے تو زکام ہو رہا ہے، ٹھنڈی مہندی چھونے سے۔ اب بھلا مجھے کہاں عادت رہی ہے!"

یہ سن کر ریاض کی آنکھیں بڑی آہنگی سے اٹھیں اور پورا دالان طے کر کے نفیسہ کے سرخ ہاتھوں کو چھو آئیں۔

"دیکھوں ——!" وہ لپک کر اٹھا اور جلدی سے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لئے۔

"مگر یہ تمہارے سر کے چکر اور اختلاج کے لئے بہت مفید ہے۔ سب مرض جاتے رہیں گے۔"

"اور زکام ——؟" نفیسہ نے بڑی بے بسی سے اسے دیکھا۔

"میں اس کا بھی علاج کر سکتا ہوں۔ تم گھبراتی کیوں ہو؟" اس نے اطمینان دلایا، اور جلدی سے مہندی لا کر نفیسہ کے ہاتھوں پر نقش و نگار سے بنانے بیٹھ گیا۔

پکٹوگرام کشیدہ کاری کی مشین منگائیے

کشیدہ کاری کی کتابیں منگانے والی بہنوں کو خاص قسم کی مخملی کڑھائی کاڑھنے کے لئے ایک ایسی مشین کی ضرورت تھی جو ان کے لئے آسانی پیدا کر دے، بانو بک ڈپو نے ایک ایسی ہی اچھی مشین مہیا کی ہے آپ بھی ایک کارڈ لکھ کر منگائیے قیمت معہ محصول ڈاک صرف پانچ روپے۔

پرچہ ترکیب ہمراہ روانہ کیا جائے گا۔

بانو بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی

بڑا دَواخانہ دہلی کی آیورویدک دَوائیں

شعبۂ دَواسازی بڑا دَواخانہ دہلی نے آیورویدک دَوائیں شاستروں کے اصل نسخوں کے مطابق تیار کرنے کا بندوبست کیا ہے اس وقت وہی دوائیں پیش کی جارہی ہیں جن پر کالی تحقیقی تجربات کئے جاچکے ہیں اور مسیح زماں حکیم محمود سعید خاں صاحب نبیرۂ مسیح الملک حکیم اجمل خاں رح نے اپنے مطب میں سینکڑوں مریضوں کو استعمال کرا کر ان دَواؤں کے بیش بہا فوائد کی تصدیق کردی ہے۔

چندر پربھاوٹی یہ آیورویدک کی ایک نہایت کامیاب دَوا ہے جو جگر اور تلی کی خرابی کو دور کرتی ہے۔ گُردہ اور مثانہ کے امراض میں مفید ہے نوجوانوں کی غلط کاری سے پیدا ہونے والی شکایتوں مثلاً جریان۔۔۔ احتلام۔۔۔۔ رقت۔۔۔۔ اور سرعتِ انزال کو دور کرتی ہے۔ خون کی پیدائش بڑھا کر عام جسمانی کمزوری دور کرنے میں عجیب تاثیر رکھتی ہے۔ ذیابیطس (پیشاب میں شکر آنے) کے لئے بھی نہایت مفید دَوا ہے مثانہ کی کمزوری کی وجہ سے بار۔ بار پیشاب آتا ہو، فوطے بڑھ گئے ہوں یا رات کو سوتے وقت بستر پر پیشاب نکل جاتا ہو، یہ سب شکایتیں بھی اس دَوا سے دُور ہوجاتی ہیں۔

ترکیب استعمال :۔ ایک ۔ ایک ٹکیہ صبح وشام دودھ سے استعمال کریں۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ چار آنے۔

چیون پراش اولیہ تازہ پہاڑی آملے اس مشہور دَوا کا جزوِ اعظم ہیں۔ چیون پراش اولیہ پرانی کھانسی، دمہ، نزلہ اور زکام کے لئے مفید ہے۔ پھیپھڑوں کو قوت پہنچاتا ہے۔ دِق اور سل میں مفید ہے اس کے استعمال سے گردہ اور مثانہ کی بیماریاں دور ہوجاتی ہیں۔ حافظہ کو قوت پہنچانا، اور جسم میں کیلسیم کی کمی کو پورا کرکے تندرست رکھنا اس کا خاص فائدہ ہے۔ مرضوں کے بعد کی کمزوری کو دور کرتا ہے۔ اس کے باقاعدہ استعمال سے خون زیادہ مقدار میں بننے لگتا ہے۔

بڑا دَواخانہ کا چیون پراش شاستروں کی ترکیب سے تازہ سبز آملوں اور بہت سی نایاب جڑی بوٹیوں سے تیار کیا جاتا ہے۔

قیمت فی شیشی (۱۰ تولہ) ایک روپیہ چار آنے۔

سُپاری پاک "بڑا دَواخانہ" نے آیورویدک کی اس مشہور دوا کو شاستروں کے اصل نسخہ میں ترمیم کئے بغیر اُس خرابی کو دور کردیا ہے۔ جو عام طور پر بازار میں ملنے والی سپاری پاک میں پائی جاتی ہیں۔ اب اس کو زیادہ عرصہ تک رکھنے سے کسی قسم کی بُو نہیں پیدا ہوتی اور نہ اس میں کیڑے وغیرہ پڑتے ہیں۔

سپاری پاک عورتوں کے پرسوت (لیکوریا) اور ماہواری کی بے قاعدگی کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کی دَوا ہے۔ یہ دَوا رحم کی اُن خرابیوں کو دُور کردیتی ہے جن کی وجہ سے حمل نہیں ٹھیرتا جوڑوں اور کمر کے درد کو دور کرتی ہے۔ عورتوں کی تندرستی اور جوانی کی حفاظت کرتی ہے۔

سپاری پاک عورتوں کے علاوہ مردوں کے مخصوص امراض کی بھی ایک بہترین دَوا ہے۔

قیمت فی شیشی (۱۰ تولہ) ایک روپیہ چار آنے۔

عُمدہ صاف ستھری مفرد اَدویات اور پُورے اَجزا سے بنے ہوئے مرکبات کا مستند مرکز۔

بڑا دَواخانہ — لال کنواں — دہلی ۶

قہقہہ

ہاجرہ نازلی

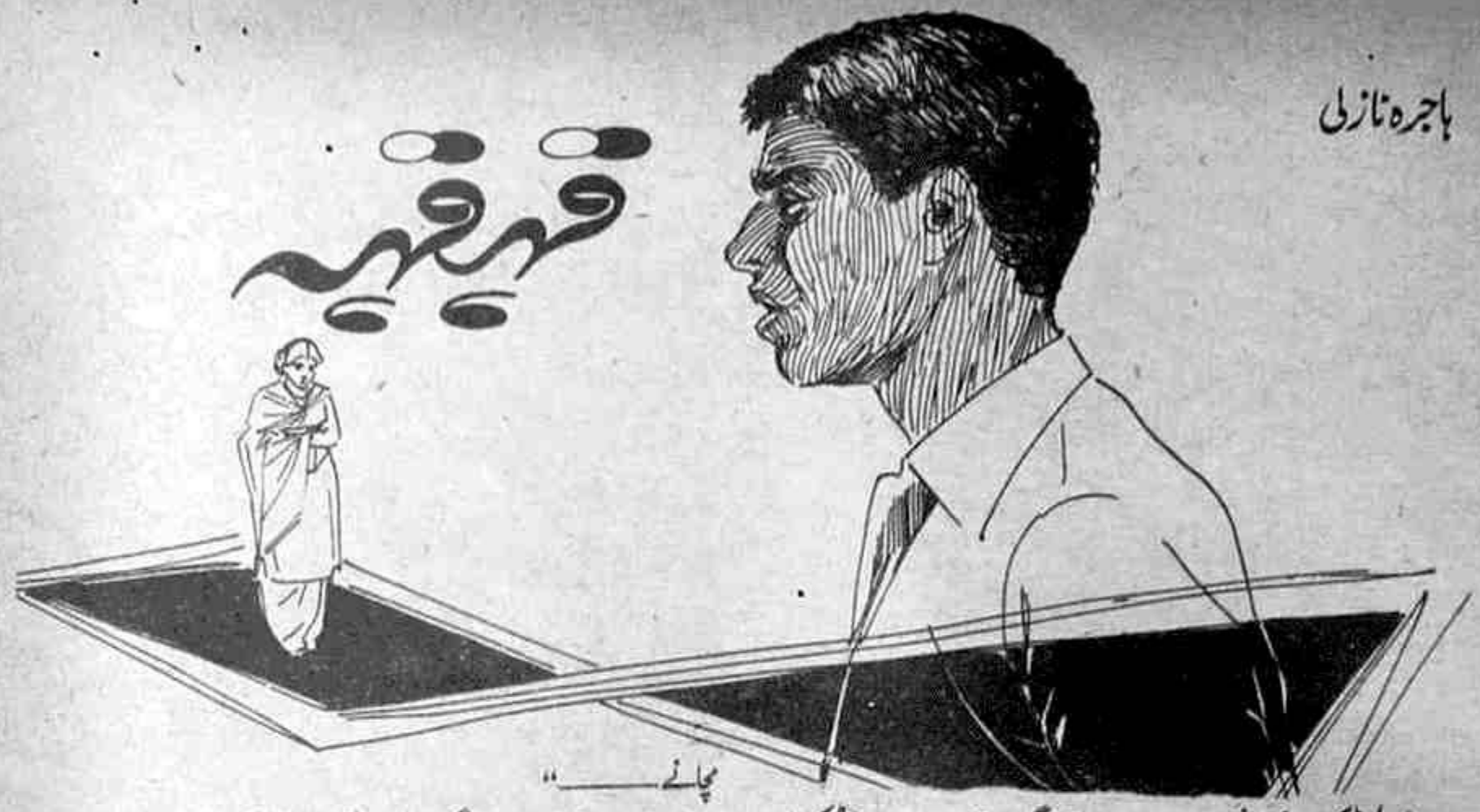

مچانے ـــــــ"

پہلے ٹھیکری کے رشتے کا بہت رواج تھا۔ مگر اب تو اس رواج پر ہی ٹھیکرے برسنے لگے۔ بچی پیدا ہوئی اور کسی خالہ، پھوپی، چچی، ممانی نے اپنے لڑکے کے لئے گندی ٹھیکری میں روپیہ آٹھ آنے ڈال دیئے اور کہہ دیا "یہ میری ہوگئی"۔

لیجئے ہر طرف سے مبارک سلامت ہوئی، مونہہ میٹھا ہوا اور رشتہ منگنی سے فارغ ہوگئے۔ دو معصوم بندھ گئے رواجی بندھنوں میں ـــــــ وہ مقدس عہد جو بڑے ہو کر ان بچوں کو کرنا تھا ـــــــ وہ ان کے والدین نے کر دیا۔ چھٹی ہوئی۔

اب خواہ بڑے ہو کر یہ آزاد، جواہر لال بنے یا بھوپت ڈاکو ـــــــ اس سے کیا بحث ہے ـــــــ ماں باپ جنم کے ساتھی ہیں کرم کا کوئی ساتھی نہیں۔ جو کچھ قسمت میں ہوگا ہو رہے گا ـــــــ مگر جیون ساتھی کی تو سب کو ہی ضرورت ہے۔ اس ضرورت سے تو جانور بھی مبرا نہیں ہیں ـــــــ اور پھر شوہر بیوی کا تو جنتی رشتہ ہے ماں، باپ، بھائی، بہن وغیرہ تو سب بعد کی پیداوار ہیں باوا آدم کے لئے سب سے پہلے جیون ساتھی ہی اللہ نے پیدا کیا تھا۔

لیلیٰ کے پیدا ہوتے ہی اس کی پھوپی نے ٹھیکری میں روپیہ ڈال کر اعلان کر دیا "یہ میرے امین کی بہو ہے"۔

اور پانچ برس کے ننھے سے امین نے اچھل کود کر بہو کا خیر مقدم کیا "ابا جی میری دلہن آئی، اماں نے ہمارے لئے دلہن منگائی ـــــــ"

اب اس وقت اس کا گلا دبا کر کون کہتا کہ "نامعقول ابھی سے کیا خوش ہو رہا ہے بڑا ہو کر نہ جانے تو ہی کیا قیامت برپا کرے گا، ابھی بسنت کی خبر تو ہے نہیں لگا شور

وقت کے تو جیسے پر لگے ہوتے ہیں گذرتا نہیں اڑتا ہے۔ یا ماہ و سال ہی سکڑ کر چھوٹے ہو گئے ـــــــ ایک ہی گردش میں روس کے اسپتنک کی طرح دن رات پھک سے گذر جاتے ہیں دیکھتے ہی دیکھتے مہینے بنے اور مہینے جڑ کر سال ختم ـــــــ نہ جانے گذرا ہوا وقت کھو جاتا ہے۔ لاکھ ڈھونڈتے رہ جاؤ۔ ماضی اندھیروں میں گم ہوا اور حال کی تلخیاں مستقبل سے خوف زدہ رکھتی ہیں۔ اس زمانے میں ہر گذرنے والا لمحہ آنے والے تلخ لمحوں کی نشان دہی کر جاتا ہے ـــــــ

کل کے بچے ـــــــ آج کے نوجوان نظر آتے ہیں۔ مگر وہ کل ہی بڑے غضب کی تھی اپنی گود میں کھیلنے والے ان بچوں کا شعور وقت سے پہلے بیدار کر گئی۔ انسانی زندگی کا نقطۂ آغاز اپنی زندگی کا شعور ہی تو ہے ـــــــ اور یہی شعور جب بیدار ہو جاتا ہے تو زندگی میں حرکت، عمل اور ارتقا شروع ہوتا ہے ـــــــ اور آج کے نوجوانوں کا یہی ارتقا ہمارے لئے تحیر زا ہے ـــــــ کس تیزی سے ترقیات کے زینے طے ہو رہے ہیں ـــــــ ان لمبی لمبی چھلانگوں کا بھلا بیس سال پیچھے کے لوگ کیا مقابلہ کر سکتے ہیں ـــــــ؟

یہ نوجوان گورے کالے، سانولے، اونچے، نیچے، رنگ برنگے، مختلف ڈیزائن کے مختلف خانوں میں فٹ ہیں ـــــــ اور ان سب کے مزاجوں کا اک الگ ہی سیکشن ہے سیدھے سادھے نیک اللہ میاں کی گائے قسم کے، چالاک، ضدی، خود سر، مونہہ پھٹ، جیسے کسی کھونٹے بندھے ہی نہیں۔

اُس موئی "کل" کو یہ کیا خبر تھی کہ گود میں شیطان پل رہے ہیں؟ وہی سانولا امین

بڑے ہو کر گنے کے رس کا میل ہو کر رہ گیا۔ گہری سیاہی میں سبزی کی جھلک۔ اگرچہ ناک نقشہ خاصا تھا مگر جسم کے اس کوئلے کو چھڑا دینا اس کے بس میں نہیں تھا۔

مگر اس کو اپنی سیاہی کا غم نہ تھا ——— اکثر اس کے کانوں میں ماں، خالہ اور پھوپی وغیرہ کے یہ الفاظ گونجا کرتے تھے "مرد کی صورت نہیں دیکھی جاتی۔ کمائی دیکھتے ہیں"

"مرد تو سانولا سلونا ہی اچھا لگتا ہے۔ گورا چٹا کس کام کا ساڑی، شلوار پہنا دو تو ننھا معلوم ہو۔ ذرا وقار نہیں ہوتا سفید مرد پر"

"اصل چیز تو مرد کی بہادری ہے، خوبصورت مرد پر زنانہ پن برستا ہے"

ظاہر ہے اس قسم کے ریمارک سن کر امین اپنی سیاہی پر خدا کے لاکھ لاکھ شکر کرتا ہوگا ——— کمانے بھر کا علم بھی اس کے پاس تھا اور کمائی بھی تھی۔ وہ اپنے آپ کو کسی ہیرو سے کم تھوڑا ہی سمجھتا تھا!

امین اور لیلیٰ کے ماں باپ وطن سے دور پیٹ کے دیس میں رہتے تھے امین کی تو سمجھو لیلیٰ سے ٹھیکری کی منگنی تھی۔ اور اس کی بہن آمنہ کی منگنی کنبے کے ایک مالدار گھرانے میں ہوئی تھی۔ بشیر پڑھا لکھا نیک سیرت لڑکا تھا اس کے ساتھ آمنہ کی منگنی آمنہ کی خوش قسمتی تھی۔ اچھے لڑکے قسمت سے ہی ملتے ہیں ——— امین لیلیٰ اور آمنہ جوان ہو چکے تھے۔ بیٹی پر جوانی ماں، باپ کی پریشانی بن کر آتی ہے ——— جوان بیٹی ماں، باپ کے سینے کا پتھر ہوتی ہے۔ جب تک یہ وزنی پتھر ہٹ نہ جائے نیندیں حرام رہتی ہیں۔ لیلیٰ کے باپ بھی جوان بیٹی کے فرض سے جلد سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ بہنوئی سے ذکر کیا ——— انہیں کیا انکار ہو سکتا تھا۔ وہ بھی بیٹے کے سہرے کے ارمان میں تھے اور سوچتے تھے بیٹے کی دلہن اپنے گھر اور بیٹی کو پرائے گھر ایک ہی دن میں کر دیں گے کچھ خرچ ہی کی کفایت رہے گی ———

سالے سے کہہ دیا تم وطن چلو، تیاری کرو میں بھی ہفتے بھر تک پہنچ جاؤں گا۔

وطن پہنچ کر امین کے موہنہ کا ایسا نالہ ٹوٹا کہ سب ہی دم بخود رہ گئے۔

اس کی تو منگنی بھر کی زبان ہلی مگر ہر ایک پر جیسے بم پھٹ پڑا، پہاڑ سر پر آ گرا ماں، باپ کا تو جیسے دم اوپر کا اوپر رہ گیا۔ بھائی بھاوج کے سامنے ایسی رسوائی ہوئی کہ آنکھ اٹھانے کے قابل نہ رہے ——— امین کی نامعقولیت کی انتہا تھی کہتا ہے "میں لیلیٰ سے شادی نہیں کروں گا وہ تو کالی ہے ———"

ہائے غضب خدا کا ٹھیکری کا رشتہ اور عین شادی کے موقع پر کم بخت نے انکار کر دیا ——— لیلیٰ کے ماں باپ کو تو جیسے سکتہ ہو گیا۔ اک دم تو وہم رہ گئے۔ ساری تیاری مکمل ہو چکی تھی بیٹی کا معاملہ، نام نکل گیا تو کیا ہوگا ——— ؟ کہتے ہیں نکلا گاؤں ہاتھ آ جائے، نکلا نام ہاتھ نہیں آتا ———

ماں نے رو پیٹ کر اور باپ نے آنکھیں نکال کر بیٹے کو سمجھانا چاہا ——— بھلا وہ باگڑ بیل کسی کے قابو کا تھا ——— باپ کا کردہ دھ اور ماں کی تمنا چاپلوسی سب ہی مسترد ہو گئے ——— یہ وہی کل کا ننھا بچہ تھا جس نے اچھل کود کر شور مچایا تھا ——— کانوں کے پردے پھاڑے تھے ——— "اماجی ہماری دولہن آئی۔ اماں نے دولہن منگائی"

اور ادھر لیلیٰ کے باپ نے سر جھٹک کر فوراً ہی ایک فیصلہ کر لیا۔ وہ بیٹی کی اس توہین پر تلملا گئے ——— امین ان کا بھانجہ سہی مگر "بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان" امین کو وہ ایسا سبق پڑھانا چاہتے تھے کہ اس کے دل کی گہرائیاں تک لرز اٹھیں۔

کہتے ہیں بیٹی تو فقیر کی بھی بیٹھی نہیں رہتی۔ اگر لیلیٰ کو کالی کہہ کر امین نے ٹھکرا دیا تو کیا ہوا ——— لیلیٰ وہ مہکتا ہوا پھول تھی جس کی بھینی بھینی خوشبو ہر جگہ پھیل چکی تھی وہ سانولی ضرور تھی۔ مگر اس کی ستواں ناک، بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں تراشیدہ لب اور موتی ایسے دانت۔ وہ ان لڑکیوں سے کہیں زیادہ حسین تھی جو صرف چمڑی کی سفیدی سے حسین کہلاتی ہیں۔ بہت سے اندھے چندھے بھی گورے ہوتے ہیں۔ کبھو وہ بھی حسین ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ خالی گوری چمڑی تو حسن نہیں کہلا سکتی!

لیلیٰ اپنے ملیح حسن کے ساتھ حسن سیرت میں بھی سیکڑوں میں انتخاب تھی۔ اور وہی اس کا اصلی حسن تھا ———

عورت ——— جو انسانیت کی ازلی رعنائی ہے ——— جو اس حیات پرور ماحول کی نمائندہ ہے ——— امین نے اس کی زندگی میں کانٹے بھرے اس کی پرسکون زندگی کو طلاطم بخشا۔ سماج کے زہر میں بجھے ہوئے تیروں کا ہدف بنایا۔ اس کے لئے ایسا ماحول تیار کیا جہاں انتشار اور بدنامی کے سوا اس کو کچھ حاصل نہ ہو۔

وہی لیلیٰ جو اپنے مستقبل کا تابندہ نقش اپنے حال کے آئینہ میں دیکھتی تھی۔ اُس مجلا آئینے کو امین نے چور چور کر ڈالا ——— وہی تابندہ نقش ادھا ہو کر ایک سیاہ دھبے میں تبدیل ہو گیا ——— لیلیٰ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم، کے مصداق رہ گئی۔

باپ نے اپنی قرۃ العین کو دیکھا ——— اور ایک فوری فیصلے پر مجبور ہو گئے امین کے جواب دینے کے بعد سے لیلیٰ کے لئے پیاموں کی جیسے بارش ہو گئی، اُس جگمگاتی روشنی سے ہر ایک اپنا گھر منور کرنا چاہتا تھا ——— اور جب لیلیٰ کے باپ کے فیصلے نے عملی جامہ پہنا تو امین کو دن میں تارے نظر آ گئے۔ اس نے اپنے دماغ میں ایک زبردست جھٹکا سا محسوس کیا۔ اور اس کا سر چکرا گیا۔

لیلیٰ کے باپ نے لیلیٰ کی شادی امین کی بہن آمنہ کے منگیتر بشیر سے کر دی۔

"کیا ماموں یہی جواب دے سکتے تھے ——— ؟" جیسے امین نے خود سے سوال کیا۔

"اس سے بہتر جواب اور ہو بھی کیا سکتا تھا!" جیسے کسی نے امین کے کان میں کہا۔

اور امین بوکھلا گیا ——— اس کی معصوم بہن آمنہ نے بھائی کی حماقت کی سزا بھگتی ——— جیسے امین کے دل کی گہرائیاں چیخ اٹھیں۔

اگر ایک طرف اس کو خیال ہوا کہ ماموں نے اپنی بہن اور معصوم بھانجی پر ظلم کیا۔ تو دوسری طرف اس کو خود اپنے اندر سے آواز آتی تھی کہ تو نے بھی اپنے ماموں اور ان کی معصوم بیٹی پر یہی ظلم توڑا تھا ——— اب اس "گنبد کی صدا" سے کیوں تلملایا جاتا ہے۔ جیسی کہی ویسی اب سُن ——— ! دوسرے کی عزت کو پیروں میں روندتے وقت اپنی عزت کی طرف سے کیوں آنکھیں بند کر لی تھیں؟ کسی کی بیٹی کو بدنام کرتے ہوئے۔ اپنی بیٹی کا خیال کیوں نہ آیا ——— ؟

آمنہ بے تصور تھی وہ چپ رہ گئی۔ جینے کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔

لیکن لیلیٰ کے باپ جانتے تھے کہ یہ ایک جذباتی جواب تھا جو امین جیسے لوگوں کو ملنا ہی چاہیے تھا۔ لیکن بھائی کے قصور کی سزا بہن کو نہ ملنی چاہئے لہٰذا انہوں نے ایک بہتر لڑکا منتخب کر کے بہن بہنوئی سے آمنہ کی شادی کے لئے کہا اور دونوں نے سر جھکا کر منظوری دے دی۔ اور آمنہ کی شادی منظور جیسے ہونہار نوجوان سے ہو گئی۔

اور امین کولہو کے بیل کی طرح وہیں کا وہیں گردش کر رہا تھا۔

لیکن ماں باپ کے لئے تو سب ہی اولاد برابر ہے۔ دونوں ہی آنکھیں پیاری ہوتی ہیں خواہ ایک آنکھ میں آشوب ہی کیوں نہ ہو ——— انہیں امین کا فکر تھا ——— جس کی آرزوئیں اور تمنائیں وقت کے ریگستان میں دفن ہو کر رہ گئیں تھیں ——— آخر بڑی تگ و دو کے بعد امین کی منگنی ناعمہ سے ہو گئی۔ ناعمہ کی صرف چمڑی ہی گوری نہیں تھی ——— وہ ناک آنکھ سے بھی درست ایک خوبصورت لڑکی تھی ——— اور جب امین کو اس حقیقت کا علم ہوا تو جیسے اس کی ساری ہی سوئی تمنائیں اور آرزوئیں کسمسا کر بیدار ہو گئیں۔ اس کی آنکھوں میں رنگ و نور کے شرارے ابھرنے لگے۔ جیسے دم توڑتی امنگوں کو بیوٹی کوئن ناعمہ کا سہارا مل گیا ——— !

دیر کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی ——— گھر میں شادی کا ہنگامہ شروع ہو گیا اور ایک دن وہ بھی آ گیا جب سہرے، گجرے سے آراستہ دلہا بنا ہوا امین خوشی کے شادیانے بجاتا بارات لے کر ناعمہ کو بیاہنے پہنچا ——— مگر اس نے حیرت سے دیکھا۔ نہ بارات کا استقبال ——— نہ خوشی کے نغمے ——— نہ قہقہے اور چہچہے ——— یہ کیا ——— ؟ سب لوگ کچھ بیزار سے نظر آئے ——— امین نے آنکھیں گھما گھما کر ہر طرف دیکھا کہیں تو خوشی کی پھلجھڑی چھوٹتی ہوئی نظر آ جائے ——— مگر توبہ کر دو ہاں تو ہر طرف سکوت کا رقم تھا ——— امین کا دم گھٹنے لگا ——— یہ سب کیا ہے ——— ؟ یہ سب کیوں ہے ——— ؟ سوالیہ نشانوں کی ایک فوج سی اس کے ذہن کے پردے پر کھڑی تھی۔ قاضی صاحب کے نکاح کے بارے میں پوچھنے پر کسی نے بڑھ کر جیسے امین کے سینے پر توپ داغ دی۔

"ناعمہ کہتی ہے کہ میں امین سے شادی نہیں کروں گی وہ تو بہت کالا ہے"

اور امین کی آنکھوں کے سامنے جیسے پوری کائنات رقص کرنے لگی اچانک اس کے ذہن کا دریچہ کھلا اور ایک سانولا سلونا مگر بیحد تابناک چہرہ نمودار ہوا ——— اس کی خوبصورت آنکھوں کے گرشے طنز سے سکڑے ہونٹ کھلے اور موتیوں سے ایک قہقہہ اُبل پڑا ——— !

●●

کرنیں

کیپٹن شفیق الرحمان کی اس کتاب کے بارے میں محترمہ جناب امتیاز علی نے لکھا ہے "شفیق الرحمان صاحب کے افسانے ہمارے جدید ادب میں اس لحاظ سے بھی نمایاں نظر آتے ہیں کہ وہ ان مخصوص مسائل سے پاک اور معرّیٰ ہیں جنہیں آج کل ہر "بوالہوس" افسانوں میں پیش کر رہا ہے، ان کی خصوصیت ان کی ظرافت ہے۔ وہ زبان کی لذتوں سے ظرافت پیدا نہیں کرتے۔ ان میں جواں سالی کی شوخی ہے۔ وہ اپنی روانیِ بیان کے ذریعے بلا تکلف ننھی ننھی پھلجھڑیاں چھوڑتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اُن کمیاب لوگوں میں سے ہیں جن کی خوش طبعی اپنے اوپر بلا تکلف ہنس سکتی ہے۔ اور ان تمام خوبیوں سے لکھے گئے سات افسانوں کا مجموعہ پڑھ کر آپ اپنی ہنسی نہیں روک سکتے۔ قیمت صرف تین روپے

ناظمہ کی آپ بیتی

ہندوستان و پاکستان کے ادیب شہیر جناب ایم اسلم کا خطوط کے رنگ میں ایک اچھوتا ناول جس میں دوشیزگی، ازدواجی زندگی، ایکٹریس اور بشیر و ناظمہ کے حالات کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔

قیمت تین روپے

——— بانو بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ———

تلخابۂ شیریں

نغمۂ زار اور سوز ساز کے بعد

حفیظ جالندھری کا یہ تیسرا مجموعہ، ایک نرالی دھن، تازہ منصوبہ، نئی منزل "غزل" کی شاعری مر چکی ہے "ایک شور مچایا جا رہا ہے۔ شور مچانے والے کون ہیں؟ جو ابھی ابھی پیدا ہوئے ہیں جن کی آنکھیں بھی نہیں کھلی ہیں۔ آنکھیں کھلیں گی تو دیکھیں گے کہ ان کو جنم دینے والی شاعری ——— "غزل" زندہ بھی ہے اور پائندہ بھی۔ حفیظ کے کلام کا بہترین مجموعہ۔

قیمت چار روپے پچاس نئے پیسے

سوز میر

میر تقی میر کے کلام کا خوشنما انتخاب ——— فن شاعری کا دل فریب مجموعہ ——— اردو ادب کا قابل قدر شاہکار ——— ظاہری اور معنوی خوبیوں سے آراستہ مجلد مع گرد پوش ——— صفحات چار سو ——— کاغذ سفید چکنا۔

قیمت سات روپے پچاس نئے پیسے

باقیات اقبال

ہست قرآں در زبانِ پہلوی

اگر درست ہے تو مولانا روم علیہ الرحمۃ کے بعد علامہ اقبال کا کلام بھی کچھ کم نہیں۔ یہ مجموعہ وہ نادر مجموعہ ہے جس میں علامہ مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام انتہائی کوشش کے بعد یک جا جمع کیا گیا ہے۔

یہ کتاب حزر جاں ہے، اقبال کے شیدائیوں کے لئے مشعل راہ ہے۔ دین و دنیا کی معراج کے لئے اس کا پڑھنا ادبی حیثیت سے بہت ہی دل چسپ مشغلہ ہے۔ اس کا پڑھنا مذہبی حیثیت سے ایمان کی تازگی کی ضمانت ہے۔ تقطیع کتابی۔

قیمت تین روپے پچاس نئے پیسے

بانو بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی

غازیان اسلام

ایک مکمل اسلامی تاریخ

اس کتاب میں حضور نبی اکرم اور صحابہ کرام کی حق و صداقت کے لیے جو قربانیاں ہوئیں ان کا تحقیقی تذکرہ درج ہے۔ فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

۱ حالات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
۲ حالات حضرت صدیق اکبر رضؓ
۳ حالات حضرت فاروق اعظم رضؓ
۴ حالات حضرت عثمان غنی رضؓ
۵ حالات حضرت علی مرتضیٰ رضؓ
۶ حالات حضرت خالد بن ولید رضؓ
۷ حالات حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ
۸ حالات حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ
۹ حالات حضرت معاذ بن جبل رضؓ
۱۰ حالات حضرت ہاشم بن عتبہ رضؓ
۱۱ حالات حضرت سعید بن عامر رضؓ
۱۲ حالات حضرت سلمان بن ربیعہ رضؓ
۱۳ حالات حضرت حارث بن حسان رضؓ
۱۴ حالات حضرت سہیل بن عدی رضؓ
۱۵ حالات حضرت زیاد بن مالک رضؓ
۱۶ حالات حضرت عبداللہ بن معتصم رضؓ
۱۷ حالات حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضؓ
۱۸ حالات حضرت عمرو بن عاص رضؓ

قیمت تین روپے پچاس نئے پیسے

مکتبہ دینیات آصف علی روڈ نئی دہلی

بچّوں کے ساتھ بڑوں کا غیر ضروری تعاون

ساوتری دیوی ورما

بچوں کی نشوونما اور تربیت کی بین الاقوامی ماہر میریا مونٹیسوری کے الفاظ میں بچوں کا مطالبہ ہے:

"مجھے مدد دو تاکہ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکوں۔ غیر ضروری مدد اصل مدد نہیں ہے بلکہ میری نشوونما میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔"

والدین کا کہنا ہے، ہم بچوں کا کام خود کرتے ہیں۔ اُسے گڑیا کی طرح سجا سنوار کر رکھتے ہیں۔ اُس کو نہلانا، دھلانا، کپڑے پہنانا، کھلانا پلانا وغیرہ سبھی کاموں کو ہم سرانجام دیتے ہیں۔ اُس کی ہر ایک خواہش کو پروان چڑھانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ مگر پھر بھی وہ خوش نہیں رہتا۔

والدین یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کاموں کو اس طرح سرانجام دے کر انجانے میں ہی وہ بچوں کی نشوونما میں کتنی بڑی رکاوٹ پیدا کر رہے ہیں۔ بچوں کو ماں باپ کی صرف اتنی ہی مدد چاہیئے جس سے وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔ اُس کو صحیح ڈھنگ سے اپنی طاقتوں کو مضبوط کرنے کا جذبہ مل سکے۔ ان کی مثالوں سے انہیں بھی آگے بڑھنے کا حوصلہ مل سکے۔ اپنی غلطیوں سے سبق سیکھتا ہوا وہ دن بدن ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا جائے۔ شروع شروع میں وہ غلطیاں کرتا ہے۔ آگے بڑھنے کے لئے گرتا ہے، ٹھوکر کھا کر پھر سنبھل کر چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ زبان پر قابو پانے کے لئے اگر بچوں کے ان ابتدائی افعال کو بے مقصد اور بے معنی سمجھ کر روک دیا جائے تو اس کی ترقی رک جائے گی۔ اس کو چیزوں سے واقفیت حاصل کرنی ہے، دنیا میں جینے کے لئے محنت کش بننا ہے۔

اگر آپ بچے کے اس مطالبے کو غیر ضروری تعاون دے کر پروان نہ چڑھنے دیں گی تو وہ سماجی رکن نہیں رہے گا، آپ کے خلاف باغی بن جائے گا، آپ کی حکم عدولی کرے گا اور یا وہ دبّو اور نکمّا بن جائے گا۔ اُس کی ترقی رُک جائے گی اور وہ ہمیشہ کے لئے سب کا محتاج بن کر رہنے کی کوشش کرے گا۔

قدرت نے ہر ایک انسان میں رہنے اور جد و جہد کرنے کی طاقت عطا کی ہے۔ مثلاً، آپ ایک تتلی بننے والے کیڑے کو لیں۔ تتلی ماں اپنے انڈوں کو پتّوں میں دیتی ہے۔ اس جگہ انڈے چاہے دشمنوں سے محفوظ رہتے ہیں، لیکن جب اس میں سے کیڑے نکل آتے ہیں، انہیں خود کو زندہ رکھنے کے لئے ہری ہری نازک کونپلیں کھانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ عجیب و غریب طریقے سے رینگتے ہوئے ان کونپلوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ حرکت انسان کی زندگی کے لئے بہت ضروری ہے۔ بچے میں کچھ کرنے کا جذبہ ہونا بہت ضروری ہے۔ جھولے میں لیٹے ہوئے ہاتھ پاؤں ہلانا یا تھوک کے بلبلے اُڑاتے ہوئے عجیب و غریب قسم کی آوازیں نکالنا بھی اس کے ابتدائی کام کا ایک حصّہ ہے، جو آگے چل کر بولنے اور آگے بڑھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ اسی طرح جب وہ چیزوں کو اُلٹا پلٹتا ہے یا ایک ہی فعل کو بار بار دُہراتا ہے، سیڑھیاں چڑھتا اترتا ہے، تو وہ ایسا کرتا ہوا اپنی واقفیت بڑھا رہا ہے، خود کو مضبوط بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔

بڑے یہ چاہتے ہیں کہ بچوں کو ہمارے کہنے کے مطابق ہر کام کرنا چاہیئے اگر کوئی بچہ اپنی پختگی کی خاطر بڑے لوگوں کی لادی گئی پابندیوں کو توڑتا ہے تو اُسے

شیطان، گستاخ، ضدی اور ایک مصیبت سمجھا جاتا ہے۔ بڑے یہ بات بھول جاتے ہیں کہ بچوں کو بھی حسبِ منشا چیزوں کو چھونے، ان سے واقفیت حاصل کرنے، اپنے کام میں مہارت حاصل کرنے اور زندگی کی جدوجہد کے لئے مناسب آزادی ملنی چاہئے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بلی کا بچہ ایک سوکھی پتی کو ہی شکار سمجھ کر اس پر جھپٹتا ہے، اُسے دبوچتا اور مروڑتا ہوا شکار کے داؤ پیچ سیکھتا ہے۔ دھیرے دھیرے مشق کرتے رہنے کے بعد وہ خود کو زندہ رکھنے کے لئے شکار میں ماہر ہو جاتا ہے۔ اگر اسے بچپن میں اس مشق سے روکا جاتا تو وہ کبھی شکار کرنا نہیں سیکھ پاتا اور زندہ رہنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا۔ جس طرح شکاری جانوروں کے بچوں کے لئے شکار کے داؤ پیچ سیکھنا ضروری ہے، اسی طرح انسان کے بچے کے لئے دنیا میں زندہ رہنے کے لئے کام کرنا بھی ضروری ہے ——

ہر ایک بچہ جب چیزوں سے واقفیت حاصل کرتا ہے یا خود کام کرنے کے لئے مشتاق ہوتا ہے، تو اُس کے کام میں مداخلت کرنا "یہ مت کرو" "اُس چیز کو مت ہاتھ لگاؤ" "وہاں مت جاؤ" ایک بہت بڑی غلطی ہے۔

بچہ جب چلنا اور بولنا سیکھ جاتا ہے تو اس کی زندگی میں بڑا نازک مرحلہ آجاتا ہے۔ وہ گھر کے بڑے لوگوں کی لادی گئی پابندیوں کو توڑ کر آزاد ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ گھر کے لوگ اس کی اس کوشش کو شیطانی سمجھتے ہیں۔ "ارے تو کہنا نہیں سنتا؟" "بڑا شیطان ہو گیا ہے۔" "گھڑی بھر کے لئے تم سے چپ نہیں بیٹھا جاتا؟" "ہماری چیزوں کو چھونے سے تیرا کیا مطلب؟" "دیکھو اپنا کھلونا چھوڑ کر میرا فاؤنٹین پین پکڑنا چاہتا ہے۔ ارے بابا! ابھی تو کھلونے سے کھیلو جب پڑھنے کے دن آئیں گے تو قلم پکڑنا اچھا لگے گا۔"

اس طرح کے فقرے کہہ کر بڑے بچوں پر بندشیں لگاتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ یہ ابتدائی حرکتیں زندہ رکھنے کے لئے اُسی قسم کی مشق ہے، جس طرح بلی کے بچے کی شکار کی مشق۔ یا جیسے کوئی مکہ باز اپنے حریف کے مقابلے میں آنے سے پہلے مشق کرتا ہے۔ اس تیاری کے بغیر بلی کا بچہ یا مکہ باز اپنے مقابلے میں کبھی بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ زندگی بھی ایک اکھاڑہ ہے۔ اس میں اُس کو کامیابی مل سکتی ہے جس نے اکھاڑنے میں کودنے سے پہلے اپنی طاقت کا اندازہ مشق سے اچھی طرح لگا لیا ہے۔

عام ماؤں کی شکایت ہے کہ بچہ نہلاتے، کپڑے تبدیل کرتے، بال بناتے اور کھلاتے وقت بہت روتا چلاتا ہے۔ بھلا کیوں؟ اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں ایک تو جو آدمی اُسے کھلاتا نہلاتا کپڑے پہناتا یا بال سنوارتا ہے اس کے کام کرنے کے ڈھنگ میں نقص ہو سکتا ہے۔ جسے بچہ پسند نہیں کرتا۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ بچہ خود ان کاموں کو کرنا چاہتا ہے۔ اُسے اپنے جسم پر خود پانی انڈیلنے میں مزا آتا ہے، تولیہ سے خود بدن پونچھنا اُسے اچھا لگتا ہے۔ اپنے بالوں کو سنوارنے کا اسے شوق چراتا ہے۔ اپنے ہاتھ سے کھانا کھا کر اسے سکون ملتا ہے۔ وہ کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتا۔ مگر گھر کے بڑے لوگوں کو اس کے کام کے طریقے پر یقین نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ سوچتے ہیں کہ بچہ ان کاموں کو ٹھیک طرح سے سرانجام نہیں دے سکے گا۔ وہ ہر کام کو بگاڑے گا اور دیر لگائے گا۔ اس لئے اُس کا کام خود کرنے میں وہ مطمئن ہوتے ہیں۔

یہ بڑوں کی سراسر زیادتی ہے۔ اور یہ سب وہ بچے کی پکار کو نظر انداز کر کے کرتے ہیں۔ اُس کی پکار ہے، مجھے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لئے تعاون دیں، جب بچہ ماں کے غیر ضروری تعاون کے خلاف بغاوت کر اٹھے تو اُسے مطمئن کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اسے اپنا کام خود کرنے دیں۔ اسے خود نہانے دیں۔ اس کے لئے اُسے چھوٹا سا برتن دیں، کیوں کہ وہ آپ کا بڑا لوٹا اٹھا نہیں سکے گا۔ اسے کپڑے پہننا اور کنگھی کرنا سکھائیے۔ چھوٹی سی تھالی کٹوری اور گلاس میں کھانا پروس کر اس کے سامنے رکھئے تاکہ وہ کھانا خود کھا سکے۔ "ارے بھلا تو کیا نہائے گا؟" "تو بھلا بال کہاں سنوار سکتا ہے؟" "تو تو کھانا بکھیر رہا ہے۔" جیسی باتیں کہہ کر اس کی کوششوں کا مذاق مت اڑائیے۔ اس سے اس میں خود اعتباری ختم ہو جائے گی۔ آپ کی نگرانی، تھوڑا سا تعاون اور جذبہ اُسے جلد ہی کام میں ماہر بنا دے گا۔ بھلا سوچئے اگر آپ کے عمل اور تعاون سے بچہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے تو آپ کا کتنا وقت بچ گیا؟ آپ کتنی بے فکر ہو گئیں۔

ہر مرض کا صرف ایک علاج

عمدہ، صاف، ستھری اور پورے اجزا سے بنی ہوئی دوائیں

تجربہ کار طبیب آپ کے مرض کی صحیح تشخیص کر سکتا ہے۔ مرض دور کرنے کے لئے بہترین قسم کی دوائیں تجویز کر سکتا ہے لیکن صرف تشخیص اور نسخہ ہی تو علاج میں مدد نہیں دے سکتا۔ عمدہ دوائیں استعمال نہ کی جائیں تو مرض گھٹنے کی بجائے بڑھ سکتا ہے۔ اس لئے اگر آپ کو تندرستی عزیز ہے تو ہماری خدمات سے فائدہ اٹھائیے —— ہر قسم کی عمدہ صاف ستھری مفرد ادویات، پورے اجزا سے بنے ہوئے مرکبات۔

ملنے کا پتہ: **بڑا دواخانہ، لال کنواں - دہلی**

چھوٹے لوگ

عابد سہیل

مسٹر چٹرجی نے جو ابھی دو گھنٹے پہلے اپنے بنگلہ کے باہر فٹ پاتھ پر چھوٹی موٹی پان بیڑی سگریٹ کی دکان لگانے والی بڑھیا کو ڈانٹ پھٹکار رہے تھے، کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور اسے کسی کام میں مشغول پاکر جلدی سے دوسری طرف مڑ گئے۔ تھوڑی دور جاکے انہوں نے پھر اسی بڑھیا کی طرف مڑ کر دیکھا اور یہ اندازہ کرکے کہ اس نے انہیں دیکھا نہیں جیسے ان کے سینہ سے ایک بوجھ اتر گیا۔

بارہ تیرہ سال ادھر یونیورسٹی اور آئی۔ ٹی۔ کالج کی سڑک پر مسٹر چٹرجی کے بنگلہ کے سامنے اس بڑھیا نے اپنے شوہر کے گزر جانے کے بعد ایک چھوٹی سی دکان لگائی تھی۔ ان تیرہ برسوں میں نہ جانے کتنے طلبا یونیورسٹی میں آئے اور چلے گئے۔ کسی سے ایک پیسہ زیادہ لینا تو دور کی بات، نہ جانے کتنے ایسے ہوں جن پر اس کا کچھ نہ کچھ آتا ضرور ہوگا۔ سب اسے ماں ہی کہتے "ماں ایک سگریٹ" "ماں ایک پان بنا دو" "دیکھو ماں پریڈ ہو رہا ہے۔ جلدی سے میری سگریٹ نکال" ——— اور وہ اپنے دبلے پتلے ہاتھوں سے جلدی جلدی پان بیڑی سگریٹ لڑکوں کو دیدیتی۔ بھیڑ زیادہ ہوتی اور لڑکے جلدی کرتے تو وہ کہتی۔ "کوئی ہاتھ پکڑے ہے، لے کیوں نہیں لیتے" اور وہ لڑکے جنہیں زیادہ جلدی ہوتی خود اپنے ہاتھوں سے جو کچھ چاہتے لے لیتے۔ قرض ادھار کی بھی اس دکان پر عجیب نوعیت تھی، پان سگریٹ لے لئے، جی چاہا تو کہہ دیا "ماں پیسے نہیں ہیں" اور ماں نے سر جھکاتے جھکاتے جواب دیا "مانگے کس نے تھے" اور نہ جی چاہا تو بغیر کہے ہی چل دئے اور بعد میں دے دیئے۔

وہ بالکل اکیلی تھی۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا۔ اولاد کوئی ہوئی نہیں۔ رشتے ناتے داروں میں کوئی تھا ہی نہیں نہ جانے کب کے مرکھپ گئے تھے۔ دکان پر جو کچھ بکری ہوتی اس میں سے چار چھ آنے اپنے خرچ کے لئے نکال لیتی باقی کا پان کتھا۔ چھالیہ اور سگریٹ لے آتی۔ بیوگی مفلسی اور بے سہارے ہونے کے عام غموں کے علاوہ اور کوئی خاص غم نہ تھا۔ لیکن اس وقت اسے اپنی لاچاری اور بے چارگی کا احساس جس طرح ہو رہا تھا ویسا پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اسے ایسا لگا۔ جیسے سچ مچ بیوہ وہ آج ہی ہوئی ہے، جیسے اس کی عزت ——— ویسے ایک بار اس نے یہ ضرور سوچا تھا کہ مجھ ایسی رانڈ بیوہ کی عزت ہی کیا ——— پہلی بار اس تراہے پر لٹ گئی ہو اور شائد وہ اپنے خیالوں میں گم تھی کہ مسٹر چٹرجی نکل گئے اور وہ انہیں دیکھ بھی نہ سکی ورنہ اس نے سوچا تھا کہ وہ ان کے پیروں پر گر پڑے گی اور کہے گی۔ بھیا فٹ پاتھ سے کیا چاہے لکھنؤ سے نکال دو پر پولو کو ایک بار میرے پاس بھیج دو۔ میں اسے سینے سے چمٹا کے ایک بار چوم تو لوں۔ لیکن اب یہ موقع نکل چکا تھا۔

اسے پولو سے بے حد محبت تھی۔ جب بھی بازار جاتی دو ایک پیسہ کی انگریزی مٹھائی اس کے لئے ضرور لے آتی اور پچھلے سال تو جب اسے ایک دن معلوم ہوا تھا کہ کل پولو کی سالگرہ ہے تو وہ اپنا پیٹ کاٹ کے اس کے لئے آٹھ آنے کا ایک کھلونا بھی لے آئی تھی سالگرہ کے اُن دوستوں اور رشتے داروں کی طرف سے پولو کو دئے گئے تحفوں میں اس کی آٹھ آنے کی معمولی گڑیا کی کیا قیمت تھی پھر بھی اُس کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا اور جب پولو بن سنور کر کمرے سے نکلا تھا تو اس نے مہمانوں کی موجودگی کا خیال کئے بغیر اس کو چمٹا کے چوم لیا تھا اور اس کے بائیں گال میں یہ کہہ کر "بھگوان میری نظر سے بچائے"

ذرا سا کاجل بھی لگا دیا تھا۔

لیکن یہ میں تو آج دوپہر والے واقعہ سے پہلے کی باتیں تھیں۔

آج بھی پولو روزانہ کی طرح جب کھیلتا کھیلتا اس کے پاس آیا تو اُس نے اپنی میلی کچیلی دھوتی کے ایک کونے سے انگریزی مٹھائی کھول کے اس کے ہاتھ میں رکھ دی تھوڑی دیر تک پولو اس کے پاس ہی کھیلتا رہا اس کے بعد واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد مسٹر چٹرجی کے بڑے لڑکے نے اس سے پوچھا کہ کیا پولو اٹھنی یہاں چھوڑ گیا ہے۔ اور اس نے گردن جھکائے جھکائے ہی جواب دے دیا "نہیں بیٹا یہاں تو کچھ نہیں چھوڑ گیا" یہ کہہ کر اُس نے آس پاس جہاں پولو کھڑا رہا تھا ایک نظر ڈالی لیکن وہاں اٹھنی تو دُور کی بات ایک دمڑی بھی نہ تھی۔ اُس نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ پر تھوڑی دیر بعد مسٹر چٹرجی خود اُس کے پاس آئے اور وہی سوال دہرایا "نہیں بھیا، لو بھی پوچھ رہے تھے، یہاں تو پولو جب آیا تو اس کے ہاتھوں میں کچھ نہیں تھا" اس نے جواب دیا اور ایک بار پھر چاروں طرف نظر دوڑائی۔

"پولو تو کہتا ہے ماں کو دیا ہے" مسٹر چٹرجی نے بے مروتی سے کہا۔

"نہیں بھیا مجھے تو اس نے اٹھنی نہیں دی۔ گھر ہی میں دیکھو وہیں کہیں ہوگی"

"وہاں تو کہیں نہیں ہے"

"تو میں نے پولو سے چھین لی؟" ماں نے یہ بات ذرا غصہ اور اعتماد سے کہہ کر اپنے حساب بات ختم کر دی لیکن مسٹر چٹرجی اس وقت ٹال جانے کے موڈ میں نہ تھے۔ دس بارہ سال سے جان پہچان اور ساری مروت کا اس وقت انہوں نے کچھ خیال نہ کیا اور روکھا سا منہ بنا کر بولے "نہیں تم نے نہیں، میں نے لے لی، یہی کہنا چاہتی ہو ایک اٹھنی کے لئے جھوٹ بولتے تمہیں برا نہیں معلوم ہوتا"

یہ سن کر ماں کے تن بدن میں جیسے آگ ہی تو لگ گئی "بلاؤ پولو کو" اس نے غصہ سے کہا۔

پانچ سالہ پولو بلایا گیا۔ اس نے بھی بڑھیا کی طرف اشارہ کر کے اپنی تتلی زبان میں کہا "ماں کو دیا ہے" اب تو مسٹر چٹرجی کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس وقت انہیں اگر اس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کا خیال نہ ہوتا تو وہ شاید اس کی چھوٹی موٹی خوانچہ نما دکان اٹھا کر پھینک دیتے اور دو تین لاتیں جما کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بنگلہ کے سامنے کے فٹ پاتھ سے ہٹا دیتے۔ اس نے اپنی لکڑی کی چھوٹی موٹی گولک اُٹھا دی، خوانچہ کے متعدد ڈبے زمین پر پھینک دئے اور روتی ہوئی بولی "بھیا خوب تلاشی لے لو، ایک ایک چیز دیکھ ڈالو پولو کی اٹھنی میں نے لی ہو تو میرے انگ انگ میں کیڑے پڑیں" پر مسٹر چٹرجی مطمئن نہ ہوئے کمینی عورت، انہوں نے دل ہی دل میں سوچا، وقت بے وقت جب بھی ضرورت پڑی مدد کی، کبھی کبھار کچھ کھانے پینے کو بھی بھیج دیتے اور اس سب کا اس نے یہ بدلا دیا تھا۔

آخر کوئی انتہا ہوتی ہے کمینگی کی۔

مسٹر چٹرجی کا اچھا خاصا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ آج موسم کتنا خوشگوار تھا۔ انہوں نے بیوی بچوں سمیت مینی شو دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ جاڑوں میں بچوں کو لے کر رات کا شو دیکھنا ممکن نہیں اسی لئے وہ یونیورسٹی سے ذرا جلدی ہی لوٹ آئے تھے لیکن افسوس اس کمینی بڑھیا نے اُن کا سارا پروگرام چوپٹ کر دیا تھا۔

اندر جا کر وہ اپنی بیوی پر بگڑنے لگے۔ ایسا لگتا تھا جیسے بڑھیا کو ڈانٹ پھٹکار کر ابھی اپنی پوری طرح تشفی نہیں ہوئی تھی۔ بولے "میں نے کتنی بار کہا کہ ایسے ایسے لوگوں کو گھر میں گھسنے نہ دیا کرو، جس کو موہنہ لگا دو وہی سر پر چڑھ آتا ہے۔ نیچ لوگ چاہے خود کو کتنا ہی شریف ظاہر کرنے کی کوشش کریں نیچ ہی رہتے ہیں" انہوں نے غصے میں کہا۔

مسز چٹرجی نے جواب تک بڑھیا کو برا بھلا کہنے میں اپنے شوہر سے ایک ہاتھ پیچھے نہ تھیں جب خود کو بھی لپیٹ میں آتے دیکھا تو بولیں "کب منع کیا تھا آپ نے کہ اندر آنے نہ دیا کروں، مجھے تو خود اس عورت سے نفرت تھی۔ اتنی بوڑھی ہو گئی پھر بھی ایسے دبے پاؤں چلتی ہے کہ کسی کو کانوں کان آہٹ تک نہیں ہوتی۔ اس دن پولو جب بیمار تھا اس کے سرہانے ایسی خاموش آ کر کھڑی ہو گئی کہ نہ میں نے دیکھا نہ آپ نے۔ چھی، چھی ایسی سانپ کی چال چلنے والوں کو ہرگز گھر میں نہ آنے دینا چاہیے۔ میری تو عقل ماری گئی تھی ورنہ پہلے ہی روک دیتی تو اچھا رہتا"

پہلے تو مسٹر چٹرجی کو بیوی کا جواب سن کر غصہ آیا تھا اور ان کے ماتھے کے اوپر کے بال غصہ میں کھڑے ہونے لگے تھے لیکن بعد میں جب بیوی کو اپنی ہاں میں ہاں ملاتے دیکھا تو سارا غصہ کافور ہو گیا بولے "خیر جو ہونا تھا سو ہو گیا، میں تو کہتا ہوں کہ ان آٹھ دس برسوں میں گھر سے جتنی پیالیاں تشتریاں گلاس غائب ہوئے ہیں سب اسی چڑیل کی حرکت تھی ورنہ بھلا اور کون لے جائے گا۔ ابھی اُسی دن میری میز پر سے ایک روپیہ غائب ہو گیا۔ مجھے تو اسی وقت شک ہوا تھا لیکن پھر سوچا سر سفید اب ایک روپیہ کی چوری کیا کرے گی"

"وہ روپیہ تو" مسز چٹرجی کی زبان سچائی نے کھول دی تھی لیکن پھر مصلحت نے ایک لفظ بھی موہنہ سے نہ نکلنے دیا۔ اس دن بھاجی ترکاری منگانے کے لئے ان کے پاس ٹوٹا ہوا روپیہ نہ تھا۔ دس روپیہ کا نوٹ نئے نوکر کو دینا انہوں نے قرین مصلحت نہ سمجھا تھا اس لئے وہ روپیہ اسے دے دیا تھا۔ وہ خود شوہر سے کہنا بھول گئی تھی اور انہوں نے پوچھا بھی نہ تھا ورنہ انہیں یاد آ جاتا۔ اب اس وقت جذبات کا رخ بڑھیا کے خلاف تھا سو انہوں نے اس کے تابوت میں اپنی طرف سے بھی ایک کیل ٹھونک دینے میں کوئی ایسی بری بات نہ سمجھی۔

ویسے وہ چور تو تھی ہی۔ اگر روپیہ اُس نے نہیں بھی لیا تو نہ جانے کتنی اکنیاں دونیاں اور چونیاں ضرور چرائی ہوں گی اس لئے بولیں "مجھے تو اسے دیکھ ہی کے گھن آتی ہے بھیڑے

جھیڑے بال، میلے کپڑے ـــــ اور آنکھیں کیسے مٹکاتی ہے"

وہ تو یہ سلسلہ نہ جانے کب تک جاری رہتا کہیں اتفاق سے مسٹر چڑھی کے ایک دوست کی بیوی آگئیں اور سب لوگ ان سے بات چیت میں لگ گئے۔ ان کے دو بچوں سے گھر کے بچے کھیلنے لگے اور مسز چڑھی اور ان کی بیوی مہمان سے گپ بازی کرنے لگے۔ ذہن پر ایک بوجھ سا جو چھا گیا تھا اس کی پرتیں ایک ایک کر کے اترنے لگیں اور دس پندرہ منٹ بعد شعوری طور پر تو انہیں شاید یہ واقعہ یاد بھی نہ رہ گیا۔ ویسے ذہن پر ایک ہلکا سا بوجھ ضرور تھا۔ پکچر جانے کا پروگرام تو ختم ہی ہو گیا تھا لیکن خیر مہمان نے آکر اچھا خاصا دلچسپی کا سامان کر دیا تھا۔

شام ہوئی تو نوکر چائے بنا کر لے آیا۔ آج مہمان کے خیال سے کچھ خاصا اہتمام تھا ایک دو نمکین اور میٹھی چیزیں بھی تھیں۔ پولو تو مٹھائی کا عاشق ہی تھا میز سے مٹھائی اٹھانے کے لئے فوراً جوتے پہنے پہنے صوفہ پر چڑھ گیا اور نئے صوفہ کے ایک کونہ پر مٹی لگ گئی۔ مسز چڑھی نے جلدی سے پولو کو اتار دیا۔ پولو نے رونے کے لئے مونہہ بنایا ہی تھا کہ انہوں نے ایک رس گلہ اس کے مونہہ میں رکھ دیا اور اس کا روانسا چہرہ مسکرانے لگا۔

"جوتے پہن کے صوفے پر نہیں چڑھتے گندا ہو جاتا ہے" انہوں نے پولو کے جوتے کے فیتے کھولتے ہوئے کہا۔ پہلے بائیں پیر کے جوتے کا فیتہ کھولا پھر دائیں پیر کا۔ وہ نیچے دیکھے بغیر اپنے مہمان سے بات چیت میں بھی مشغول تھے اور جوتا بھی اتارتے جا رہے تھے۔ پولو اس انتظار میں کہ کب جلدی سے یہ جوتا اتر چکتا ہے نیچے ہی دیکھے جا رہا تھا۔ جوں ہی دونوں جوتے اتر گئے اس نے شرارت سے اپنی لات ماردی اور بچپن سے آواز کے ساتھ ایک سفید سفید گول سکہ پکے فرش پر گر پڑا۔ یہ وہی اٹھنی تھی جو صبح پولو نے پرس میں سے نکال لی تھی۔

میاں بیوی نے ایک دوسرے کو خاموش نگاہوں سے دیکھا لیکن دونوں ایک دوسرے کی نظروں کی تاب زیادہ دیر تک نہ لا سکے اور اپنے مہمان سے بات چیت میں مشغول ہو گئے، کہیں اب ان باتوں میں نہ تو کوئی دلچسپی تھی نہ کوئی تسلسل ایسا لگتا تھا جیسے بس فرض ادا کیا جا رہا ہو۔ چائے پینے کے بعد ہی مسٹر چڑھی یونیورسٹی میں ایک جلسہ کا بہانہ بنا کر باہر چلے گئے۔ باہر جاتے ہوئے انہوں نے کنکھیوں سے اس بڑھیا کو دیکھا اور اسے دوسری طرف مشغول پا کر جلدی سے آگے بڑھ گئے۔

رات کو میاں بیوی نے مشورہ کرنے کے بعد اگلے دن بڑھیا کو کہلا بھیجا کہ خیر اب تو معاف کر دیا آئندہ سے ایسی غلطی نہ کرنا۔

یہ پیغام سن کر اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک اور لکیر دوڑ گئی اور وہ اسی شام اپنی چھوٹی موٹی دکان اٹھا کر چلی گئی۔

●●

طب یونانی کے چند بے نظیر تحفے

شربت اطفال بچوں کے لئے ایک عمدہ ٹانک ہے

جو بچوں کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتا ہے کیلشیم کی کمی کو پورا کر کے بچوں کی ہڈیوں کو مضبوط بناتا ہے۔ جن بچوں کو دودھ مفہم نہیں ہوتا اور دست آتے رہتے ہیں ان کے لئے شربت اطفال ایک حیات بخش دوا ہے، اس کے استعمال سے بچے کے دانت بہت ہی آسانی سے نکل آتے ہیں نہ اس کو دستوں کی شکایت ہوتی ہے نہ دودھ ڈالتا ہے۔ معصوم بچوں کو تندرست و توانا رکھنے کے لئے ہر گھر میں اس دوا کی موجودگی ضروری ہے۔ فی شیشی ایک روپیہ

زلفی

آج کل بال جھڑنا اور وقت سے پہلے سفید ہو جانا ایک عام بیماری ہوتی جا رہی ہے، ہم بہت فخر کے ساتھ ایک بہت ہی پرانے اور آزمائے نسخے کو جو آج تک صرف سینہ بہ سینہ چل رہا تھا آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، یہ تیل مقوی دماغ ادویہ سے بنایا گیا ہے اور مصنوعی خوشبویات، نقلی رنگوں یا بالوں کو نقصان پہنچانے والی ملاوٹوں سے پاک ہے۔ ہر موسم میں استعمال کیا جا سکتا ہے، جن لوگوں کے گھنے بال ہوں ان کے لئے بھی مفید ہے۔ ایک شیشی کی قیمت پانچ روپے ہے۔

دوائیں خالص، پوری مقدار میں، حکماء کی نگرانی میں ڈالی جاتی ہیں

کھانسولین حلق اور سینے کی بیماریوں کی بہترین دوا ہے،

جو ہر طرح کی کھانسی کے لئے مفید ہے، کھانسی ملغمی ہو یا خشک فوراً فائدہ پہنچاتی ہے، سینہ اور پھیپھڑے کی نالیوں کو بلغم سے پاک و صاف کرتی ہے، گلے کی خراش، نزلہ اور زکام میں اکسیر ثابت ہوئی ہے ـــــ قیمت ایک شیشی: ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے

بنانے والے:

بڑا دواخانہ (لال کنواں) دہلی

بڑا دَواخانہ دہلی اور اس کے بعض ممتاز حالات

ڈاکٹروں کو کتنا آرام اور کتنی سہولت ہے کہ ولایتی دَوائیں انھیں بنی بنائی گھر بیٹھے مل جاتی ہیں جو ہمیشہ یکساں، اصلی اور خالص ہوتی ہیں۔ مگر یونانی اور ویدک طب کی دَواؤں کا جو حشر ہو رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ زعفران کی جگہ رنگ اور شہد کی جگہ گڑ کا شیرہ عام طور پر دواؤں میں استعمال کیا جا رہا ہے اور بعض ضروری اَجزاء مثلاً مشک۔ موتی وغیرہ بہت گراں ہونے کی وجہ سے نسخوں میں بالکل نہیں ڈالے جاتے۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی یہ ضرورت ہے کہ تمام ہندوستان میں کوئی ایک تو ایسا دَواخانہ ہو جو یُونانی اور ویدک دَوائیں پوری احتیاط اور نہایت ایمانداری سے پورے اور اعلیٰ درجہ کے اجزا سے بنا کر مریضوں کے لئے پیش کرے جس طرح یورپ کی دوائیں ڈاکٹروں کے لئے مستند ہوتی ہیں اسی طرح معتبر و مستند یونانی اور ویدک دَوائیں ہر شخص کو اس دَواخانہ سے حاصل ہو سکیں۔

یہ ہی وہ ضرورت ہے جسے بڑا دَواخانہ دہلی نے پورا کیا ہے اس کی دَواؤں کا عمدہ اور خالص ہونا نیز تھوڑے نفع پر بالکل اصلی اور پُورے اَجزاء سے تیار کی ہوئی دوائیں پیش کرنا، وہ بہتر و برتر خوبیاں ہیں کہ ملک کے حکیم، وید اور ڈاکٹر صاحبان اپنے مریضوں کو بڑا دَواخانہ دہلی کی تیار کردہ دَوائیں استعمال کرا رہے ہیں۔

یُونانی اور ویدک دَوائیں سائنس کے لباس میں

اس دواخانہ کا مقصد خاص یہ ہے کہ یونانی اور ویدک طب کی دَواؤں کو رفتہ رفتہ سائنس کے لباس میں آراستہ کر دیا جائے تاکہ وہ ایسے بلند معیار پر پہونچ جائیں کہ یورپ کی بہترین دواؤں کی پہلی صف میں اپنے لئے جگہ پیدا کر لیں۔ یہ سائنس کی ترقی کا زمانہ ہے علمی دنیا ہماری دواؤں کو اُسی وقت قبول کر سکتی ہے جبکہ سائنس ان کی خوبیوں کی تصدیق کر دے تہذیب و ترقی کے لئے علم نے بیسویں صدی میں جو راہیں کھول دی ہیں ان سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ لیکن یہ کام بہت بڑا کام ہے اس کے لئے سائنٹی فک آلات مشنریز اور بہت بڑا سرمایہ نیز تجربہ و مہارتِ فن ضروری چیزیں ہیں جن چیزوں کو یکجا کرنے کا اقدام بڑا دواخانہ دہلی نے کیا ہے اور خدا کو منظور ہے تو یہ کام جسے کاروباری لوگوں نے اپنے بھاری منافع کے خاطر نظر انداز کر رکھا ہے، اس کام کو بڑا دَواخانہ دہلی رفتہ رفتہ ایسی بلندی پر پہنچا دے گا کہ یونانی اور ویدک دَوائیں نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ اور امریکہ کے بازاروں میں بھی مقبول ہوں گی۔

شعبۂ طبّی بورڈ بڑا دَواخانہ دہلی

فنِ علاج ایک باقاعدہ مکمل فن ہے جو برسہا برس سے تحصیلِ فن اور سالہا سال کے تجربوں کے بعد حاصل ہوتا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ ہر مریض صرف فہرست ادویہ پڑھ کر خواہ وہ کتنی ہی ذمہ داری کے ساتھ اور کسی درجہ کی علمی و فنی قابلیت کے ساتھ لکھی گئی ہو اپنے ہر مرض کا علاج کر سکے۔ اس لئے عوام کی پُرخلوص طبّی خدمات کو زیادہ سے زیادہ وُسعت دینے کے لئے بڑا دَواخانہ دہلی کے منتظمین نے "طبّی بورڈ" بنایا ہے جس میں چار تجربہ کار فاضل طبیب شامل ہیں اور اس کے صدر مسیح زماں حکیم محمود سعید خاں صاحب نبیرہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحبؒ ہیں۔ اس "طبّی بورڈ" کے ذریعہ عوام کی ہر طرح اعانت و خدمت اس طرح کی جاتی ہے کہ جو مریض اپنے حالات لکھ کر بھیجدیتے ہیں ان پر "طبّی بورڈ" کے ممبران ہر پہلو سے غور کرتے ہیں۔ اور مرض سے تعلق رکھنے والی پیچیدگیوں اور اہم نکتوں پر "طبّی بورڈ" کے فاضل حکماء یکجائی طور پر مناسب بحث و مباحثہ کے بعد کوئی صحیح رائے قائم کرتے ہیں اور نسخہ تجویز کر کے ڈاک سے مریض کے پاس بھیجدیا جاتا ہے۔ اس طبّی مشورہ کے لئے خواہ اس پر کتنا ہی زیادہ وقت صرف ہوا ہو کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا۔ اس تمام محنت و توجہ کے بعد بھی مریض کے لئے یہ پابندی گوارا نہیں کی جاتی کہ وہ بہرحال بڑا دَواخانہ ہی کی دَوائیں استعمال کرے جو مریض صرف نسخہ چاہتے ہیں انھیں صرف نسخہ لکھ کر روانہ کر دیا جاتا ہے اور جو لوگ چاہتے ہیں کہ "طبّی بورڈ" کے تجویز کردہ نسخہ کی دوائیں بھی بھیجدی جائیں ان کو نسخے اور مشورہ کے ساتھ دَوائیں بذریعہ وی۔ پی پارسل روانہ کر دی جاتی ہیں۔

ایک ضروری گزارش

موجودہ گرانی سے ہمارے کرم فرما اچھی طرح واقف ہیں۔ اکثر مفرد دَواؤں کی قیمتیں پہلے سے دو تین گنا بڑھ گئی ہیں۔ دواخانہ کے منتظمین نے کافی عرصہ تک اس بات کا انتظار کیا کہ شاید مفردات کی قیمتیں سابقہ حالات پر واپس آجائیں لیکن دواؤں کی قیمتوں میں کمی نہیں ہوئی اور نہ آئندہ اُمید ہے۔ موجودہ حالات میں دواخانہ کے لئے یہ ناممکن ہے کہ اس قدر مہنگائی کو برداشت کرتے ہوئے مرکبات سابقہ قیمتوں پر ہی مہیا کرتا رہے۔ چونکہ ہم تمام مرکبات پورے اجزا ڈال کر بناتے ہیں یہاں تک کہ ان کے قیمتی اجزا بھی پوری مقدار ہی میں ڈالتے ہیں اس لئے مجبوراً ایسے تمام مرکبات کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا گیا ہے جن کے اجزاء کی قیمتیں دوگنی اور سہ گنی حد تک بڑھ چکی ہیں۔ ان دواؤں کی قیمتوں میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا جن کے اَجزاء کی مہنگائی کو دواخانہ برداشت کر سکتا ہے۔

★ ★

ادریس

کیا آپکو اپنا نام پسند ہے

کیا آپ کو اپنا نام پسند ہے ——— ؟ اگر اس کا جواب "ہاں" میں ہے تو واقعی آپ بہت خوش نصیب ہیں اور اگر آپ کا جواب "نہیں" ہے تو ہمیں آپ سے ہمدردی ہے۔ عام مشاہدہ ہے کہ لاکھوں کیا بلکہ کروڑوں ہندوستانی اپنے ناموں سے خوش نہیں جو ان کے والدین نے ان کے سر تھوپ دیے ہیں۔ وہ اپنا نام لیتے ہوئے شرماتے ہیں، گھبراتے ہیں اور کچھ تو فرضی نام رکھ لیتے ہیں۔ بہرحال یہ نام اچھے ہیں یا برے، آپ کے نام ہیں اور آپ کے نزدیک کافی اہم ہیں۔

ایک حالیہ نفسیاتی جائزے سے پتہ چلا ہے کہ لوگوں کے نام ان کی زندگی کا ایک خاص جزو بن جاتے ہیں اور اکثر عجیب و غریب بے ہنگم اور غیر مانوس مضحکہ خیز نام کامیابی کی راہ میں روڑے بن گئے ہیں۔ کامیابی ان کے قریب آتے ہی دور بھاگ گئی ہے۔ صرف اس لئے کہ ان کے نام کانوں کو بھلے نہیں لگتے۔

اس حادثے کا شکار لاکھوں انسان ہوتے ہیں، لیکن وہ اپنی ناکامی کو اپنی قسمت، یا اپنے ستاروں کی وجہ بتاتے ہیں۔ مگر وہ لوگ اتنے بھولے ہیں کہ سمجھ نہیں پاتے کہ یہ ان کا نام ہی ہے جو ان کے حق میں کانٹے بو رہا ہے، ان کے لئے سدِ راہ بنا ہوا ہے۔ وہ نوکری کی درخواست دیتے ہیں۔ درخواست واپس آجاتی ہے انٹرویو میں جاتے ہیں۔ ناکام لوٹتے ہیں ——— کیوں ——— صرف اپنے مضحکہ خیز نام کی وجہ سے شاید آپ کو یہ جان کر تعجب ہو کہ کسی فرد کا اپنے نام کی طرف خاص رجحان اس کی شخصیت کا نقیب ہے۔ آیئے ہم نام کے سلسلے میں سائنس کی عجیب و غریب تحقیق کے بارے میں غور کریں کہ ایک نام میں کیا کچھ پوشیدہ ہے ——— ؟

کتنے فی صدی لوگ اپنے نام پسند نہیں کرتے؟

نوجوان لڑکے لڑکیوں کی ایک بہت بڑی تعداد سے سوال کرنے پر پتہ چلا ہے کہ تین تہائی سے زیادہ لوگ اپنے نام سے خوش نہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ کاش ان کے نام کچھ اور ہوتے۔ خاص کر اپنے خاندانی نام (مثلاً اروڑہ، پوری، بھٹیا، گھاس والا) تو ان لوگوں کو سخت ناپسند ہیں۔ اس کی چند خاص وجوہ ہیں۔ اوّل دوسرے لوگوں کو صحیح تلفظ ادا کرنے میں تکلیف، دوئم لکھنے وقت ہجے کی تکلیف، سوئم ذاتی تعصب اور تبغض، چہارم کبھی کبھی یہ نام تمسخر کا باعث ہوتا ہے۔

کس قسم کے نام زیادہ پسند کئے جاتے ہیں؟

تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ جاوید، اسلم، رمیش، سنتوش، سعدیہ، نادرہ، شمع، پروین، نگہت، ثریا، بینا، ریتا قسم کے نام بہت پسند کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ نام خوبصورت ہیں۔ سیدھے سادھے اور پیارے ہیں۔ ان کے تلفظ اور ہجے آسان ہیں۔ انہیں آسانی سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ ان میں ایک مٹھاس ہے جو کانوں کے رستے دماغ میں ٹپکائی جاتی ہے۔

امریکہ کی انسٹی ٹیوٹ آف پبلک اوپی نین نے بہت بڑے پیمانے پر سارے امریکہ میں جو سروے کیا تھا، ان میں "جان" بہت زیادہ پسند کیا گیا۔ اس کے بعد

ولیم اور پھر روبرٹ، ویسے جیمز، ڈیوڈ، چارلس، مائی کل، رچرڈ اور جارج بھی بہت زیادہ پسندیدہ ہے۔ اس کے بعد الزبتھ اور ہیلن، اور ان کے علاوہ سوسن، مارگریٹ رتھ۔ این، باربرا، لنڈا بھی بہت پسند کئے جا رہے ہیں۔

آپ کو دوست کس نام سے پکارتے ہیں؟

گہری تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ وہ لوگ جو اپنے نام کی بجائے بگڑے ہوئے نام جیسے گگو، زمبو، خلو، راجی، رکی، ٹیپو، بلو، ڈبو، رشی، سلو، شمی، نمی، بلی سے پکارے جاتے ہیں، وہ سوسائٹی میں زیادہ مقبول سمجھے جاتے ہیں بنسبت ان لوگوں کے جو کسی بگڑے ہوئے نام سے نہیں پکارے جاتے۔ جن لوگوں کے بگڑے ہوئے نام تو نہیں لیکن ان کے نام لوگ مختصر کر کے استعمال کرتے ہیں، کافی مقبول سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے راج کمار کو راج کہا جائے، نریندر کو نین کے نام سے یاد کیا جائے۔

کیا آپ کے بچے کا نام اس کے لئے خوشیاں لا سکتا ہے؟

جی ہاں تجربے نے ثابت کیا ہے کہ ایک بچے کا نام اس کی شخصیت اور کردار بنانے میں بہت بڑا معاون ثابت ہوا ہے۔ کچھ لوگ ایسے نام رکھنے کے سخت مخالف ہیں جو مضحکہ خیز ہوں، زنانے قسم کے ہوں اور یا جن کا اثر ناگوار ہو۔ کچھ مردانہ نام ایسے بھی ہیں جو خاص طور پر سماجی زندگی میں سخت ناگوار سمجھے جاتے ہیں۔ اس عہد میں جب کہ جوانی کی طرف قدم جا رہے ہوں، اس قسم کے نام سخت مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً معشوق علی، شوقین مرزا۔ لڑکیوں کے مردانہ نام مثلاً اقبال بانو انور، ہمایوں بانو مناسب نہیں رہتے۔ مشہور عشقیہ داستانوں کی ہیروئنوں کے نام (جیسے شیریں، لیلیٰ) رکھنے سے لڑکی سہیلیوں میں مذاق کا موضوع بنتی ہے اور لڑکوں کی نظر میں شہوت پرستی کا شکار سمجھی جاتی ہے۔

کیا نامناسب نام کامیابی کی راہ میں سدِ راہ ہیں

جی ہاں، ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ میں ۳۳۲۰ طالب علموں پر اس کا تجربہ کیا تو پتہ چلا کہ محبت میں، سوسائٹی میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے میں، کالج کے الیکشن وغیرہ میں ان کے نامناسب نام کامیابی کی راہ میں روڑے اٹکا چکے ہیں۔ لیکن اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ اس تجربہ سے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ نامناسب نام ہمیشہ ہی سدِ راہ بنتے ہیں۔ ایسی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں کہ لوگوں نے اپنے مضحکہ خیز ناموں کے باوجود ہر میدان میں پالا مارا ہے۔ مگر ایسی مثالیں بہت کم ہی ملتی ہیں۔ ٹاٹا آئل ملز کمپنی کی ایک خاتون افسر مس باٹلی والا اپنے نام کے باوجود اخبار والوں اور اشتہار دینے والی کمپنیوں کی انجمن اے بی سی کی صدر رہ چکی ہیں۔

نام رکھتے وقت کیا دیکھا جائے؟

بچہ آپ کے رحم و کرم پر ہے۔ اس کے مونہہ میں زبان ہے پر وہ بول نہیں سکتا اس کا مستقبل آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس لئے اس کا نام رکھتے وقت بچے کے رنگ و روپ صحت پر بھی ایک گہری نظر ڈالنی چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ بچہ کالے رنگ کا ہو (خدا نخواستہ) اور اس کا نام آپ مہتاب، سندر، شکیل رکھیں تو یقیناً ساری عمر بے چارا مذاق کا موضوع بنے یا اگر لڑکی بہت موٹی تازی ہے اور اس کا نام "گلبدن" رکھا ہے تو یقیناً آپ نے اس کے حق میں کانٹے بوئے ہیں۔

نام میں کیا رکھا ہے؟

جو لوگ نام کو معمولی سمجھتے ہیں انہیں اس لڑکی کی کہانی سننی چاہئے جو امریکہ کی پرنسٹن یونی ورسٹی میں ایم اے کے لئے تعلیم حاصل کرنے داخل ہوئی ہے اس کا نام کرشنا راؤ ہے اور سو سال میں وہ پہلی لڑکی ہے جس کو اس یونی ورسٹی میں داخلہ ملا ہے۔ پرنسٹن "صرف مردوں کے لئے" یونی ورسٹی ہے، اور پچھلے سو سال سے اس میں کسی لڑکی کو داخلہ نہیں دیا گیا۔ پچھلے سال ہندوستان کی کرشنا راؤ نے وہاں داخلہ کے لئے درخواست بھیجی، اور یونی ورسٹی والوں نے جو ہندوستان کے موجودہ وزیر دفاع اور سابق سفیر برائے امریکہ دی کے کرشنا مینن کے نام سے واقف تھے، "کرشنا" کو ایک مردانہ نام سمجھتے ہوئے اسے داخلہ دے دیا۔

پھر جب وہ ساز و سامان لاد کر ہندوستان سے امریکہ پہنچ ہی گئی، تب یونی ورسٹی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، مگر انہوں نے اپنی غلطی کی وجہ سے اس لڑکی کا نقصان نہ ہونے دیا، اور اسے یونیورسٹی میں پڑھنے کی اجازت دے دی گئی۔

کہئے ہے نا یہ نام ہی کا کمال؟

کیا نام سے شخصیت کا اندازہ ہو سکتا ہے؟

جی ہاں۔ ہارورڈ یونی ورسٹی (امریکہ) میں کئے گئے تجربہ سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کی شخصیت کا اندازہ اس کے نام لکھنے کے انداز سے پتہ چل سکتا ہے آپ اپنا نام پانچ طریقوں سے لکھ سکتی ہیں۔ فرض کیجئے کہ آپ کا نام ثریا بانو نقوی ہے —— (۱) ثریا نقوی (۲) ث۔ب۔ نقوی (۳) ثریا۔ب۔ نقوی (۴) ث۔ بانو نقوی (۵) ثریا بانو نقوی۔

نفسیات کے ماہروں کا کہنا ہے کہ آپ اپنا نام لکھنے کے لئے جو بھی خاص طریقہ اختیار کرتی ہیں وہ یوں ہی نہیں کر لیتیں، بلکہ اس کے پردے سے آپ کی شخصیت اور

کیریکٹر کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً پہلا طریقہ ثریا نقوی استعمال کرنے والے لوگ بے تکلف اور ہر دل عزیز ہوتے ہیں۔

دوسرا طریقہ ث۔ب۔ نقوی اختیار کرنے والے لوگ بہت قدامت پرست، قانع اور اپنے آگے کسی کی بات نہ سننے والے لوگ ہوتے ہیں۔ عموماً ایسے لوگوں کی شخصیت بہت پراسرار ہوتی ہے اور اگر آپ اس کی شخصیت کو سمجھنے کی بھی کوشش کریں تو وہ اسے آپ پر آشکارا نہیں ہونے دے گی، بلکہ اپنے جذبات اور احساسات کو اس طرح چھپا کر رکھے گی جس طرح جیسے اس نے اپنا پورا نام آپ سے چھپا رکھا ہے۔

وہ لوگ جو تیسرا طریقہ ثریا۔ب۔ نقوی اختیار کرتے ہیں، وہ جہاں تک شخصیت کا تعلق ہے بہت صلح کن اور بردبار اور دوسروں کے جذبات کا احساس کرنے والے لوگ ہوتے ہیں۔

جو لوگ چوتھا طریقہ۔ ث۔ بانو نقوی اختیار کرتے ہیں، وہ ایسے لوگ سمجھے جاتے ہیں جو اپنے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور ان میں عموماً بناوٹ دکھاوٹ اور چھچھورے پن کا مادہ ہوتا ہے۔

اگر آپ اپنا نام لکھتے ہوئے آخری طریقہ یعنی ثریا بیگم نقوی اختیار کرتی ہیں تو ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ نمائش و نمود کی خواہاں ہیں۔ آپ میں ہیکڑی ہے اور آپ چاہتی ہیں کہ لوگ آپ کو دیکھیں اور آپ کا لوہا مانیں۔ کیونکہ یہ آپ کا حق ہے۔ آپ ان سے بدرجہا بہتر ہیں!

بہرحال نفسیاتی تجربے سے نام اور شخصیت کے درمیان جو ناطہ ہے۔ وہ کافی حد تک واضح ہوگیا۔ مگر یہ ناطہ اتنا آسان نہیں جیسا کہ مندرجہ بالا مثالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ بلکہ بہت ہی ادق اور دقیق ہے۔

آپ کا نام کتنا اہم ہے؟

آج تک کوئی ایسا آلہ ایجاد نہیں ہوا جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ انسان کا نام اس کی زندگی میں اس کا کتنا ممد و معاون ہے۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ نام ہمارا بہت بڑا مددگار محسن ہے ذرا سوچئے، شہنشاہ سکندر نہ بنتا تو صرف نام سے اگر اس کا نام کچھ اور ہوتا تو شاید وہ اتنا کامران نہ ہو پاتا۔ ایک بہت موثر مثال فلمی ستاروں کی لیجئے۔ فلمی دنیا میں آتے ہی یہ اچھے خوب صورت اور جاذبِ نظر ناموں کی تلاش کرتے ہیں تاکہ وہ جلد از جلد عوام میں مقبول ہو جائیں۔

فلم سٹار اجیت ایک عرصہ تک حامد کے نام سے کام کرتا رہا مگر اُسے کامیابی نہیں ملی اور اجیت رکھتے ہی وہ شہرت کی بلندیوں پر چڑھنے لگا۔ مدھوبالا پہلے ممتاز کے نام سے فلموں میں آتی تھی۔ لیکن جب وہ مدھوبالا کے نام سے آئی تو بہت مقبول ہوئی۔ اگر ایک نام عوام میں مقبول ہو جاتا ہے تو لوگ اس سے ملتے جلتے نام رکھ لیتے ہیں۔ اگر اشوک کمار اور دلیپ کمار کے نام مقبول ہیں تو دوسرے لوگوں نے اس سے ملتے جلتے نام مثلاً پردیپ کمار کشور کمار۔ انوپ کمار۔ پریت کمار۔ چاند کمار، سنتوش کمار وغیرہ وغیرہ رکھ لئے ہیں

جواہر لال نہرو عوام کے محبوب ہیں تو آپ دیکھیں گے، نہرو خاندان کے اور لوگ بھی اپنے نام کے ساتھ نہرو لکھنا فخر سمجھتے ہیں اور وہ سب زندگی کی دوڑ میں کافی کامیاب ہیں۔ کتنے ہی ماں باپ اپنے بچوں کے نام جواہر لال رکھتے ہیں۔ کتنی لڑکیاں اندرا کے نام سے پکاری جاتی ہیں۔ گجرات کے بہت سے ہندو اور مسلمان خاندان پٹیل نام کو فخریہ استعمال کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ جن کا گاندھی جی سے دور کا بھی رشتہ نہیں ہے گاندھی بھی نام رکھتے ہیں امریکہ اتنا امیر اور کامیاب ملک ہے کہ امریکہ سنگھ نام بھی مقبول اور عام ہو گیا ہے۔ امریکہ کے صدر آئزن ہاور کو وہاں کے لوگ "آئک" کہتے ہیں۔ ان کے ہندوستان آنے پر کئی بچوں کے نام آئک سنگھ، آئک سوامی وغیرہ رکھے گئے۔ چند سال ہوئے جب روسی وزیر اعظم بلگانن اور روس کی کمیونسٹ پارٹی کے صدر خروشچیف ہندوستان آئے تھے تو بہت سے بچوں کے نام بلگانن کے نام پر رکھے گئے تھے ان ہی میں ایک سکھ بچہ بھی تھا جس کا نام بلگانن سنگھ رکھا گیا تھا۔ کچھ عرصہ سے یہ بچہ بیمار رہنے لگا، اور کسی علاج سے فائدہ نہیں ہوا۔ آخر کار ایک جیوتشی سے مشورہ کیا گیا، جس نے بتایا کہ بلگانن کے نام پر اس وقت ستاروں کا منحوس اثر ہے، جس کی وجہ سے بلگانن روس کے وزیر اعظم کے عہدے سے ہٹا دیا گیا ہے اور گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہے اسی منحوس اثر کا نتیجہ بچے کی بیماری ہے۔ جیوتش کے مشورے پر اس کا نام بدل کر روس کے موجودہ وزیر اعظم خروشچیف کے نام پر خروشچیف سنگھ رکھ دیا گیا۔ نام کی اس تبدیلی کے بعد وہ بچہ خود ہی بھلا چنگا ہو گیا اور بغیر کسی علاج کے، اس کی بیماری ختم ہو گئی! اس سچی کہانی سے ستاروں کے ہماری زندگی پر اثر کا تو شاید پتہ نہیں چلتا، لیکن یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ بڑے آدمیوں کے ناموں پر اپنے یا اپنے بچوں کے نام رکھتے ہیں، اور جب ان میں سے کوئی آدمی "بڑا" نہیں رہتا تو وہ نام ان کے لئے مذاق، تکلیف یا مصیبت کا باعث بن جاتا ہے۔

گاندھی جی کے قاتل ناتھو رام گاڈسے کا نام جان لینے کے بعد ان بے شمار لوگوں نے جن کا نام ناتھو رام یا گاڈسے تھا، اپنا نام بدل لیا تاکہ جو نفرت کروڑوں انسانوں کے دلوں میں اس نابکار شخص کے خلاف ہے وہ لوگ اس نفرت کا شکار نہ ہو جائیں۔

یہ سب مثالیں اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ ایک اچھا نام اچھی زندگی دیتا ہے ایک اچھا نام ایک ہنڈی ہے، خوش قسمتی کا نشان ہے ویسے یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ حرکت میں برکت ہے۔ صرف اچھا نام رکھ لینے سے ہی لکشمی گھر نہ آجائے گی بلکہ آپ کو اپنا حق حاصل کرنے کے لئے تقدیر سے لڑنا ہے۔ اپنا سکھ حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنی ہے۔

●●

تیرا دُکھ بھی میرا

رتن سنگھ

رواج کے مُطابق، دلہن کو دئے جانے والا جہیز جب دکھایا جانے لگا تو سریندر کور کا دل بیٹھ گیا۔

وہ اپنی چھوٹی بہن کے لئے لائی ہی کیا تھی؟ معمولی سے تین کپڑے، شلوار قمیص اور دوپٹہ۔ وہ بھی سوتی۔ اپنی دوسری بہنوں کے لائے ہوئے تحفے وہ دیکھ چکی تھی بڑی والی نریندر ایک کشمیری شال لائی تھی۔ ایک غالیچہ تھا۔ اور اس کے ساتھ ایک ریشمی سوٹ۔ دہلی والی بہن ایک بنارسی ساڑھی لائی تھی، جس پر عمدہ مینے کا کام بنا ہوا تھا۔ چھوٹی والی کملیش جو سب بہنوں سے امیر تھی، وہ سوٹ کے علاوہ اپنی چھوٹی بہن کے لئے ایک گھڑی لائی تھی اور ایک انگوٹھی۔ بھلا ان قیمتی تحفوں کے مقابلے میں اس کے سوتی سوٹ کی کیا وقعت تھی۔

وہ خود کو بڑی کمتر سی محسوس کرنے لگی۔ ایک طرح کی شرمندگی کے احساس تلے اس کی گردن جھکی جا رہی تھی۔ اسی لئے جب تمام رشتے دار عورتیں جہیز دیکھنے کے لئے جانے لگیں تو وہ آٹا لے کر گوندھنے بیٹھ گئی۔ آٹا گوندھتے ہوئے زندگی میں پہلی بار اپنی غریبی کا اسے شدت سے احساس ہوا۔ غم کے بوجھ تلے اس کا گلا رندھ گیا۔ آنکھیں بھر آئیں لیکن یہ کیا؟ اس نے سوچا۔ اس خوشی کے موقع پر آنسو؟ یہ بدشگنی۔ آخر اس کی چھوٹی بہن کی شادی ہے۔ ماں نے یا اور کسی نے دیکھ لیا تو کیا سمجھے گا؟ اسی خیال سے دوپٹہ کے پلّو سے آنسو پونچھنے چاہے، لیکن پھر بھی ٹپ ٹپ آنسوؤں کی ایک لڑی آٹے میں گر ہی گئی۔ اُس نے جلدی سے آنکھوں کو اچھی طرح پونچھا اور پھر جلدی جلدی آٹا گوندھنے لگی۔

امیر یا غریب ہونا کسی کے اپنے بس کی بات نہیں ہے۔ خاص کر عورت کے لئے جس کی زندگی ہمارے ہاں، عام طور پر میکے کی چار دیواری سے شروع ہوتی ہے اور سسرال کی چار دیواری کے اندر ختم ہو جاتی ہے۔ اگر شوہر امیر ہے تو بیوی بھی امیر ہے۔ اور اگر شوہر غریب ہے تو بیوی کے لئے اس کے سوائے اور کوئی چارہ نہیں کہ اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ لے۔

سریندر کور کو اپنی غریبی کا احساس اس شدت سے نہ ہوتا، اگر اُس کی دوسری بہنیں بات بات پر اس کا مذاق نہ اڑاتیں۔ پہلے دن سدرشن کور نے اُس کے کپڑے پہننے کے ڈھنگ کا مذاق اڑایا تو دوسرے دن اس کے چائے پینے کی نقل اتاری۔ نقل اتارتے ہوئے وہ ہنسی تو اس کے ساتھ دوسری بہنیں بھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔ سریندر کور بیچاری شرمندہ ہو گئی۔ غریبی کی چکی میں متواتر دس سال پسنے کے بعد وہ امیروں کے فیشن اور تہذیب کو بھلا کیا سمجھ سکتی تھی؟

اس بے عزتی کے لئے اس نے اپنی ماں کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ جس نے ملک کی تقسیم کے بعد آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک لڑکا ڈھونڈا اور اس کے گلے باندھ دیا۔ نہ ٹھیک سے دیکھا کہ لڑکا کیا کرتا ہے۔ کیا عادتیں ہیں۔ اگر کچھ سوچا تو صرف یہ کہ لڑکی جوان ہو گئی ہے۔ جیسے ہو ہاتھ پیلے کر دئے جائیں۔۔۔۔ جیسے کوئی اسے کھانے ہی تو جا رہا تھا اور پھر اُس کی قسمت پھوٹی نکلی۔ شوہر ملا تو ایسا جو کہنے کو تین سو روپے مہینہ کماتا تھا، لیکن سب کا سب شراب کی نظر کر دیتا تھا۔ اور وہ گھر پر کوڑی کوڑی کے لئے محتاج رہتی تھی۔ ایسی حالت میں اس کے پاس پنجاب سے الہ آباد تک آنے کے لئے کرایہ تک تو تھا نہیں،

اچھا تحفہ کیسے خریدتی۔

جہیز والے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس کی ماں رسوئی گھر کے سامنے سے گزری تو وہ اُسے دیکھ کر بولی: "سریندر کور تو یہاں کیا کر رہی ہے۔ جہیز دیکھنے نہیں گئی؟"

"بھابی! بچے رو رہے ہیں۔ کھانا بننے میں ابھی دیر ہے۔ میں نے سوچا کہ جب تک ...."

"بچے تو تیرے باہر کھیل رہے ہیں، اور اگر کوئی روتا ہے تو مٹھائی وغیرہ دے دے۔ ابھی کھانا تیار ہوا جا رہا ہے۔ چل، چل کے جہیز دیکھ لے۔ پھر بند بھی کرنا ہے۔ چل میری بچی۔"

سریندر کور مجبوراً آٹے والے ہاتھ دھو کر ماں کے ساتھ ہولی۔ سب عورتیں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ بس ماں کا انتظار تھا، جو لال دوپٹہ اوڑھے، چابیوں کا گچھا ہاتھ میں لئے پہنچ گئی، اور کچھ کپڑے اٹھا کر راستہ بناتے ہوئے، بکھرے ہوئے جہیز کے بیچ میں جا کر بیٹھ گئی۔

"گیارہ سوٹ اب بنائے ہیں، ...." اس نے بتانا شروع کیا: "ان پر زری کا کام کنول نے خود ہی کیا ہے۔"

عورتیں جھک کر اُن سوٹوں کو دیکھنے لگیں۔

کچھ عورتیں آپس میں کانا پھوسی کرنے لگیں: "وہ لال دھاریوں والا سوٹ میں لائی ہوں۔"

"اچھا ہے۔" دوسری نے کہا: "وہ پیلے رنگ والی ساڑھی، وہ نہیں۔ وہ! جو نیلی ساٹن کے ساتھ رکھی ہے نہ ...."

"وہ۔"

"ہاں۔ ہاں! وہی .... میں لائی ہوں۔"

اس طرح عورتیں اپنے لائے ہوئے تحفے ایک دوسری کو دکھا رہی تھیں۔ اور خوش ہو رہی تھیں۔ لیکن سریندر کور کی آنکھیں، زرق برق کے اِس ڈھیر میں سے اپنے سوٹ کو تلاش کر رہی تھیں۔ جو اُسے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

شاید بھابی میرے سوٹ کو یہاں رکھنا بھول گئی ہیں، اس نے سوچا۔ ایک طرح سے میرے حق میں یہ اچھا ہی ہے، نہ کوئی دیکھے گا نہ مذاق اڑائے گا۔ اس طرح سوچنے سے اُسے کچھ دیر کے لئے چین نصیب ہوا۔ لیکن اگر کسی نے پوچھ لیا۔ سریندر کور کیا لائی ہے تو پھر کیا ہوگا۔ اس کا دل بیٹھ گیا .... اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ بھابی نے سوچا ہو سوتی سوٹ کو جہیز میں کیا رکھوں۔ اور اسی لئے سوٹ نہ لائی ہو۔ اس طرح تو یہ بہت بُرا مذاق ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی اُسے ماں پر غصہ آگیا، اور وہ اپنے ہوش میں نہ رہی۔ اُس کے خیالات کہیں کے کہیں بھٹک گئے تھے۔ اُن عورتوں کے درمیان وہ بت کی طرح کھڑی تھی۔ اپنے گرد و پیش سے بے خبر۔ اُسے پتہ نہیں چلا کہ کب اس کی ماں نے آدھے سے زیادہ جہیز کا سامان دِکھا کر ٹرنکوں میں بند کر دیا۔ وہ ہوش میں تب آئی جب سب عورتیں، اچانک ایک ساتھ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ وہ چونکی تو ایک عورت اس کا کندھا ہلا رہی تھی۔ سریندر کورے! اجی سریندر کورے!"

"یہ تو سمادھی لگائے کھڑی ہے۔" کسی نے کہا۔

ایک اور قہقہہ گونج گیا۔ سریندر کور سمجھی۔ شاید اس کا سوٹ دکھایا گیا ہے۔ لیکن اسی لمحے اُس کے کانوں میں ماں کی آواز آئی "سریندر کورے! اِس سوٹ کیس کی چابی دوسرے کمرے سے لے آ۔ الماری کے اُوپر والے طاق میں رکھی ہے۔"

وہ چابی لے کر آئی تو اُس کی ماں بتا رہی تھی۔

"یہ سوٹ اور گھڑی کمیش لائی ہے۔ یہ شال اور غالیچہ نریندر کور۔"

اور پھر اس نے ایک اور ریشمی ساڑھی اٹھاتے ہوئے کہا: "یہ ساڑھی بھی سریندر کور لائی ہے۔"

اپنے نام کے ساتھ ساڑھی کا ذکر سنتے ہی سریندر کور نے آنکھیں بند کر لیں وہ کہنا چاہتی تھی "بھابی، یہ ساڑھی میں نہیں لائی۔ میرا تو ...." اس کے ہونٹ پھڑپھڑائے۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ بولے اس کی ماں نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ جیسے کہنا چاہتی ہو "بیٹی، تیرے دل کے درد کو میں سمجھتی ہوں۔ تیرا دکھ بانٹ نہیں سکتی۔ لیکن جہاں تک میرا بس چلتا ہے۔ وہاں تک تو کچھ کرنے دے!"

●●

حسن بانو

دو دھڑکتے دلوں کی درد انگیز داستان، جس کو آپ عرصہ تک نہ بھول سکیں گے، اس میں آپ کو سسکتی ہوئی جوانی کی آہیں سنائی دیں گی اور آپ ایسا محسوس کریں گے کہ یہ آپ ہی کی داستان ہے۔

قیمت ۳ روپے

پیاس

اُردو کے جواں سال افسانہ نگار بشیشر پردیپ کے اُن افسانوں کا مجموعہ جو اُن کی زندگی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے

بانو بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی

پیتم گئے پردیس

یونس احمر

کون نہیں جانتا کہ جب بنگال کے آسمان پر کالی گھٹائیں گھر کر آتی ہیں تو گاؤں کی اُن گوریوں پر کیا گزرتی ہے جن کے پیتم کو دُور دیس گئے عرصہ ہو گیا ہے۔ یہ گھٹائیں اُن کے بے کل اور اُداس من میں برہچی کی آگ بھڑکاتی ہیں اور وہ چُپ چاپ اُس کی خلش سہتی جاتی ہیں۔ لیکن کب تک؟ آخر ان کی گہری خاموشی کو اُبال آ ہی جاتا ہے اور اُن کے ہونٹ گنگنانے لگتے ہیں:

کال میگھ نے آسمان کو ڈھانپ لیا ہے،
اور مورنیاں پنکھ کھولے خوشی سے ناچ رہی ہیں
بارش کے قطروں سے پھول کھِل اُٹھے ہیں
اور درختوں کی شاخیں ان پھولوں سے لدی پھندی ہیں!
بادل کی ہر گرج کے ساتھ میرا دل بھی تڑپ اٹھتا ہے
اور میں بدنصیب گھر کے ایک کونے میں بیٹھ کر آنسو بہاتی رہتی ہوں!

اس سلسلے میں بنگال کا "بارہ ماشی" بہت مشہور ہے۔ "بارہ ماشی" دراصل اُس فراقیہ گیت کا نام ہے جس میں سال کے بارہ مہینوں کی مختلف کیفیتوں کا ذکر ہوتا ہے۔ ان بارہ مہینوں میں ہجر و فراق کی ماری بدنصیب کامنی نار پر جو کچھ گزرتا ہے وہ اپنی صحیح تصویر اپنے گرم گرم آنسوؤں اور دل دوز آہوں کے ذریعے کھینچ دیتی ہے۔ "بارہ ماشی" عوامی شاعروں کی ایسی صنف ہے جس میں نرم و نازک احساسات دل و دماغ کو مسحور کر دیتی ہے۔ مثلاً ایک نوبیاہتا لڑکی جس کا شریکِ زندگی دُور دیس میں تلاشِ معاش کے لئے گیا ہوا ہے اور جس کے دن رات کسی کل کاٹے نہیں کٹتے وہ اس طرح اپنی دلی کیفیت کا اظہار کرتی ہے:

جوانی کی آگ ایندھن سے کم نہیں، آخر کیسے برداشت کروں،
میں تو اس کی لپٹوں میں جل جل کر بھسم ہوتی جا رہی ہوں۔

ایک اور گیت میں ایک کامنی نار اپنے "چت چور" کی خوشامدیں کرتی ہے کہ وہ دُور دیس نہ جائے، وہ اس کے لئے اپنے گہنے زیور تک بیچ دے گی مگر اسے جانے نہیں دے گی۔ کہتی ہے:

پیارے، میں تمہارے لئے اپنا بازو بند بیچ دوں گی،
تم نہ جاؤ مجھے چھوڑ کر
چند مہینے اور رہ جاؤ۔

بنگال کی ایک مشہور لوک کہانی "کنکا اور لیلا" ہے۔ "کنکا" ایک عرصے دُور دیس گیا ہوا ہے اور لیلا اس کے لئے پریشان ہو رہی ہے۔ مایوس ہو کر وہ اُس ندی کنارے جاتی ہے جہاں بیٹھ کر چاندنی راتوں میں دونوں نے عہد و پیمان باندھے تھے۔ وہ ندی سے مخاطب ہو کر کہتی ہے:

"اے ندی، تُو تو لیلا کے من کا درد جانتی ہے،
تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میں نے کنکا کے ساتھ
تیرے کنارے کتنی راتیں گزاری ہیں۔
تُو نہ جانے کہاں کہاں بہہ کر جاتی ہے ——— کیا
کبھی تو نے کہیں اس کی بانسری کی آواز بھی سنی ہے؟
تیری لہریں پہاڑ اور پربت کو چیر کر بھی نکل جاتی ہیں،
بتا تو سہی تُو نے اُسے کہیں دیوانہ وار گھومتے ہوئے دیکھا ہے؟
اگر وہ مِل جائے تو کہنا کہ تیری لیلا
زندگی کی آخری گھڑیاں گِن رہی ہے، اُس کی آنکھوں کا چشمہ سُوکھ گیا ہے
اور سانس کی رفتار سُست ہوگئی ہے۔"

ندی جب اس کی منت سماجت کا جواب دیئے بغیر اپنی لہروں کے ساتھ گنگناتی ہوئی چلی جاتی ہے تو لیلا کی آنکھیں آسمان پر جگمگاتے ہوئے تاروں کو دیکھتی ہیں ———
اُن تاروں کو جن کی شریر آنکھوں نے دونوں کو باہم دگر دیکھا ہے۔ ان تاروں سے وہ کہتی ہے:

"اے آسمان پر مست خرامی کرنے والے تارو سُنو،
ذرا میرے پیا کو بھی ڈھونڈو وہ کہاں ہے!
مِل جائے تو اُس کے کان میں چپکے سے کہنا کہ
تیری لیلا تیرے لئے جاں بلب ہے۔
میں آدھی رات کو گہری نیند میں سو رہی تھی کہ کوئی آیا اور
آکر میرے آنچل کی گرہ کھول کر موتی چُرا لے گیا۔
جب ہی سے اپنے اُس انمول خزانے کو ڈھونڈتی پھر رہی ہوں
اب تو روتے روتے آنکھوں کی روشنی بھی جاتی رہی،
نہ جانے پنجرے میں رہنے والا پنچھی کس دیس میں پرواز کر گیا۔
اگر وہ اپنے پنکھ چھوڑ جاتا تو میں بھی اُڑ اُڑ کر اُسے ڈھونڈتی پھرتی۔"

لیلا کی فریاد کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، انتظار کی گھڑیاں بھی بھاری ہوتی گئیں۔ دن ہفتوں میں گزرے، ہفتے مہینے اور مہینے سال میں بدل گئے، لیکن کنکا کا کہیں پتہ نہ چلا "کیا وہ اتنا کٹھور بھی ہو سکتا ہے؟" لیلا سوچنے لگی "نہیں نہیں، وہ ضرور آئے گا۔ دُور دیس کی بات ہے۔ کتنی منزلیں طے کرنی ہیں۔ راستے میں کتنے جنگل پہاڑ آئیں گے۔ ندیوں اور دریاؤں کو پار کرنا ہوگا۔" اُمیدوں کا چراغ ٹمٹماتا پھر چمک اٹھتا۔ اب وہ چراغ کی لَوؤں میں بیٹھ کر "بارہ ماسی" گانے لگی۔ جو مہینہ بھی گزرتا اُس میں اُس کے دِل کی دھڑکنیں شامل ہوتیں۔
وہ گا رہی تھی:

"پھاگن کا مہینہ آگیا، درختوں میں رنگ برنگ کے پھول کھِل رہے ہیں۔
فضا میں بھونرے کے گنگنانے کی آواز شامل ہوگئی ہے
ہائے میں بدنصیب کتنے دنوں سے پیا کی بانسری نہیں سُن سکی ہوں۔
بھونرے تُو تو کہاں کہاں جاتا ہے، اُس سے ملاقات ہو تو
میری بپتا سنا دینا اور کہنا کہ اس کے مالتی کے درخت میں پھول کِھلے ہیں!

بہت دُور سے پیت کی مست کر دینے والی ہوائیں آرہی ہیں
ہائے ایسے سمے میرا پریتم بدیس میں ہے!
شاخوں میں نئے نئے پتے نکل رہے ہیں اور بھونرے کی آواز باغ گونج اٹھا ہے
پریتم میرے کہاں ہو ایسے میں؟
اب تو پھول بھی باسی ہوتے جا رہے ہیں، ہار کیسے گوندھوں
اور کس کے گلے میں پہناؤں؟
کوئلو! اس سے کہیں مڈبھیڑ ہو جائے تو کہنا کہ میں نے اُس کے لئے
جو پھول رکھے تھے
اب وہ سُوکھ کر میرے دل میں کانٹے کی طرح بج رہے ہیں!

نیا سال آگیا! ہر طرف نئی سج دھج ہے،
شہد کی مکھیاں بھنبھنانے لگی ہیں چاروں طرف،
بیساکھ کی دھوپ سے تن بدن جھلسا جا رہا ہے
کوئلیں بسنت کو وداع کہہ رہی ہیں، میرے پریتم اِس سمے تم کہاں ہو؟
دیکھو نئے سال کی آمد کے ساتھ ساتھ من میں نئی آشائیں جنم لے رہی ہیں
لیکن میں بدنصیب تو مایوسیوں کی آگ میں جل رہی ہوں!

لو جیٹھ بھی آگیا!
آم اور جامن پک رہے ہیں،
درختوں کی ڈالیوں پر چڑیاں میٹھی گیت گا رہی ہیں،
مجھ بدنصیب کی آہ وزاریاں کوئی نہیں سنتا!

اساڑھ آگیا۔
سوچا تھا اساڑھ کے ساتھ ساتھ میرا پریتم بھی آئے گا
اور من کی آشاؤں کے پھول کھِلیں گے۔

دیکھو درختوں کے پتے نہاکر تر و تازہ ہو گئے ہیں ندی نالے بھر گئے ہیں،
اور ملاح اپنی کشتیوں کے بادبان اُڑا کر دُور دیس جا رہے ہیں،
کیا میرا پریتم کبھی نہیں آئے گا؟

کال میگھ نے آسمان کو ڈھانپ لیا ہے
اور مورنیاں پنکھ کھولے خوشی سے ناچ رہی ہیں،
بارش کے قطروں سے پھول کھل اُٹھے ہیں
اور درختوں کی شاخیں ان پھولوں سے لدی پھندی ہیں
بادل کی ہر گرج کے ساتھ میرا دل بھی تڑپ اٹھتا ہے
اور میں بدنصیب گھر کے ایک کونے میں بیٹھ کر آنسو بہاتی رہتی ہوں!

ساون نے آسمان کا سمندر اُلٹ دیا ہے
بڑے بڑے پتھر اس کے بہاؤ میں بہتے جا رہے ہیں
موسلا دھار بارش ہو رہی ہے مگر چاتک کی پیاس نہیں بجھتی
میری بھی یہی کیفیت ہے، میں برہ کی ماری کس کو اپنی بپتا سناؤں؟
بھادوں میں میرا تن بدن پھنکا جا رہا ہے
اس پر نندوں کا جبر و ستم بھی سہتی ہوں
جب جل تھل گنگا میں پانی بھرن کو جاتی ہوں تو میری آنکھیں
بہت دُور تک تمہاری ناؤ کو دیکھتی رہتی ہیں کہ شاید تم آجاؤ۔

آسن کے مہینے میں جب آسمان پر چندا کی ہنسی لہراتی ہے تو
محسوس ہوتا ہے جیسے میرے دل کے آس پاس کوئی ہنسی بجا رہا ہے
میرا جسم تو کالا ہو چکا ہے، بھلا مجھے اب کوئی کیوں چاہنے لگا۔

کاتک کے مہینے میں دھان کھیر بن گئے
مگر پیارے تمہارے بنا من کو قرار کہاں!

اگھن مہینے میں دھان پک گئے،
مجھے تنہا چھوڑ کر کہاں ہو بیدردی؟
باندی کی طرح دن رات کام کرتی ہوں،
مرچیں پیس پیس کر میری ہتھیلی جلنے لگی ہے۔

پوس کا مہینہ بھی آگیا، سرد ہوائیں بھی آنے لگی ہیں،
تمہارے بنا یہ ہلکی سردی بھی بہت ہے۔

ماگھ کی گرمی میں شیر کی گرج سن کر میرا کیا حال ہوتا ہے تمہیں کیا معلوم؟
آنسوؤں سے گدڑی بھیگ جاتی ہے!

یہ بارہ ماسی بنگال میں بہت مشہور ہے۔ اس میں برہمن ناری کی جو بپتا بیان کی گئی ہے وہ کس قدر دردناک اور مؤثر ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ میں دل کی دھڑکنیں سمائی ہوئی ہیں۔ ایک سال میں کتنے مہینے آئے اور ہر مہینے نے نیا رُوپ بدلا لیکن پتیم کے انتظار میں اس کی آنکھیں بوجھل نہیں ہوئیں، اُس کے بے تاب دل نے شکوہ نہیں کیا۔ وہ اپنے پتیم کی طرف سے بدگمان نہیں ہوئی۔ انتظار، انتظار اور انتظار! "وہ آتا ہی ہوگا!" امید کی کرن اس کے من میں پھوٹتی رہی مگر وہ نہ آیا۔ کتنے بادبان دُور سے دکھائی دیئے مگر اس کے پتیم کی ناؤ کا بادبان کہیں نظر نہ آیا۔ نظر آتا بھی کیسے؟ وہ تو بدیس میں ہے۔ اور جب اس کی امیدیں ایک دم سے بے سہارا ہو گئیں اور ساس نندوں کے مظالم بڑھتے گئے تو ایک روز وہ شکستہ ناؤ پر روانہ ہو گئی۔

نندوں نے اُسے جاتے ہوئے دیکھا تو کہا:

"بھابی سُن جاؤ، کہاں جا رہی ہو شکستہ ناؤ پر
میرے گھر آجاؤ۔"

"نہیں نہیں اب واپس نہیں آؤں گی، مجھے نہ بُلاؤ۔"

ساس بھی سینہ پیٹتی ہوئی آگئی اور بین کرنے لگی:

"میرے گھر کی لکشمی اپنا گھر دوار چھوڑ کر کہاں جا رہی ہو؟
تم تو اندھیرے گھر کی روشنی ہو،
تمہارے بنا مجھے پل بھر بھی چین نہیں آئے گا۔"

بہو نے جواب دیا،

"ناؤ ڈوب رہی ہے تو ڈوبنے دو، میں اب نہیں آؤں گی،
ماں مجھے رخصت کرو، الوداع ماں!"

لیلا نے ساس اور نندوں کے مظالم کا جواب اینٹ پتھر سے نہیں دیا۔ وہ زبان پر حرفِ شکایت تک نہ لائی ـــــ کتنی خاموشی سے اُس نے اپنی زندگی کا گلا گھونٹ دیا۔ بنگال میں ایسی بے شمار لوک کہانیاں ہیں جن میں عورتوں کی خاموش محبت کی داستانِ الم بیان کی گئی ہے، اور ان میں ان کے جذبات و احساسات کی ایسی صحیح عکاسی کی گئی ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

●●

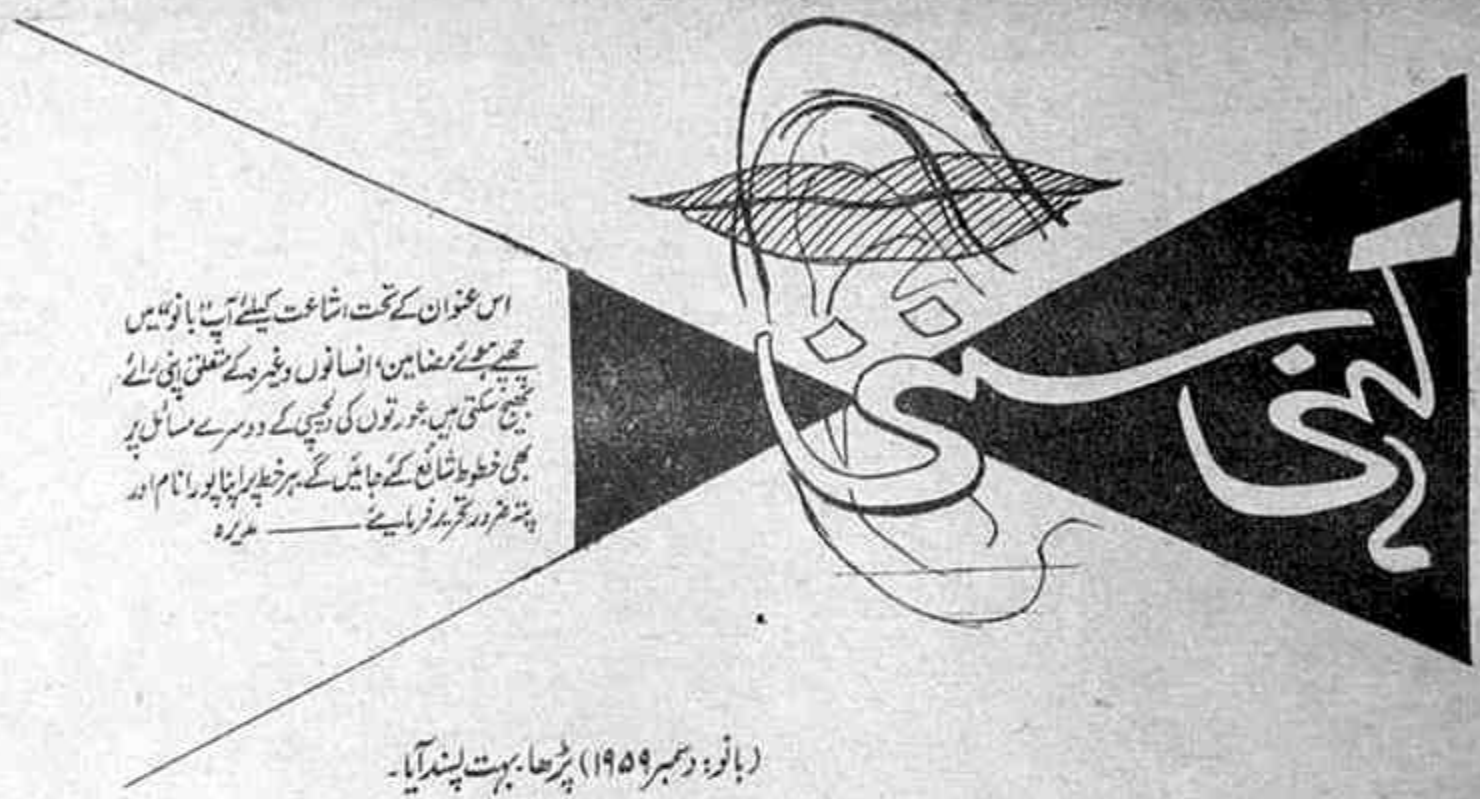

اس عنوان کے تحت اشاعت کیلئے آپ "بانو" میں چھپے ہوئے مضامین، افسانوں وغیرہ کے متعلق اپنی رائے بھیج سکتی ہیں۔ خواتین کی دلچسپی کے دوسرے مسائل پر بھی خطوط شائع کئے جائیں گے۔ ہر خط پر اپنا پورا نام اور پتہ ضرور تحریر فرمایئے ——— مدیرہ

بانو

بھابی جان!

آپ کی محنتوں نے دن بدن "بانو" کو ترقی کی منزل پر ڈال دیا ہے۔ مجھے پنجاب کے ڈھولک گیت (بانو: نومبر ۱۹۵۹) بہت ہی پسند آئے اور مجھے پوری اُمید ہے کہ آپ اسی قسم کے دوسرے صوبوں کے گیت بھی شائع کر کے ہم تک ان کی آواز کو پہنچائیں گی۔

ایم۔ اے۔ کے۔ یادبا، کٹیہار

★ اس بار بنگال کے کچھ لوک گیت دئے جا رہے ہیں ——— مدیرہ

منتخب اشعار

اچھی بھابی:

منتخب اشعار کا سلسلہ آپ نے بڑا مفید سوچا ہے۔ میری ناچیز رائے یہ ہے کہ اس سلسلہ کا عنوان

"۔۔۔۔ رسوا کیا مجھے!"

ہمیشہ کے لئے قائم ہو جائے۔ غالب کا یہ مشہور مصرعہ تو سب کو معلوم ہے۔ بس سب ہی جان جائیں گے کہ یہ اشعار کا انتخاب ہی تو ہوگا۔۔۔۔

جہاں بانو نقوی، حیدرآباد دکن

سپہ گر عورتیں

بھابی:

غلام احمد فرقت صاحب کا مضمون "نواب شجاع الدولہ کی ایک سپہ گر بیٹی"

(بانو: دسمبر ۱۹۵۹) پڑھا۔ بہت پسند آیا۔

امید ہے آپ آئندہ بھی ایسے ہی تاریخی مضامین بانو میں شائع کرتی رہیں گی۔ تاکہ بہنیں دلچسپی کے ساتھ ساتھ ان مضامین سے مستفید بھی ہو سکیں، اور ان میں ملک و قوم کی ہر میدان میں خدمت کا جذبہ اُبھرے۔

دلشاد انجم، دہلی

بڑی بی کی ڈائری

بھابی:

مجھے بڑی بی بہت پسند ہیں اس لئے کہ وہ کھری کھری سناتی ہیں اور کچھ اس لئے بھی کہ میرا خیال ہے وہ جو کہتی ہیں اگر ان پر عمل کیا جائے تو تعجب نہیں جو بہت سی اُلجھی باتیں سُلجھ جائیں۔ دراصل پُرانے زمانے کے بڑے بوڑھوں کا دم غنیمت اسی لئے سمجھا جاتا تھا کہ وہ اپنے خاندان کے جھگڑوں کو نمٹاتے ہیں اور بہت آسانی سے ہر بڑے سے بڑے معاملہ کو رفع دفع کر دیتے ہیں۔

"ابھی تک تو مردوں کو روتی تھی معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ عورتوں کو بھی رونا پڑے گا" (بانو: دسمبر ۱۹۵۹) بڑی بی کو تو یہ جملہ بہت پہلے ہی کہنا چاہئے تھا۔ کیوں کہ عورت پر تو ہم اسی وقت رو دیئے جب اس نے گھریلو کاموں کا نام لے کر پردہ ترک کیا، مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کے خبط میں محفوظ اور پُرامن گھروں کو چھوڑ کر سڑکوں پر نکل پڑی۔ نام نہاد فیشن کا نام لے کر عریانی اختیار کی، مغرب کی اندھی تقلید میں غیر مردوں کی باہنوں میں باہنیں ڈال کر سیر و تفریح کرنے لگی ——— بڑی بی! کیا یہ باتیں رونے والی نہیں؟ اور کیا یہ باتیں تم نے کہیں نہیں دیکھیں جو ایک شوہر کو بیوی کے تنگ کرنے پر تمہیں یہ کہنا پڑا؟ رونے والی باتیں تو وہ ہیں نہ کہ یہ ———؟

کہنی سُننی

بہرحال میں تمہیں بے حد چاہتی ہوں۔ تمہاری باتیں میری آنکھوں کی راہ دل میں اُتر جاتی ہیں۔ خدا تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ ہر راہ تمہاری زبانی باتیں سنتی ہوں اور اپنا بھی کڑھا کڑھا کر رہ جاتی ہوں۔ لیکن آج تم میری زبانی ایک واقعہ سنو اور ہو سکے تو عورتوں کو بھی بھر کے رو لو!

کچھ عرصہ پہلے یہاں ہمارے پڑوس میں ایک صاحب رہتے تھے جو خوبصورت تھے اور کافی صحت مند بھی، لیکن طبیعت ذرا پُرمذاق تھی۔ آپ کی دوستی ایک پارک میں دو تین لڑکیوں سے ہو گئی۔ لڑکیاں بھی کافی "پُراخلاق" تھیں۔ خوب گہری چھنی۔ پارک، کلب، سینما غرضیکہ ہر جگہ ساتھ ساتھ لگی رہتیں۔ ایک مرتبہ گھر پر آئیں تو ہم نے بھی دیکھا۔ صورت شکل کی بالکل معمولی تھیں۔ یہ حضرت ماں کے اکلوتے تھے۔ ماں کو ان کی شادی کا بڑا ارمان تھا ماں یہی سمجھیں کہ بیٹا ان کالی بھٹی چھوکریوں پر مرمٹا ہے اور کسی ایک سے شادی کرے گا۔ لیکن وہ ماں کو سمجھاتے اور کہتے کہ میں آپ کی پسند سے باہر نہیں ہوں، آپ جس لڑکی سے کہیں گی میں اسی سے شادی کروں گا۔ ان لڑکیوں کو تو محض اُلو بنا رہا ہوں۔ ہم انہیں بھائی جان کہتے تھے اور جب کبھی وہ اُن لڑکیوں سے مل کر آتے تو ہم کو ان کی بے وقوفی کی داستانیں سنا سنا کر خوب ہنساتے۔ آخر ایک دن ان کی شادی طے ہو گئی۔ ہم بن بن کر دُلہن کو دیکھنے گئے تو بڑی بی! تم یقین کرو یہی معلوم ہوا کہ بھائی جان نے ہم سے مذاق کیا ہے کیوں کہ ہم وہ دیکھ رہے تھے جس کی ہم کو قطعی توقع نہیں تھی۔ یہ ان کے کسی دوست کی بہن تھی پیاری پیاری سی صورت، شرم و حیا کی پُتلی، مشرقیت کی بھرپور تصویر، بند گلے اور لانبی آستینوں کا نیچا پاکیزہ سا شرٹ پہنے، سر پر دوپٹہ، آنکھیں نیچی۔ ہم سے باتیں کیں تو ایسا لگا کانوں میں رس ٹپک رہا ہے۔ ان کو ہم سب نے بہت پسند کیا اور شادی ہو گئی۔ شادی کے دن کسی بے تکلف دوست نے ہنس کر بھائی جان سے پوچھا "کیوں کیا ان تینوں کو اتنی جلدی بھول گئے ہم تو سمجھے تھے تم اُن ہی میں سے کسی ایک کو اپنے لئے پسند کرو گے" تو بڑی بی جانتی ہو بھائی جان نے کیا کہا؟ انہوں نے ایک قہقہہ لگایا اور بولے "ارے یار وہ تو محض تفریح تھی، ایک مذاق تھا، مذاق میں اور اصل میں بہت فرق ہوتا ہے۔ شادی تو زندگی بھر کے لئے کی جاتی ہے، مذاق چند دنوں کے لئے ہوتا ہے۔"

بڑی بی! جب اپنا ہی مال خراب ہو تو گاہک کا کیا دوش؟ وہ تو ظاہر ہے ایک عیب کے چھپتے عیب نکالے گا۔ اگر عورتیں اپنے آپ کو ارزاں نہ کریں تو مجال ہے انہیں جنس مخالف کیا، اپنی ہم جنس ہی کچھ کہہ سکتی؟ اگر تم مردوں کو رونے سے پہلے عورتوں ہی کو رو لیتیں نا، تو کبھی مردوں کو رونے کی نوبت نہ آتی۔

وصیہ عرفانہ، حیدرآباد دکن

آنکھوں کا پردہ

بھابی!

دسمبر کے بانو میں محترمہ حبیب ضیا صاحبہ نے "نگاہوں کے پردے" کے متعلق بتایا ہے ——— آیئے میں آپ کو اسی نگاہوں کے پردے پر ایک لطیفہ سناؤں جو میرا خیال ہے کہ کافی دلچسپ ہے:

ٹرین کے کسی زنانہ ڈبہ میں چند پُرانے خیال کی معمر بیبیاں پردے پر بحث کر رہی تھیں۔ اتفاق سے اسی ڈبے میں دو تین فیشن ایبل بے پردہ لڑکیاں بھی بیٹھی تھیں۔ ان لوگوں نے دھوپ کی عینکیں لگا رکھی تھیں۔ یہ لوگ بڑی دیر تک خاموشی سے اپنی "بے حیائیوں اور بے پردگیوں" کی داستان ان بڑی بیبیوں کی زبانی سنتی رہیں، مگر آخر میں ایک لڑکی سے خاموش نہ رہا گیا وہ بول اٹھی "محترمہ! ہم برقعہ والے پردے کے قائل نہیں۔ ہم آنکھوں کا پردہ کرتے ہیں!" اس پر محترمہ اپنے گول گول دیدے پھرا کر بولیں "ارے بیٹی! تو اسی لئے تم نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھا رکھا ہے ———؟ ان اللہ ماری سیاہ عینکوں میں کیا خوبصورتی دھری ہے جو لڑکیاں اسے لگائے بغیر باہر ہی نہیں نکلتیں ——— اے لو بھلا مجھے کیا خبر تھی کہ لڑکیاں اسے لگا کر "آنکھوں کا پردہ" کرتی ہیں ———!!"

کہئے بھابی کیسا رہا یہ لطیفہ ———؟ اور ہاں پسندیدہ اشعار کا سلسلہ شروع کرنے پر میری طرف سے دلی مبارک باد قبول فرمایئے۔

آصفہ عارفی، کلکتہ

زینت بھابی:

پردہ پر اب تک جتنی بحث ہوئی ہے ان تمام میں محترمہ حبیب ضیا اور حیدرآباد دکن کا خط (بانو، دسمبر ۱۹۵۹) مجھے بے حد پسند آیا۔ محترمہ نے آج کل کے پردہ کی جتنی قسمیں پیش کی ہیں بے حد درست ہیں، مجھے ان کی آخری اور آسان ترین ترکیب بے حد پسند آئی۔ میں ان کی اس تجویز کی تائید کرتی ہوں، نگاہوں کے پردہ سے بہتر اور کوئی پردہ آج کل کی فضا کے لئے موزوں نہ ہوگا۔

نور جہاں، مظفر (مہاراشٹر)

کلاڈ کاغان

بھابی:

اونچے اونچے پہاڑوں پر چڑھنے والے جاں باز مردوں کی داستانیں پڑھ کر مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ کم از کم یہ میدان صرف مردوں کے ہاتھ ہے۔ لیکن آپ نے کلاڈ کاغان کی انسوسنگ مگر جرأت مندانہ کہانی (بانو: دسمبر ۱۹۵۹) شائع کر کے ہم سب کو دکھا دیا کہ عورت زندگی کے کسی شعبہ میں بھی مرد سے پیچھے نہیں ہے۔

سلمہ نواز، لکھنؤ

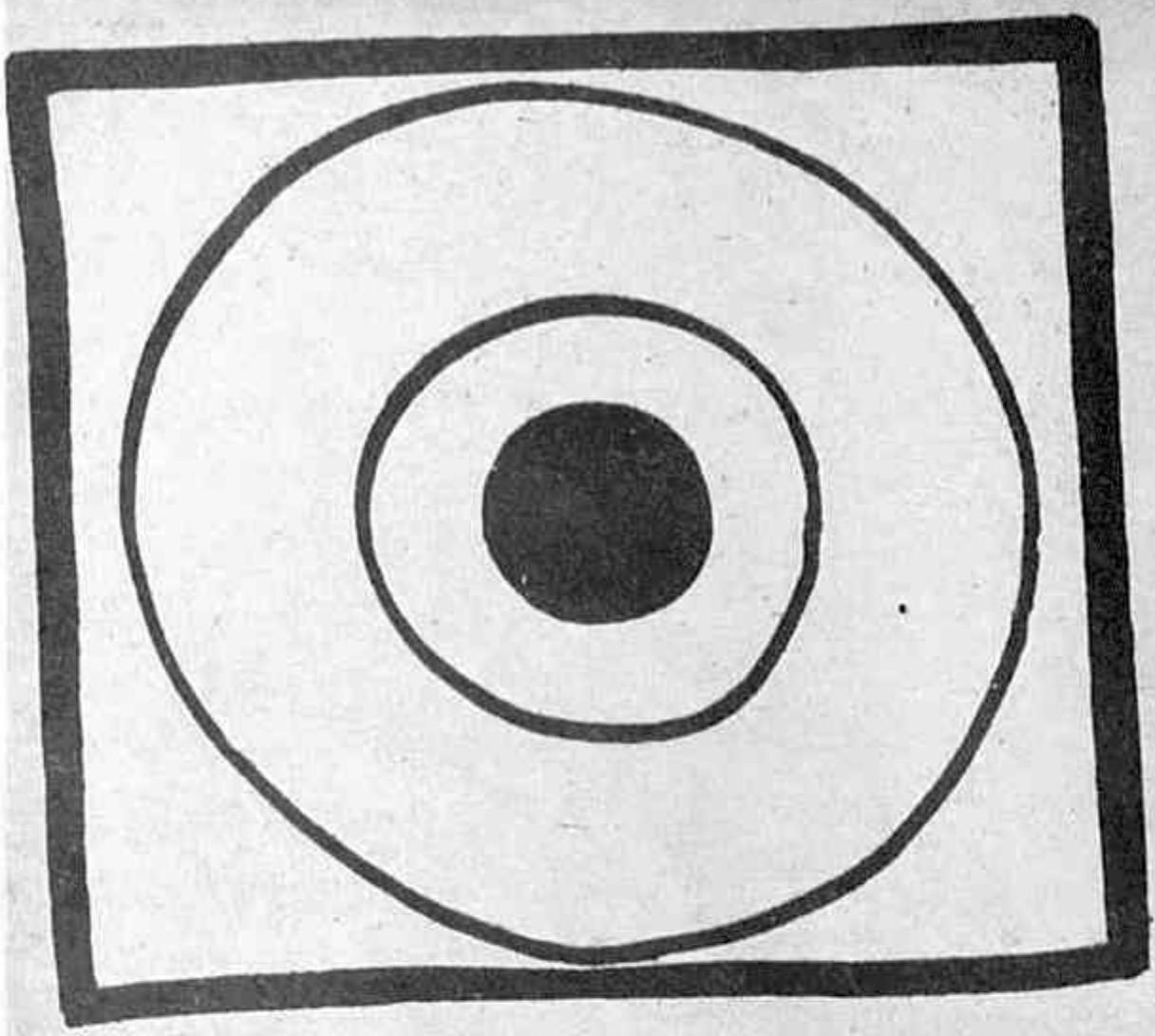

عجیب تصویر

ایک مشہور مصوّر نے یہ تصویر بنائی تھی، لیکن جب ہم نے اس سے یہ پوچھنا چاہا کہ یہ کس چیز کی تصویر ہے تو پاگل خانے کے ڈاکٹروں نے ہمیں اس مصوّر سے ملنے نہ دیا۔ (ہم پاگل خانے میں بند نہیں تھے، وہ بند تھا۔ آپ کی سمجھ میں اب تو آ گیا؟)

دفتر "بانو" میں ایک کمیٹی یہ فیصلہ کرنے کے لئے بیٹھی کہ یہ کس چیز کی تصویر ہے؟ ایک بہن نے کہا "فرائی پین میں انڈا تلا جا رہا ہے۔" ایک اور نے کہا "ایک بہت موٹا آدمی دھوپ کا ہیٹ لگائے ہوا ہے اور اس کے بالکل اوپر سے دیکھ کر اس کی تصویر بنائی گئی ہے۔" ایک صاحبہ کا خیال تھا کہ یہ چوڑی منڈیر والا گہرا کنواں ہے۔" ایک تجویز تھی کہ یہ چائے دانی کا ڈھکنا ہے۔

ایمان کی پوچھئے، تو ہمیں بھی نہیں معلوم کہ یہ کیا ہے۔ مگر یہ سادہ سی تصویر ہمیں اتنی پسند ہے کہ ہم اسے اپنے کمرے میں لٹکانا چاہتے ہیں۔ کوئی پوچھے گا یہ کیا ہے؟ تب تو ہمیں یہ بتانا ہی ہوگا۔ آپ ہماری یہ مشکل حل کیجئے۔ سوچ کر بتائیے کہ یہ کس چیز کی تصویر ہو سکتی ہے۔ آپ ایک، دو، تین، چار یا زیادہ سے زیادہ پانچ جواب بھیج سکتی ہیں۔ سب جواب ایک ہی کاغذ پر یا ایک ہی پوسٹ کارڈ پر لکھے ہونے چاہئیں۔ ساتھ ہی اپنا پورا نام اور پتہ بھی لکھئے۔ (جس کاغذ یا کارڈ پر جواب بھیجیں اس پر دفتر سے متعلق اور کوئی بات نہ لکھیں ورنہ اس پر توجہ نہ دی جا سکے گی۔

سب سے دل چسپ جواب اور انہیں بھیجنے والی بہنوں کے نام فروری ۱۹۶۰ کے "بانو" میں شائع کئے جائیں گے۔ اپنے جواب اس پتہ پر بھیجئے تاکہ ۲۵ جنوری ۱۹۶۰ تک پہنچ جائیں۔

عجیب تصویر، ماہ نامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبرا

فوٹو پہیلی نمبر ۵ کا دلچسپ نتیجہ

دسمبر ۱۹۵۹ کے بانو میں جو تصویر آپ کو پہچاننے کے لئے دی گئی تھی، وہ ایک "پیچ" کی تھی، جسے پیچ دار کیل یا سکرو بھی کہا جاتا ہے۔ بہت سی بانو بہنوں نے اسے سوئیاں بنانے والی مشین کا ایک حصہ سمجھا، کچھ نے اسے کباڑ کا چاک جانا اور کچھ نے اسے ایک گھومتا ہوا لٹو سمجھا۔ پھر بھی ۲۲۹ بانو بہنوں اور بانو بھائیوں نے اُسے صحیح پہچان لیا۔ ان کے نام شائع کئے جا رہے ہیں۔

رضیہ پروین رضوی ہردوئی۔ عبدل مجید، ایم، ایس تھانہ۔ شاہدہ ریحانی مونگیر۔ اختر النساء مونگیر۔ صفیہ فردوس کراچی۔ آن مشرف کراچی۔ ایس، ایم عبدالطاہر بنارس۔ آئشہ ادیب خانم بنارس شوکت علی خاں اعظم گڑھ۔ عائشہ بشیر تمکر۔ نصرت جہاں جونپور یوپی۔ شمشاد احمد کلکتہ ۱۲۔ رانا نا صدا بھی گجرات شہر۔ افروز بانو امبور۔ اختر شہناز بیگم کراچی۔ شرف النساء بیگم ملباگل۔ محمد قاسم آنسنول۔ سلطان جہاں نئی دہلی۔ عبدالمحسن جبلپور۔ عائشہ شمیم وانمباڈی۔ فردوسیہ خاتون قادر آباد۔ کماری گلنار بانو انقدر (مدھیہ پردیس)۔ نوشابہ جنیل کانپور۔ بدیع النساء بنگش امراوتی۔ سرطان حنیفہ بی بھی ۳ مجیب الدین پٹنہ ۴۔ یم، امان اللہ پٹنہ ۴۔ انبساط احمد علوی دہلی۔ سید شہنشاہ حسین حیدرآباد دکن صالحہ خاتون مونگیر۔ بیجو عابد حیدرآباد ۱۔ قمر جہاں حیدرآباد دکن۔ مس غوثیہ حیدرآباد ۲۔ یم اقبال برہانپور۔ حسن آرا مغربی ٹمارٹر۔ نسیم احمد خاں شاہجہانپور۔ س، ایم عطیہ گورکھپور۔ نزہت سلام مغربی بنگال۔ نزہت افروز مغربی بنگال۔ آفتاب خاں اعظم گڑھ۔ نسیم بانو جالنہ۔ بیگم فرحت حظائی چک مگلور۔ خالدہ صابرہ آباد۔ کنیز کوثر کلکتہ ۱۔ مس آسنہ تیوم واراشی۔ رضوان اللہ خاں علی پور۔ محمد شہاب الدین بھاگلپور۔ رضیہ سلطانہ وانمباڈی۔ وحیدہ بیگم گودڑ۔ عطیہ پروین ہردوئی۔ مبین اندور۔ ثروت نسیم قدوائی بارہ بنکی۔ مقبول سلیم پونہ۔ شمیم بیگم اکبر پور۔ فاطمہ خورشید دہلی ۶۔ زاہدہ حسین بنگلور۔ مس رشیدہ عذرا قمر جونپور۔ عجائی رابعہ بانو احمد آباد۔ سید اشفاق الدین تاج حیدرآباد دکن۔ محمد عبدالرب پٹنہ ۴۔ مہرالنساء بیگم رتلام۔ انیس احمد وصولیہ۔ سید شبیر احمد مدراس ۱۔ جہاں آرا بھاگلپور۔ عبدالمنان ہاتی اعظم گڑھ۔ زہرہ فاطمہ اعظم گڑھ۔ ریحانہ عزیز لکھنؤ۔ مس شاکرہ خاتون میسور۔ مس زاہدہ خاتون ادیوار۔ دلشاد انجم دہلی۔ محمد حسین راجستھان۔ ریحانہ شمیم تابلیور۔ مس سکندر محمود حیدرآباد دکن۔ ملامت بیگم واسطی پاکستان۔ مس طاہرہ احمد نیلور۔ بدرالنساء ویلور۔ فاطمہ بائی مغربی پاکستان نورین طلعت نسرین کلکتہ ۱۶۔ تہمینہ بیگم تھالسنر۔ رباب بیگم دامو۔ خورشید عالم ہوڑہ۔ عثمان غنی ہوشنگ آباد۔ اکبر یاوری گیا۔ شمیم پروین جھانسی۔ ناظمہ شہر قادر آباد۔ نازبی صفیہ الہ آباد۔ نجم النساء بیگم کلکتہ ۱۔ بی، محمد تین وانمباڈی۔ آصفیہ جمیل عالیہ دہلی۔ زلیخا پروین جمشید پور۔ عبدالقادر بھیانڈی۔ اسمار، اے، دنچو بھیانڈی۔ سرور داؤد سارن۔ بیگم اشوک فہمی کلکتہ ۳۲۔ نسیم ساز کلکتہ ۳۲۔ اختر حافظ جی کلکتہ۔ زبیدہ بائی انجین (ایم، بی)۔ مسز محمود ٹیلیل کلکتہ ۱۶۔ شفیق ناگی آسام۔ سجاد حسین مرادآباد۔ سید شاہ اعجاز الدین پٹنہ۔ فریدہ احسان حیدرآباد دکن۔ امہ صغریٰ حیدرآباد دکن۔ محمد اے، اے، نعمانی حیدرآباد دکن۔ بلقیس عزیز حیدرآباد دکن۔ محمد اقبال دہلی۔ اشہری طلعت بہار۔ عزیز فاطمہ زیدی مظفر پور۔ رضی احمد انجم بہار۔ خدیجہ بیگم اماریا، ایم پی۔ شہناز احمد کلکتہ ۱۔ سعیدہ خاتون بارہ بنکی۔ شیرین امولیا کلکتہ۔ محمد یٰسین حیدرآباد دکن۔ مس روشن پروین مغربی بنگال۔ مس آرا خانم ادیب کلکتہ ۱۷۔ جہاں آرا بیگم کلکتہ ۱۷۔ فصیح اللہ بیگ ٹونک۔ انیس فاطمہ بارہ بنکی۔ ایم، اے، رشید اورنگ آباد۔ سید حمیدہ قادری بمبئی ۹۔ انیسہ محمود حیدرآباد دکن۔ فرحانہ رحمان آروی بہار۔ مس زلیخا مدراس ۱۔ مس خدیجہ بمبئی ۹۔ اپنے کے قمر النساء مدراس۔ عطیہ السلام بیگم بھوپال۔ عبدالعزیز پٹنہ ۴۔ شوکت مذنر کلکتہ ۱۔ سراج احمد دہلی۔ عشرت سلطانہ دردشکل، اندھرا پردیش۔ مظہر سلیم صدیقی بھوپال۔ شکیل احمد خاں کلکتہ ۱۔ زبیدہ ائین ناگپور۔ عبدل باسط ممتاز۔ اقبال جہاں بیگم بھلائی ۱۔ نعیض سلطانہ نسیم کلکتہ ۱۔ نذیر احمد بمبئی۔ اسد احمد بمبئی عائشہ بیگم بمبئی۔ زبیدہ خاتون کلکتہ ۱۔ زرین سلطانہ کلکتہ ۱۔ شکیل پرویز کلکتہ ۱۔ فریدہ بانو احمد آباد۔ رضیہ سلطانہ کلکتہ۔ عبدالجبار صدیقی جھانسی یوپی۔ ملا حسن علی ملکاپور (بی، ایس)۔ محمد عبدالغنی مدراس ۱۴۔ مس ڈولی خاں نئی دہلی ۱۔ پروین سلطانہ کراچی ۲۲۔ قدسیہ انجم صاحبہ کولرا بی ایس۔ شمیم آرا۔ محمد ابوالحسن حیدرآباد دکن۔ حمیدہ رعنا دہلی۔ ریحانہ رحمان مونگیر۔ خیمہ خاتون جھا جھا۔ محمد یوسف الدین سنگدل حیدرآباد دکن۔ حمیدہ رعنا دہلی۔ ریحانہ رحمان مونگیر۔ رضیہ سلطانہ کلکتہ۔ شکیلہ قیصر اجستھان۔ مس عطیہ السعید الہ آباد۔ منظورہ حسن جمشید پور۔ ساجدہ خاتون بمبئی ۸۔ نسی دہلی۔ کنیز اے، بانو حیدرآباد دکن۔ محمد ابراہیم حیدرآباد دکن۔ اختر حسین لکھنؤ۔ مس فہیم بانو حیدرآباد دکن۔ محمد آصف شاہ بمبئی۔ نفیس بیگم دہلی۔ ایم انور بربان پور۔ ایم پی۔ بلقیس ٹیلیل کلیان۔ مس راشدہ کلکتہ ۱۴۔ نزہت آرا بہار۔ عائشہ بی پہلال مالا۔ مس نسرین جمشید پور۔ رقیہ بیگم بنگلور ۴۔ ایس ایم، وہاج الدین پٹنہ۔ فیضان احمد پٹنہ۔ سکینہ آفتاب علی حیدرآباد دکن۔ عائشہ انجم عباسی حیدرآباد دکن۔ فیضا الدین احمد نظام آباد دکن۔ مسز پرکاش نئی دہلی ۱۔ سائرہ خاتون مونگیر۔ رضیہ فرحت گیادی گیا۔ سرفراز الرحمٰن گیا۔ محمد شریح ہاجرہ خاتون حیدرآباد دکن۔ سحر صابر جنیدی حیدرآباد دکن میمونہ خانم وعائشہ خانم سورت۔ وسیم انجم بنگلور ۴۔ مس افلاک قریشی احمد آباد۔ قمر صدیقی میرٹھ۔ نورس شاہین بنگلور ۴۔ نعیم یوسف کلکتہ۔ مس جمشید یوسف بہار۔ سرفراز خاں بلند شہر۔ مدار بخش پٹنہ ۴۔ عزیز جہاں حیدرآباد دکن۔ اقبال احمد حیدرآباد دکن۔ محمد نسیم سیٹھ مدراس۔ ایس صمد شاہ بمبئی ۲۔ میر شفیق احمد رتلام۔ گلفام بیگم کلکتہ۔ سلمہ ناہید کلکتہ۔ نجمہ خاتون کلکتہ ۱۔ شگفتہ یٰسین کلکتہ ۱۷۔ فاطمہ موسیٰ بمبئی۔ مس شاہین رانچی۔ ٹنی سیوانی سیوان۔ اُم ثمینہ ممتاز گورکھپور۔ مس شریفہ خاتری بمبئی ۳۔ فردوس اقبال بھیونڈی۔ رمیلہ اسمٰعیل پونہ کیمپ۔ معز انصاری بمبئی ۳۔ مس امینہ عالم کلکتہ ۱۶۔ کشور ممتاز ناگپور۔ مسز نسیمہ ناز کلکتہ ۱۔ کریمہ بائی بمبئی ۳۔ نور جہاں میسور۔ رخسانہ سعیدا لاہور۔ سلیم النساء بیگم مدراس ۱۔ سید بشیر حسن مدراس۔ رضیہ سلطانہ بھوپال۔ گلفشاں بانو کلکتہ۔ عائشہ خاتون علی گڑھ۔ جمیلہ طلعت ٹونک۔ اُم ایمن کمال دہلی۔ سعیدہ کمار بریلی۔ مقبول سلیم پونہ۔ خیر النساء بیسیریا۔ آصفہ عارفی کلکتہ ۱۴۔

پہچانئے تو.....

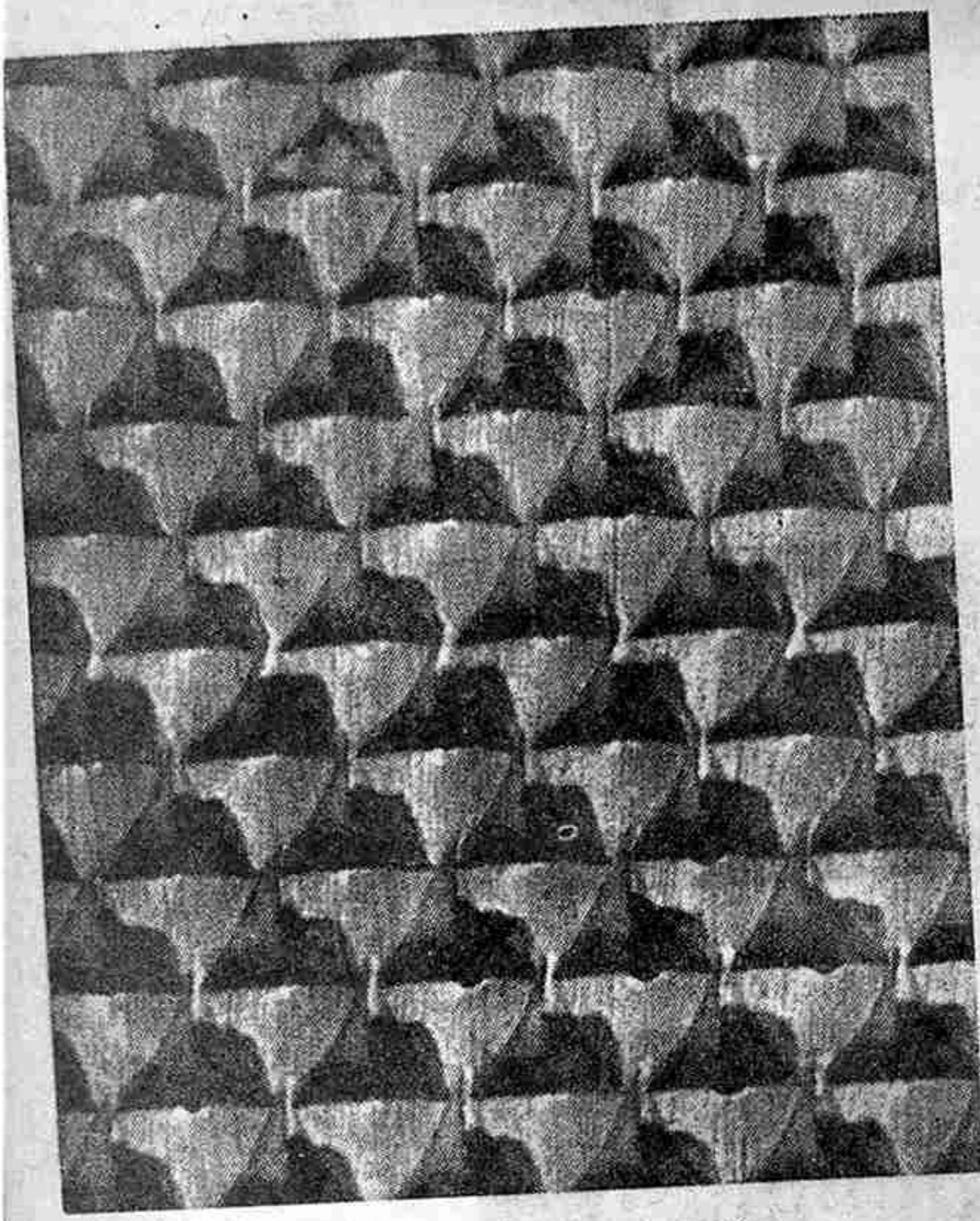

ہمارا فوٹو گرافر چنڈی گڑھ تو ضرور گیا تھا، مگر یہ وہاں کی جالیوں کی تصویر نہیں ہے۔ نہ ہی یہ جے پور کے ہوا محل کے جھروکے ہیں۔ یہ تو ایک ایسی چیز کا فوٹو ہے جو آپ کی سنگار میز پر ضرور ہونی چاہئے۔ سنگار میز کے علاوہ کہاں کہاں اس کا استعمال ہوتا ہے یہ اگر بتا دیا گیا تو آپ فوراً ہی پہچان جائیں گی۔ مزا تو جب ہے کہ بس اتنے ہی پتہ سے پہچانیں، اور بتائیں یہ کیا چیز ہے؟

اپنا جواب ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ دیجئے، اسی پوسٹ کارڈ پر اپنا نام اور پورا پتہ بھی لکھ دیجئے اور اس پتے پر بھیج دیجئے: فوٹو پہیلی نمبر ۶ ماہ نامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ۱۔ اس پوسٹ کارڈ پر پہیلی کے جواب اور اپنے، ہمارے نام پتوں کے علاوہ کچھ نہ لکھئے، ورنہ اس پر توجہ نہ دی جا سکے گی۔

۲۵ جنوری ۱۹۶۰ تک ہمیں ملنے والے جو صحیح جواب ہوں گے، انہیں بھیجنے والی بہنوں اور بھائیوں کے نام بانو فروری ۱۹۶۰ میں شائع کئے جائیں گے۔ ایک بہن یا ایک بھائی صرف ایک ہی جواب بھیج سکتے ہیں۔

فوٹو پہیلی نمبر ۶، ماہ نامہ **بانو**، آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ۱

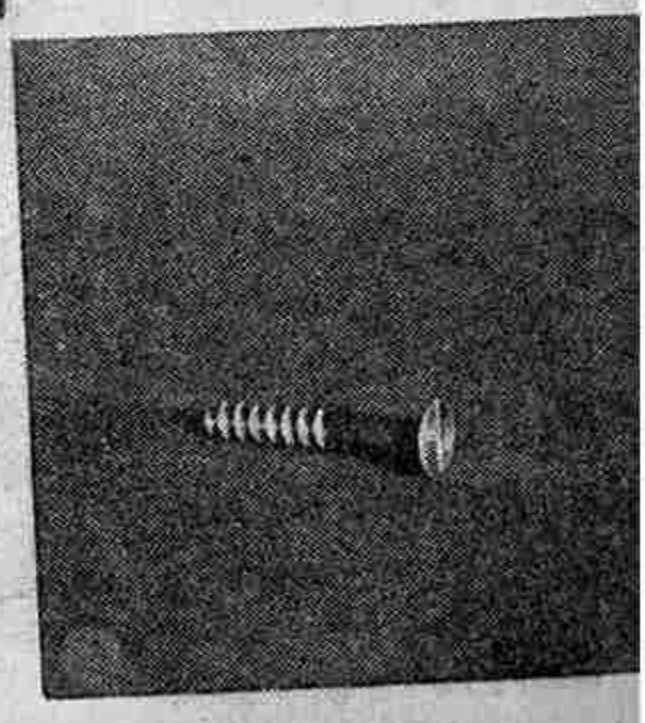

فوٹو پہیلی نمبر ۵ کا صحیح جواب ۱ پیچ

ننھے منّے

رضوانہ امین (عمر: ۲ سال ۴ ماہ)
بنت جناب محسن امین، ناگپور

مکہ ناہید (عمر: ۵ ماہ ۱۸ دن)
بنت: سید طاہر حسین تاج، حیدرآباد

سی، محمد حبیب اللہ عرف تحسین
ولد: سی، محمد یٰسین صاحب، کوئمبٹور

دُردانہ جمال (عمر: ۱۰ ماہ)
دختر جناب محمد لئیق، شاہجہانپور

سید رشید الزماں رضوی (عمر: ایک سال گیارہ ماہ)
ولد: سید علیم الدین رضوی، کلکتہ

عائشہ بیگم
بنت: جناب داؤد خاں، بمبئی

سید الطاف (عمر: ۱۰ ماہ)
ولد: سید ابراہیم، کلونہ

نجم شکیل (عمر: ساڑھے چار سال)
ولد: جناب عبدالوحید، کلکتہ

آپ بھی یہاں چھپنے کے لئے اپنے بچوں اور بہن بھائیوں کی تصویریں بھیج سکتی ہیں۔ بچے کی عمر ۵ سال سے زیادہ نہ ہو۔ تصویر ۴ انچ × ۳ انچ سائز پر چمک دار (GLOSSY) کاغذ پر کسی اچھے فوٹو گرافر سے کھنچوانی چاہیئے۔ ہر تصویر کی پشت پر بچے کا نام، عمر اور والدین کا نام و پتہ ضرور لکھا ہونا چاہیئے۔ پسند نہ آنے والی تصویریں واپس منگوانی ہوں تو، نئے پیسے کے ٹکٹ بھیجئے، ٹکٹ تصویروں کے ساتھ ہی آنے چاہئیں، بعد میں ٹکٹ بھیجنے بے کار ہوں گے۔ تصویریں اس پتہ پر بھیجئے: ننھے منے، ماہ نامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱

سید نجیب احمد رضوی (عمر: ۱۱ ماہ)
ولد: سید ابوالکلام رضوی، جمشید پور

چندر پرکاش (عمر ۱۳ ماہ)
ولد: جناب منگھارام پی۔ بیلانی، دہلی

ا حمد ندیم ہاشمی (عمر: ایک سال)
ولد: سید انوار الحسن ہاشمی، فتحپور

شکیل مہدی (عمر: ۱۱ ماہ)
فلف: جناب یس، یس ناصر مہدی، حیدرآباد

فیضی عزیز ہاشمی (عمر: ۳ سال)
ولد: جناب ایس عزیز ہاشمی وکیل، موتی باری (بہار)

محمد طیم (عمر: ۳ سال) انسر جہاں (عمر: ۱ سال)
ولد: جناب محمد حنیف، جھریا

دی۔ اختر باشاہ (عمر: ۷ ماہ)
ولد: جناب دی احمد باشاہ، دانمباڑی

آصف کبی (عمر: ۲ سال)
فرزند: محترمہ مسرت رعنا، حیدرآباد

بُننے کے بعد کاڑھئے!

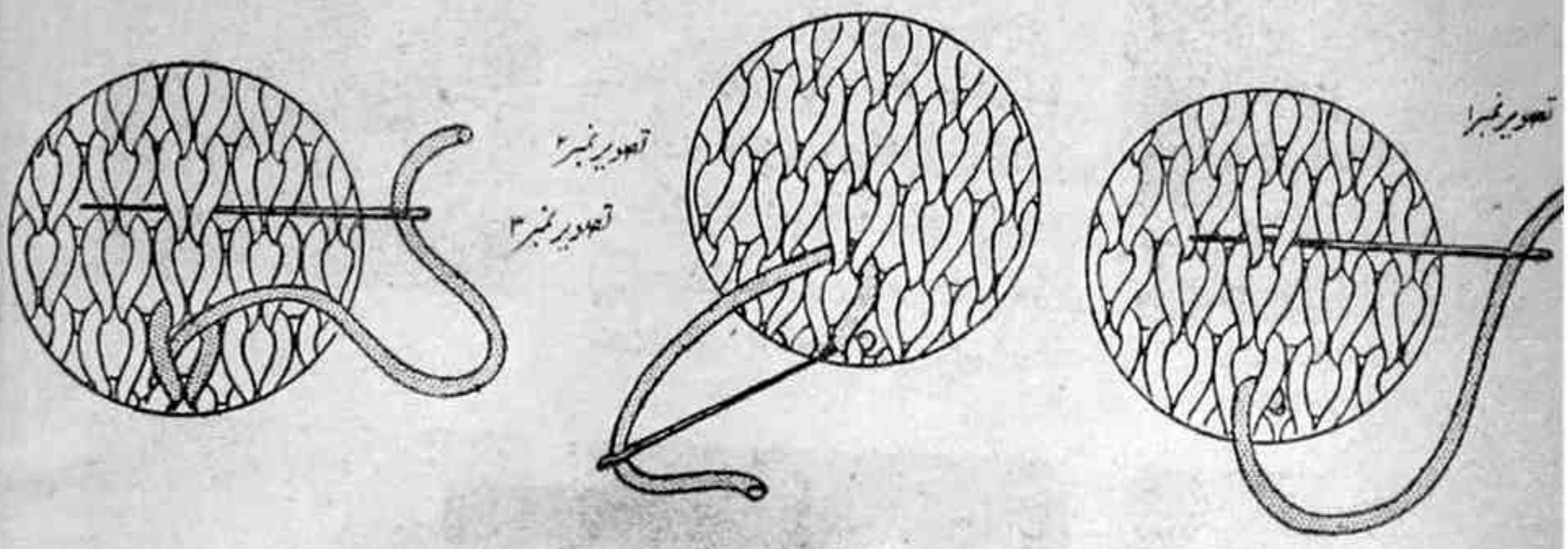

تصویر نمبر۱

تصویر نمبر۲

تصویر نمبر۳

اگر آپ نے دو سے زیادہ رنگوں میں کچھ بُننے کی کوشش کی ہوگی تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ کتنا مشکل کام ہے۔ چار یا پانچ رنگوں کے گولے ہر وقت لگائے رکھنا اور ان کو اُلجھنے سے بچانا ہی ایک مصیبت ہے، اور پھر رنگوں کو صحیح ترتیب سے ٹھیک موقع پر بُننا الگ توجہ چاہتا ہے۔

اسی لئے اب سادہ بُنائی پر دوسرے رنگوں سے کاڑھنے کا رواج بڑھتا جارہا ہے۔ کراس سٹچ کا کوئی بھی ڈیزائن چند ہی منٹوں میں سوئیٹر، بلاؤز یا کسی بھی بُنی ہوئی چیز پر آسانی سے کاڑھا جاسکتا ہے، جب کہ وہی ڈیزائن اگر بُنا جائے تو نہ صرف گھنٹوں بلکہ دنوں کا کام بن جائے، بلکہ اُلٹی طرف رنگ برنگ کے ڈورے بھی لٹکے رہیں اور اون بھی زیادہ خرچ ہو۔ بُنائی پر کڑھائی کے اس طریقے کو سوئس کڑھائی کہتے ہیں۔ اسی طریقے کا دوسرا نام ڈپلیکیٹ سٹچ (دوہرا ٹانکا) بھی ہے۔

سوئس کڑھائی انتہائی آسان ہے۔ کوئی بھی سیدھا سیدھا بنا ہوا کام لیجئے۔ اسے غور سے دیکھئے تو اس میں سیدھی سیدھی زنجیر نما کڑیوں کی سیدھی قطاریں نظر آئیں گی۔ آپ کو جس رنگ سے کاڑھنا ہو، اس رنگ کا اون ایک کُند نوک والی موٹی سُوئی میں پرو لیں، اور اس زنجیر کے گھروں پر اس نئے اُون سے دوہراتی جائیں۔ اگر صفائی سے کاڑھا جائے تو ایک نظر میں یہ پہچاننا مشکل ہوتا ہے کہ پھول یا ڈیزائن بناوٹ میں نہیں ہے بلکہ اوپر سے کاڑھا گیا ہے۔ تصویر نمبر ۱، ۲ اور ۳ میں کڑھائی کا طریقہ صفائی سے سمجھایا گیا ہے۔

سوئس کڑھائی میں بُناوٹ کی زنجیر پر نیچے سے اوپر کی طرف چلنا سب سے آسان رہتا ہے۔ لیکن کوئی خاص ڈیزائن کاڑھنے میں آڑی قطاروں میں بھی کاڑھا جاسکتا ہے۔

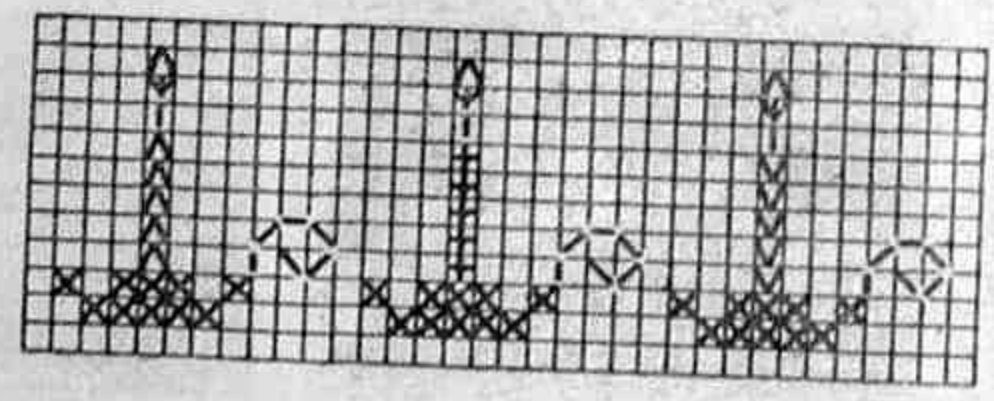

شمع بارڈر

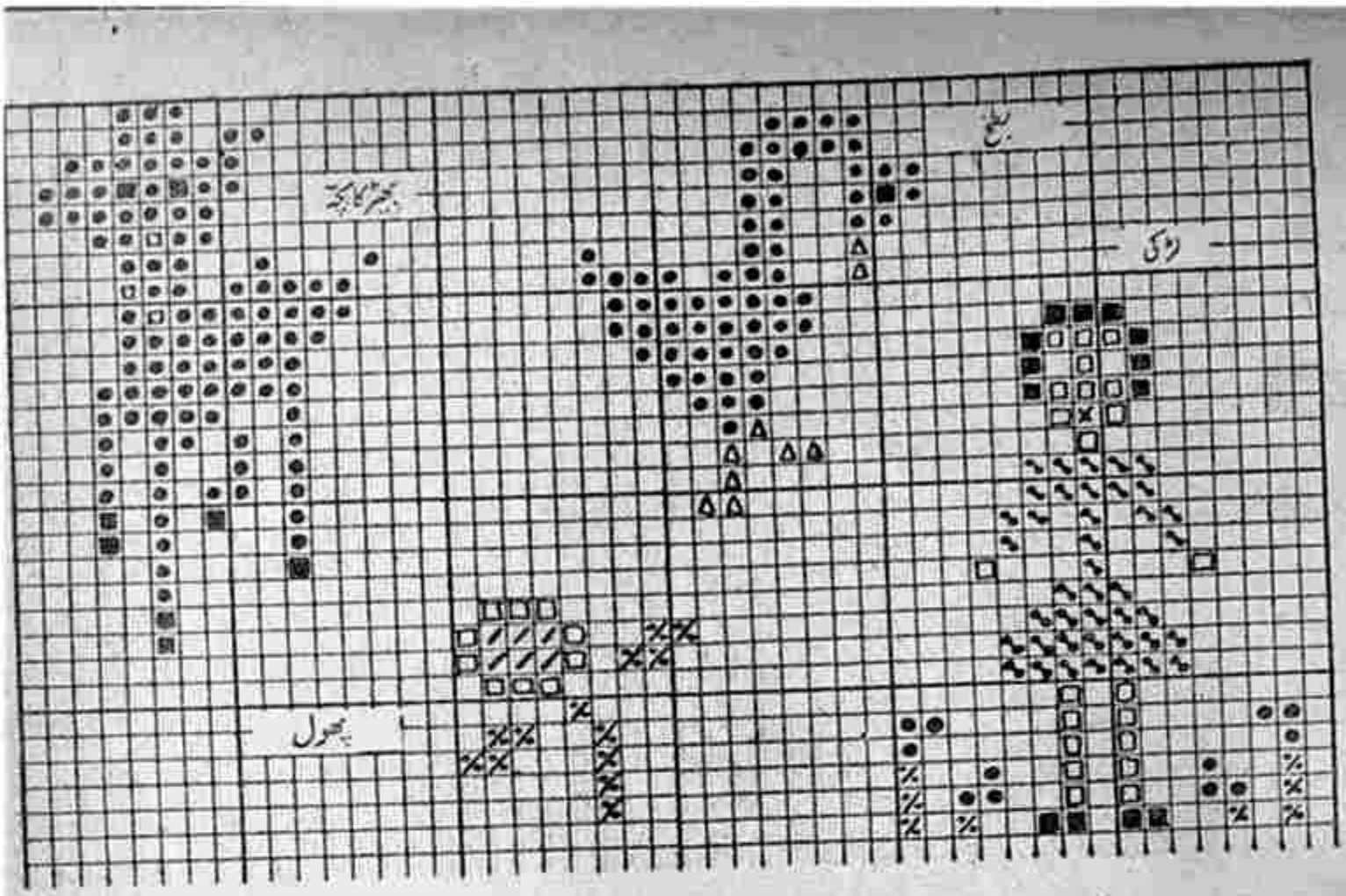

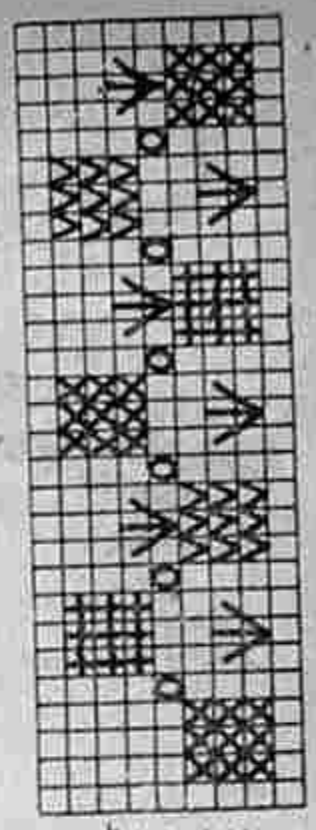
پھول دار بارڈر

کراس سٹچ کے کچھ آسان ڈیزائن جو آسانی سے سوئیٹروں پر کاڑھے جا سکتے ہیں:

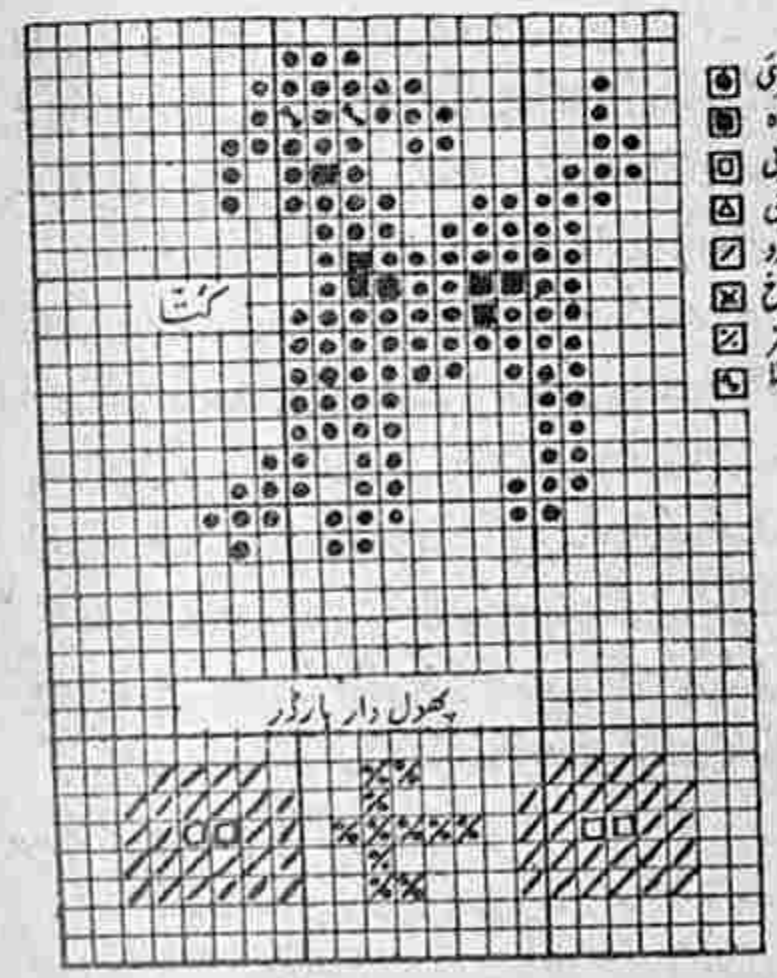

سفید یا سرمئی
سیاہ
گلابی
نارنجی
زرد
سُرخ
سبز
نیلا

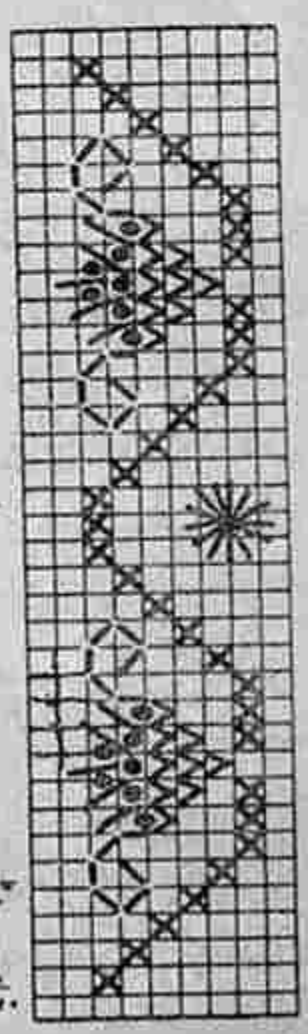
خوبصورت بارڈر

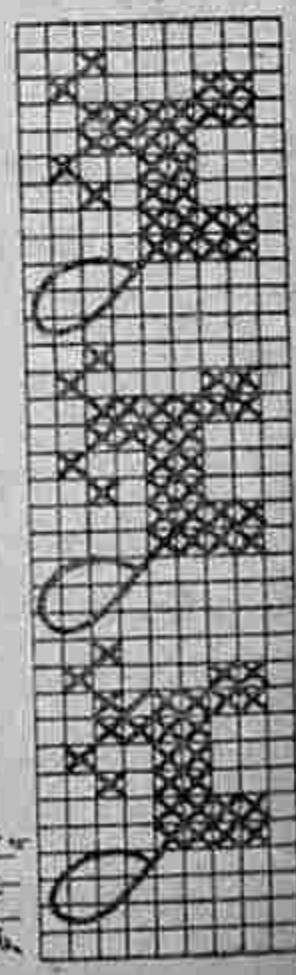
پھول دار بارڈر

میری اور مارگریٹ

ایک آغاز اور ایک انجام

شہزادی مارگریٹ کا ناکام محبوب پیٹر ٹاؤن سینڈ اور اس کی بیوی میری لوئی جیسن

۲۱ دسمبر ۱۹۵۹ دنیا بھر کے رومان پسندوں کے لئے خاصی اہمیت کا دن رہا۔ اس روز ایک نہیں، بلکہ دو عالمی رومانی ڈرامے ایک لحاظ سے پایۂ اختتام تک پہنچ گئے۔

یہ تقدیر ساز دن فرح دیبا اور شاہ ایران کی شادی کے لئے تو دنیا بھر میں مشہور ہوا ہی ہے، لیکن اسی روز ایک اور خبر آئی جس نے یورپ بھر میں اور خصوصاً کئی انگریز گھرانوں میں تہلکہ مچا دیا۔ خبر محض یہ ہے کہ "شہزادی مارگریٹ کے ناکام محبوب گروپ کیپٹن ٹاؤن سینڈ نے اپنی سکریٹری میری لوئی جیسن ایک اکیس سالہ بلجیین حسینہ سے ایک سادہ سی تقریب میں شادی کرلی۔"

شادی بیاہ ہر ایک کا ذاتی معاملہ ہے اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پر اس قدر ہنگامہ کیوں ہوتا اور اس سے اتنی دلچسپی کیوں لی جاتی ہے۔ لیکن اس شادی کے پیچھے "حسن، عشق اور رقابت کی ازلی مثلث کے تکرار اور تضاد کی جو داستان پوشیدہ ہے وہ برسوں گزرنے کے بعد بھی آج تک ذہنوں میں تازہ رہی ہے اور دنیا بھر کے عوام، خصوصاً نوجوان اس میں حصہ لینے والے اداکاروں کے ایک ایک قدم اور ایک ایک عمل کا حساب کتاب رکھتے رہے ہیں۔ چار برس پہلے برطانیہ کی شہزادی مارگریٹ نے کلیسا کے دباؤ اور اپنی کمزور طبیعت سے مجبور ہو کر ٹاؤن سینڈ کی محبت سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ کھلنڈرے گروپ کیپٹن نے اُس وقت محض اتنا ہی کہا تھا کہ "جہاں تک شادی بیاہ اور محبت کا تعلق ہے مستقبل میرے لئے بے معنی ہو چکا ہے۔"

لیکن اسی وقت بلجیم کے ایک ہائی اسکول میں ایک تیز اور شوخ طالبہ نے اسے اپنا دل دینے کا فیصلہ کرلیا۔ میری کا کہنا ہے کہ میں نے اسی وقت یہ فیصلہ کرلیا کہ ٹاؤن سینڈ کو میں اپنی محبت پیش کروں گی تاکہ مارگریٹ کی بے وفائی کا غم اس کے دل سے دُور ہو سکے۔

یہ ایک لمبی داستان ہے کہ اُسے ٹاؤن سینڈ کے دل تک پہنچنے کے لئے کیا کیا کرنا پڑا۔ ٹاؤن سینڈ جب بلجیم کے برطانوی سفارت خانے میں بطور ہوائی فوج کے نگران آتاشی کی حیثیت سے تبدیل ہو کر آیا تو میری نے کئی طریقوں سے اس سے واقفیت پیدا کرنا چاہی۔ اس میں اسے آسانی اس لئے ہو گئی کہ اس کا ایک قریبی رشتہ دار پیٹر کا بھی اچھا دوست تھا۔

اس کے بعد اس نے اسکول چھوڑا اور فوٹو گرافی سیکھنا شروع کی۔ اِدھر ٹاؤن سینڈ نے بھی نوکری چھوڑ کر صحافت اپنانے کا اعلان کر دیا، اور میری اس کے ساتھ بطور اس کی سکریٹری کے شریک ہو گئی۔ دونوں نے دنیا کا سفر کیا۔ میری نے تصویریں کھینچیں اور پیٹر نے مضامین لکھے، لیکن پیٹر کی جانب سے بات نہ بڑھی۔ شاید اس لئے کہ مارگریٹ کی محبت کا شعلہ ابھی اس کے دل میں تازہ تھا۔ لیکن اِدھر پیٹر کے ایک دوست نے ٹاؤن سینڈ پر ایک کتاب لکھی جس میں پیٹر نے اسے چند ایسی باتیں بتائیں جو مارگریٹ کو سخت ناگوار گزریں۔ پچھلے برس اسی سلسلے میں پیٹر اور مارگریٹ کی ایک دوبارہ ملاقات ہوئی۔ لیکن چند ہی منٹوں بعد دونوں کو پتہ چل گیا کہ شاید وہ ان دونوں کی آخری ملاقات ہو گی کیوں کہ بقول پیٹر "مارگریٹ اس قدر بدل چکی تھی کہ وہ ایک حساس عورت کم اور گنگم پلیس کو آرائش بخشنے والی ایک گڑیا زیادہ معلوم ہوتی تھی۔"

اس مرتبہ جب ٹاؤن سینڈ واپس بلجیم آیا تو خود بخود اس کے دل میں میری کی محبت کے لئے

جگہ پیدا ہو گئی اور دونوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔

اِس شادی میں کچھ عملی دشواریاں بھی تھیں۔ مثلاً دونوں کی عمر میں ڈیڑھ سے بھی کچھ زیادہ فرق ہے۔ میتری بھی کیتھولک کلیسا سے تعلق رکھتی ہے جو طلاق کو تسلیم نہیں کرتا اور طلاق شدہ شخص سے شادی کو ناجائز سمجھتا ہے اور کہتے ہیں کہ میتری کے خاندان کو بھی یہ رشتہ زیادہ پسند نہ تھا۔ لیکن اگر پیٹر طلاق شدہ نہ ہوتا تو میری کی محبت اس کو کبھی مل ہی نہ سکتی، کیوں کہ پیٹر اور شہزادی مارگریٹ کی شادی میں رکاوٹ بس یہی تھی کہ پیٹر طلاق شدہ ہے، اور طلاق شدہ انسان سے شادی برطانیہ کے شاہی خاندان کے کسی فرد کو زیب نہیں دیتی۔ یہ الگ بات ہے، کہ مارگریٹ کے تایا، سابق شہنشاہِ انگلستان ایڈورڈ ہشتم نے ایک طلاق شدہ عورت مسز سمپسن سے شادی کی خاطر انگلستان کے تخت کو ٹھکرا دیا تھا۔ مارگریٹ اپنے آپ میں یہ ہمت نہ پیدا کر سکی کہ شاہی رسم و رواج کو ٹھکرا کر اپنے محبوب سے شادی کر لیتی۔

میتری کی ایک قریب ترین سہیلی کا کہنا ہے کہ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ "میں کوئی مارگریٹ نہیں جو اپنی راہ سے پیچھے ہٹ جاؤں۔ میرے خیال میں سب سے بڑی عبادت ایک نیک اور پاک محبت ہے اور کلیسا اگر اس کی راہ میں حائل ہونا چاہتا ہے تو مجھے مجبوراً اپنی ہی راہ اپنانا پڑے گی کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ خدا اور سچے کلیسا کی خوشنودی کی راہ یہی ہو سکتی ہے۔"

اس خبر سے مارگریٹ کا ردِ عمل زیادہ تو پتہ نہیں چل سکا لیکن قریبی حلقوں کا کہنا اتنا ضرور ہے کہ شہزادی اب کافی اُداس رہتی ہے۔ وہ عرصے سے کسی بڑی رقص پارٹی میں نہیں گئی۔ کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ آج کل شہزادی کو یہ گیت بھی بہت پسند ہے کہ "پرانے شعلے تازہ ہیں آج بھی۔ لیکن اب ان میں روشنی نہیں، گرمی نہیں۔"

شادی بہت سادہ ڈھنگ سے ہوئی جس میں دُلہا دُلہن کے قریب ترین عزیز اور دوست ہی شریک تھے۔ شادی کے بعد یہ لوگ بلجیم ہی کے کسی دیہاتی علاقے میں زندگی گزارنے کا ارادہ رکھتے ہیں، جہاں وہ زراعت کریں گے اور پیٹر ٹاؤن سینڈ اپنے عالمی سفر کے متعلق کچھ مفید تاثرات کو دو کتابوں کی صورت میں پیش کر سکے گا۔ ●●

دو حسین جُوڑے

یہ دو ہرا جُوڑا بنانے کے لئے پیچھے بالوں کو دو حصّوں میں تقسیم کر لیجئے۔

ایک تہائی بال اوپر کی اٹ میں اور دو تہائی بال نیچے کی اٹ میں۔ پہلے نیچے کے بالوں کا جُوڑا بنائیے اور اس پر تار پھولوں کی ڈنڈی لگا لیجئے۔ اس کے بعد اوپر کے ایک تہائی بالوں کو پہلے جُوڑے کے گرد لپیٹ کر اوپر کا حصّہ نکل کر لیجئے اور اس کے گرد ڈنڈی لگا لیجئے۔ اب پہلے نیچے کی ڈنڈی کو اور بعد میں اوپر کی ڈنڈی کو پنوں سے اٹکا لیجئے۔

عام طور پر جُوڑا یا اس پر لگی ہوئی ڈنڈی سامنے کی طرف سے نہیں دکھائی دیتی، لیکن انگریزی کے ہندسے 8 کی طرح بننے والے اس جُوڑے کی ڈنڈی سامنے سے بھی خوشنما دکھائی دیتی ہے۔ بالوں کو دو برابر کے حصّوں میں تقسیم کر لیجئے۔ اوپر کا جُوڑا سر کے ذرا بائیں کو بنائیے، اور نیچے کا جُوڑا سر کے ذرا دائیں طرف کو۔ اس کے بعد پنوں سے ڈنڈیاں لگا لیجئے۔ ■

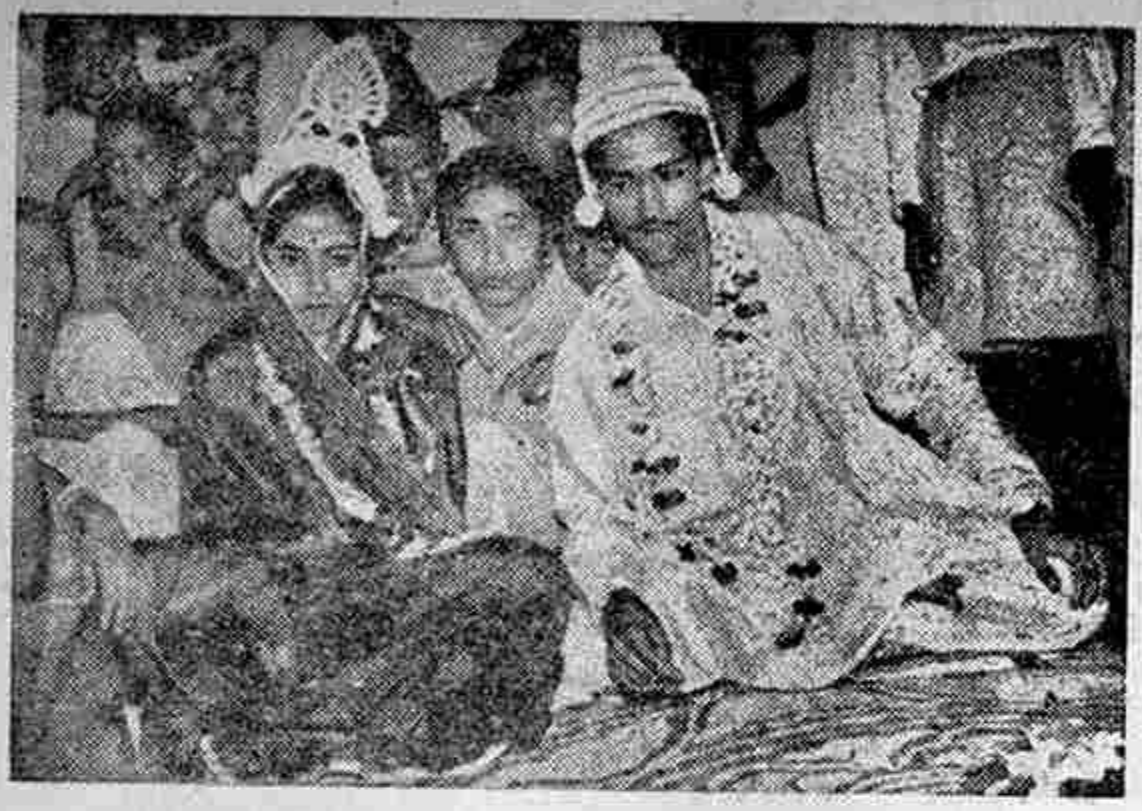

ایک سرکاری شادی

دوربین آپا کے قلم سے

دوربین آپا کی نگاہ غوطہ مار ہے دیس بدیس کی خبروں اور باتوں کا ان کے پاس ذخیرہ ہے وہ اپنے اور آپ کے مطلب کی خبریں اسی ڈھیر میں ڈبکی لگا کر نکال لیتی ہیں۔ اس مرتبہ جو خبریں اس ڈھیر میں سے نکلی ہیں ان کا بھنڈار یہ رہا:

دیس بدیس کی بات

اپنا دیس ——— لائق اور نالائق

کوئی کالج اور کوئی یونیورسٹی ایسی مشکل ہی سے ملے گی جس میں ہنگامہ اور شور و غل نہ ہوتا ہو۔ طلباء میں ڈسپلن کی کمی کی شکایت آج کل بڑے بوڑھوں سب ہی کو ہے۔ لیکن اس معاملے میں صنف "نازک" اور صنف "سخت" میں فرق بہت نمایاں ہو چکا ہے۔ وزیر تعلیم شری شریمالی نے لوک سبھا کو بتایا کہ جہاں مردانہ کالجوں میں ڈسپلن شکنی اور شرارت کی وارداتیں روز افزوں زوروں پر ہیں وہاں زنانہ کالجوں میں مکمل امن و امان ہے۔ اس کی وجہ شائد یہ ہے کہ لڑکیوں کو اُس ہنگامے سے کوئی دلچسپی نہیں جو لڑکوں کا طرۂ امتیاز بن چکا ہے۔ اس پر ایک تجویز یہ بھی پیش ہوئی کہ لڑکے لڑکیوں کے اکٹھے کالجوں کو زیادہ بڑھا دیا جائے کیوں کہ جن علاقوں میں (کیرالا، بمبئی، مدراس، بنگال اور پنجاب) لڑکیوں کی تعلیم عام ہو چکی ہے وہاں مخلوط کالجوں میں لڑکیاں کافی تعداد میں ہوں گی اور اس طرح لڑکوں پر ایک اچھا اثر قائم رہے گا۔ لیکن ایک دوسرا خیال یہ بھی تھا کہ اس کی بدولت لڑکیوں میں بھی ہلڑ مچانے جماعتوں سے غیر حاضر رہنے سینماؤں پر ہنگامہ کرنے اور اسی طرح کے دوسرے مشاغل آزمانے کا مرض پیدا ہو جائیگا اور لڑکے خود تو ڈوبیں ہی گے لیکن صنم کو بھی لے ڈوبیں گے۔ کہئے آپ کا کیا خیال ہے؟

فرانسکو غزولی "اب مان بھی جاؤ"

انگیلا منوونی "نہ میں نہ مانوں"

اسی ضمن میں زنانہ تعلیم کی مشاورتی کمیٹی کی صدر شریمتی درگا بائی دیش مکھ کا یہ بیان بھی قابل غور ہے کہ پچھلے چند برسوں میں لڑکیوں نے تعلیم میں لڑکوں کو بُری طرح مات دینا شروع کر دی ہے۔ انہوں نے دہلی پنجاب، لکھنؤ، الہ آباد، بمبئی، ناگپور اور مدراس یونیورسٹیوں کے اعداد و شمار کے دیکھنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ۱۹۵۸ ——— ۱۹۵۹ کے سال میں کل امتحانات میں تقریباً ساڑھے سات لاکھ امیدوار شریک ہوئے۔ ان میں سے سوا پانچ لاکھ کامیاب ہوئے اور سوا دو لاکھ ناکام۔ ناکام ہونے والوں میں لڑکیوں کی تعداد محض چھبیس ہزار تھی حالانکہ امتحانات میں شامل

ہونے والی طالبات کی تعداد ساڑھے سات لاکھ میں سے دو لاکھ تھی۔ گویا جہاں لڑکے ساڑھے پانچ لاکھ میں سے تقریباً دو لاکھ فیل ہوئے وہاں لڑکیاں دو لاکھ میں سے محض چھبیس ہزار ناکام رہیں۔

لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہونے والی لڑکیوں کی تعداد میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جہاں پہلے لڑکوں کے مقابلے میں شاذ و نادر ہوتی تھی اب اپنی یونیورسٹیوں میں ساٹھ اور چالیس فی صدی لڑکیوں اور لڑکوں کا باترتیب تناسب بیٹھتا ہے۔ ہاں فرسٹ پوزیشن میں کامیاب ہونے والے لڑکوں کی تعداد اب بھی لڑکیوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہے۔ یہاں پر یہ پچپن فیصدی لڑکوں اور پینتیس فی صدی لڑکیوں کا ہو جاتا ہے۔ لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کبھی کتنے دنوں کی بات ہے۔

شور و غل کی برکت

وہ شور و غل جس سے بچوں کے ابا اتنے پریشان ہوتے تھے۔ اب کام کی چیز بننے لگا ہے اپنے ہی دیس کے ایک سائنس داں ایم لکشمن نے کہا ہے کہ بجلی پیدا کرنے کے لئے بڑے بڑے ڈیم بنانے اور آبشار گرانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ گھر کے معمولی استعمال کی بجلی تو انسانی شور و غل سے بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ جہاں پر بہت زیادہ شور و غل ہو رہا ہو وہاں ایک ایسا آلہ لگا دیا جائے جو شور کی لہروں کو اپنے میں جذب کر لے اور پھر اسی طاقت کو بجلی کی لہروں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ عالمی سائنسدانوں نے لکشمن کے اس دعوے کو قابل عمل بھی جانا ہے۔ اس لئے وہ اس پر خاصی شدت سے تحقیق بھی کر رہے ہیں لیکن ایک سوال یہ ہے کہ شور و غل کے لئے بہترین مقام کونسا رہے گا۔ عورتیں بھنگڑ خانہ یا کافی ہاؤس کا نام لے دیں گی اور مرد کسی بھی زنانہ محفل سے یہ کام لینے کی تجویز پیش کر سکتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کون بازی لے جاتا ہے؟

سچّا سودا

ڈیرہ بابا نانک ہند پاک سرحد پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہاں پر ایک بڑھیا کو پچھلے دنوں ایک دلچسپ تجربہ ہوا۔ اس کی کوٹھڑی جس میں وہ برسوں سے اکیلی رہتی تھی چوہوں سے بھری پڑی تھی۔ ایک روز اس نے دیکھا ایک موٹا سا چوہا آیا اور اس کی ایک پرانی سی ٹوکری میں دھرا ایک روپیہ اٹھا کر غائب ہو گیا۔ بڑھیا چلاتی رہی لیکن چوہے کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اور بڑی بی اپنے اکلوتے روپے سے محروم ہو چکی تھی۔ وہ رات بیچاری نے رو رو کر گذار دی اگلے روز کوئی پڑوسن آئی اور اُسے روٹیاں اور دال دے گئی۔ بڑھیا نے یہ سب کچھ اُسی ٹوکری میں پٹک دیا۔ اور دروازہ بند کر کے ذرا باہر چلی گئی۔ واپس لوٹی تو اس نے دیکھا کہ دو میں سے ایک روٹی تو غائب تھی لیکن وہ روپے کا نوٹ صحیح و سالم واپس اُسی ٹوکری میں پڑا تھا۔ چوہا آخر انسان کے مقابلے میں بیوقوف ثابت ہوا جو ایک روٹی کی قیمت ایک روپیہ دے گیا۔

سرکاری سمدھی

لیجئے اب تک حکومت کئی کام کرتی آئی تھی۔ لیکن ایک کام جو ہماری کیا کسی بھی حکومت نے نہیں کیا تھا وہ تھا شادی بیاہ کے کاروبار میں حصہ لینا۔ لیکن اب یوپی سرکار نے یہ دھندا بھی شروع کر دیا ہے اور آثار بتاتے ہیں کہ کم از کم اس معاملے میں تو وہ خاصی کامیاب رہی ہے۔ ہوا یوں کہ سات برس پہلے لکھنؤ میں مشرقی بنگال سے آنے والی "پناہ گزین" لڑکیوں کے لئے ایک مرکز کھولا گیا جس میں انہیں اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہونے کی تربیت دی جا سکے۔

یہاں پر یہ محسوس کیا گیا کہ تربیت اور تعلیم کے بعد بھی عورت کی شخصیت اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ اسے زندگی کا مستقل سہارا نہ مل جائے چنانچہ ان میں سے قابل شادی لڑکیوں کے لئے بر ڈھونڈے گئے۔ بالکل اُسی طرح جیسے بڑی بوڑھیاں لڑکوں میں مین میخ نکالتی ہیں اسی طرح یہاں پر کیڑے ڈالے گئے۔ بہت ہی طویل انٹرویو کے بعد امیدوار منظور کیا جاتا ہے جس کے لئے صحت مند، برسر روزگار اور چال چلن کا شریف ہونا ضروری ہے اور سرکار تو اس سب کچھ کا نائین کی معرفت نہیں بلکہ اپنی سی۔ آئی۔ ڈی کی معرفت ہی پتہ کروا سکتی ہے۔ بلکہ ایک مذاق بھی یہی ہوا کہ ایک نوجوان کلرک کے گھر سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمی پوچھ تاچھ کرتے ہوئے پہونچ گئے۔ گھر کے بڑے بوڑھوں میں کہرام مچ گیا کہ پولس والے لوگ کیوں آئے تھے پتہ کرنے۔ اڑوس پڑوس میں بھی سرگوشیاں ہوئیں کہ لڑکا تو اچھا خاصہ تھا تو پھر نگوڑی سی۔ آئی۔ ڈی۔ پتہ کرنے کیوں آئی تھی؟ پتہ چلا کہ صاحبزادے شادی کرنے والے ہیں؟ دلہن گھر آ گئی تو پتہ چلا کہ بڑے گھر میں پیغام بھیجنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔

بہر حال اس تفتیش کے بعد لڑکے صاحب کی پیشی ہونے والی دلہن کے حضور میں ہوتی ہے۔ وہاں سے بھی منظور ہونے پر شادی طے ہو جاتی ہے اور کیمپ کا سپرنٹنڈنٹ دلہن کے والد کے فرائض ادا کر دیتا ہے۔ دلہن شادی کے بعد اپنے "مائیکے" بھی آتی ہیں اور اب تک چھتیس شادیوں میں تقریباً سب ہی خوش نظر آتی ہیں۔ اسی کیمپ کی شادی کی دیکھا دیکھی ایک دوسرا تجربہ کرنے کا اعلان بھی ہوا تھا۔ حکومت نے قیدی عورتوں کی شادی کا اشتہار بھی دیا تھا۔ مانئے یا نہ مانئے اس لڑکوں کے کال کے زمانے میں بھی ساڑھے تین سو درخواستیں یا پیغام ان بدنصیبوں سے شادی کرنے

کے لئے بھی آ گئے۔ لیکن اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کئی عملی مشکلوں کی بناء پر یہ اسکیم فی الحال ملتوی کر دی گئی ہے۔

ایران ـــــ مزاج پرسی

ایران اور عراق کی سرحد کے قریب ایک مشہور شہر کرمان شاہ ہے۔ پچھلے دنوں یہاں پر ایک بڑھیا (عمر ایک سو نو ۱۰۹ سال) تبریز سے یعنی تقریباً تیرہ سو میل کا فاصلہ بسوں اور ریل گاڑیوں میں طے کرتی ہوئی پہونچی۔ وہاں پر اس نے اپنی بیٹی کا وہ گھر ڈھونڈھا جہاں پر وہ ۶۵ برس پہلے اپنی بیٹی اور داماد کے پاس آئی تھی۔ وہاں پر تو خیر بڑی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ لیکن بڑھیا کو اپنی بیٹی کا گھر مل ہی گیا۔

پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ یہاں پر اس لئے آئی ہے کہ اسے پتہ چلا تھا کہ اس کی بیٹی اور اس کے دونوں نواسے اکثر بیمار رہتے ہیں۔ اس لئے اس نے سوچا کہ ان دونوں ذرا "بچوں کی دیکھ بھال ہی کر لے کیوں کہ یہ موسم بھی اکثر خراب رہتا ہے"۔ اس کی بیچاری "معصوم سی بچی" کی عمر محض پچاسی ۸۵ برس اور بیچارے ننھے نواسے ابھی باسٹھ اور تریسٹھ برس ہی کے ہیں۔ لیکن بڑھیا مادام شیریں کہکشانی کے خیال میں آج کل ہوا ہی ایسی چلی ہے کہ بس جوان جہاں ہی بوڑھے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ورنہ اسے دیکھو جو اس عمر میں بھی پورے گھریلو کام کاج کے علاوہ پانچ پانچ سات سات میل پیدل چل لیتی ہے۔

عراق ـــ زحمت یا رحمت؟

اپنے اپنے نصیبوں اور اپنے اپنے دیس کی بات ہے جہاں ہمارے ہاں اور اپنی ہی طرح کے دوسرے ملکوں (مثلاً پاکستان، چین، مصر، انڈونیشیا اور ملایا وغیرہ) میں خاندانی منصوبہ بندی کی بات ہوتی ہے وہاں کئی ملک ایسے بھی ہیں جہاں ابھی تک یہ مسئلہ موجود ہے کہ جگہ زیادہ اور آدمی کم ہیں۔ اس لئے ملک کے ذرائع کے بہترین استعمال کے لئے زیادہ آدمیوں کی ضرورت ہے۔ عراق بھی ایک ایسا ہی ملک ہے۔ یہاں پر پچھلے دنوں ہوٹل کے ایک بیرے نصیر اور اس کی بیوی نعیمہ کو اس بات پر تقریباً چھبیس سو روپے انعام میں دیئے گئے کہ ان کے ہاں پندرھواں بچہ پیدا ہوا جس میں سے بارہ بچے ابھی زندہ ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں ساڑھے سات سو روپیہ ماہانہ کی پنشن بھی ملے گی۔ ہر برس دس ایسے جوڑوں کو یہ انعامات اور پنشن دیا جایا کریں گی جس کے بچے عراق بھر میں سب سے زیادہ ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر آبادی کی اتنی ہی کمی ہے تو کیا آس پاس کے عرب ملکوں کے عرب باشندے وہاں آباد نہیں کئے جا سکتے جن کا رہن سہن بول چال اور سب ہی کچھ ایک جیسا ہے۔ لیکن ایک دوسری اطلاع ہے کہ اس حوصلہ افزائی کے بعد بھی شہروں یعنی بغداد اور بصرہ وغیرہ میں یہ تحریک کامیاب نہیں ہو پائی۔ البتہ دیہات میں بڑے کنبے اور بھی بڑے ہوتے جا رہے ہیں۔

مصر ـــ شہزادی بنام سیکرٹری

مصر کے شاہ فاروق کے خلاف ایک بغاوت اس کی رعایا نے کی تھی جسے آپ سب ہی جانتی ہی ہوں گی۔ لیکن اب ایک اور بغاوت اُسی کی بیٹی شہزادی فیرئیل نے کی ہے۔ فاروق آج کل اٹلی کے کئی مشہور جوا خانوں کا مالک اور قمار بازوں کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے پاس اس وقت بھی اتنا پیسہ ہے کہ پشتوں تک اسی طرح خرچ ہوتا رہے تو ختم نہ ہو۔ لیکن اس کی انیس سالہ بیٹی فیرئیل (جو شاہ ایران کی بہن فریدہ کے بطن سے ہے) کچھ دوسری طرح سوچتی ہے۔ اس نے اپنے باپ کی بادشاہت کا حشر دیکھ کر جلاوطنی میں بھی یہ مصنوعی زندگی گذارنے سے انکار کر دیا۔ اور اپنے پیروں پر آپ کھڑی ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس لئے اس نے اپنے باپ سے اجازت طلب کی کہ وہ سوئٹزرلینڈ میں ایک مشہور اسکول میں ٹائپ، شارٹ ہینڈ اور ترجمان کی ٹریننگ حاصل کرے جو اعلیٰ قسم کی سیکرٹریوں کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ باپ نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ بادشاہوں کی بیٹیوں کے لچھن یہ نہیں ہوتے۔ وہ آرٹ موسیقی اور رقص وغیرہ کی ٹریننگ چاہے تو لے سکتی ہے لیکن اس کام سے اسے پرے ہی رہنا چاہئے۔

لیکن فیرئیل اپنے باپ کے فرمان کو رد کرتی ہوئی سوئٹزرلینڈ پہونچ گئی۔ وہاں پر اُس اسکول والوں کو جب اس کے ارادوں اور مشکل کا علم ہوا تو انہوں نے نہ صرف اسے داخل کر لیا بلکہ ایک معقول وظیفہ بھی اسے دے دیا۔ اب ایک برس کی تربیت کے بعد وہ اپنی نصف تربیت ختم کر چکی ہے اور اس امتحان میں بہت اچھی طرح سے کامیاب رہی۔

اب یہ سنا گیا ہے کہ فاروق بھی اس کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہتا اور اس نے کہا ہے کہ اگر وہ واپس اس کے پاس آنے کا وعدہ کرے تو وہ اسے شہزادیوں ایسا خرچ بھیجنا شروع کر دے گا۔ لیکن فیرئیل کا ابھی تک یہی کہنا ہے کہ وہ اس دولت پر بھروسہ نہیں کرے گی۔ اور ابھی تک خیر اس کی ناراضگی دور ہی نہیں ہوئی لیکن اگر ہو بھی گئی اور اپنے باپ سے اس کے تعلقات اچھے ہو بھی گئے تو بھی وہ اس سے ایک پیسہ بھی قبول نہیں کرے گی۔

اٹلی ـــ کہتے ہیں جس کو عشق....

آج سے پچیس برس پہلے کی بات ہے کہ اٹلی کے شہر فلورنس میں ایک اچھے

چلتے ہوئے ریستوران کے چوبیس سالہ نوجوان مالک نے سنہرے بالوں والی ایک سولہ سالہ لڑکی کو دیکھا جو دریا کے سامنے کنارے پر کھڑی اپنی سہیلیوں سے مچل مچل کر بات چیت کر رہی تھی۔ بس محبت کا دیوتا کیوپڈ اپنا کام کر گیا اور نوجوان فرانسکو غزدونی اس الہڑ سی دوشیزہ انگیلا منودنی کو بری طرح سے دل دے بیٹھا پتہ لگانے پر اسے معلوم ہوا کہ اس کی محبوب اس کے قریبی محلے ہی میں رہتی ہے جو عین دریا پار ہے۔ اس نے یہ دستور بنالیا کہ ہر روز دوسرے کنارے پر پہونچے اور دنیا بھر کے تحفے تحائف لے جائے اور انگیلا سے کسی نہ کسی طرح "اتفاقیہ" ملاقات کرے۔ لیکن انگیلا نے نہ تو اس کے تحفے منظور کئے اور نہ ہی دوستانہ سطح پر اس سے کبھی بات کرنا گوارا کیا۔ فرانسکو بیچارے نے اس کے والدین سے رجوع کیا۔ والدین نے دیکھا لڑکا اچھا خاصا ہے ان کے خاندان سے کہیں امیر ہے۔ اچھی صحت رکھتا ہے۔ چال چلن بھی شریف ہے لیکن وہ بھی کیا کرتے جب لڑکی رضامند ہی نہ ہوتی تھی۔

مانئے یا نہ مانئے فرانسکو کی یہ تگ و دو پورے پچیس برسوں تک جاری رہی۔ جنگ کے زمانے میں دریا کا پل ٹوٹ گیا تو فرانسکو کشتی پر اسے دیکھنے جاتا لیکن اس سنگ دل کا یہ عالم تھا کہ ایک روز اس نے اپنے ٹٹوے میں پتھر بھر لئے اور جب فرانسکو کی کشتی قریب آئی تو اسے پتھر مارے جس میں سے ایک نے اسے قریب قریب کانا بھی کر دیا۔ اس روز تو وہ لہولہان ہو کر واپس چلا گیا۔ لیکن اگلے ہی روز وہ پھر "معافی مانگنے" کے لئے موجود تھا۔ دو مرتبہ انگیلا نے پولیس کو اطلاع دی ایک مرتبہ فرانسکو کو مجسٹریٹ نے "دخل در معقولات" کرنے کے جرم میں ایک ماہ کی سزا بھی دے دی۔ دوسری مرتبہ پولیس نے اسے پاگل خانہ والوں کے حوالے کر دیا لیکن انہوں نے اس کے ذہن میں کوئی خرابی نہ پاکر اسے چھوڑ دیا اور فرانسکو نے اپنی طلب جاری رکھی۔

آخر پچھلے ماہ پچیس برس بعد ۴۹ سالہ کنوارے فرانسکو نے اکتالیس سالہ (ابھی تک) کنواری انگیلا کے تریاہٹ کے سامنے ہتھیار پھینک دئے۔ اس نے ایک خط انگیلا کو لکھا جس میں اس نے وعدہ کیا کہ وہ اب سے اسے دیکھنے دریا پار نہیں آیا کرے گا۔ لیکن اس نے اپنی تمام جائیداد انگیلا کے نام وصیت کر دی۔ لیکن انگیلا نے اب بھی وہی بات کہی جو پچیس برس پہلے کہی تھی "زندہ یا مُردہ مجھے تمہارے وجود کا کوئی حصہ نہیں چاہئے"۔ لیکن اطالوی قانون کے مطابق وہ اس وصیت سے دست بردار نہیں ہو سکتی۔ ہاں فرانسکو کے مرنے کے بعد وہ اگر چاہے تو اس کی جائیداد کسی دوسرے کو دے سکتی ہے۔ لیکن اس کی پہلی وصولی اسے خود ہی کرنا ہوگی۔ اس طرح فرانسکو خوش ہے کہ کم از کم مرنے کے بعد تو وہ اس کی وارث کہلا ہی سکے گی۔

●●

کتابیں پسند کیجئے

نئے قدم، ہاجرہ نازلی ۴ روپے ۵۰ نئے پیسے
جاتی ہوئی بہار، وحشی محمود آبادی ۴ روپے
بدگمانی، غدرا جمال ۶ روپے ۷۵ نئے پیسے
سفینہ، یاقوتہ رحمان ۵ روپے
گل رعنا، شہزادہ تسنیم ایم اے ۳ روپے
لاوارث محبوبہ، ظفر نیازی ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے
کائناتِ تبسم، شوکت تھانوی ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے
زیر لب، صفیہ اختر ۶ روپے
پطرس کے مضامین، پطرس ۲ روپے
کالی گھٹا، گلشن نندہ ۳ روپے
بہار آنے تک، عادل رشید ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے
کربلا سے پہلے، ابوالنصر ۵ روپے ۲۵ نئے پیسے

سنہری ڈورے، مسلم نظامی ۴ روپے
امیر انڈیس، علی اصغر ۴ روپے
سونی گلیاں، عابد رشید ۳ روپے
چنگاری، رئیس احمد جعفری ۵ روپے
عورت، رئیس احمد جعفری ۵ روپے
اس پار، مضطر ہاشمی ۵ روپے ۲۵ نئے پیسے
اجمیر کا چاند مولانا امداد صابری ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے
حماقتیں، شفیق الرحمن ۵ روپے
قیامت، رئیس احمد جعفری ۵ روپے

ہندی کتب

عشق پر زور نہیں، عادل رشید ۴ روپے
اندھیرے، اختر عادل روپ ۳ روپے ۹۵ نئے پیسے

بچوں کے لئے

قصہ چہار خرگوش ایک روپیہ
پھلجھڑیاں ۴۰ نئے پیسے
سمندری دلہن ۴۰ نئے پیسے
عقل مند وزیر ۴۰ نئے پیسے
ایک تھا شاہزادہ ۴۰ نئے پیسے
چالاک دشمن ۵۰ نئے پیسے
ملا دوپیازہ ۶۰ نئے پیسے

آئندہ ماہ آنے والی کتاب:
اجالا، قیسی رامپوری ۶ روپے

شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی

میرا پسندیدہ شعر

آپ کو بہت سے شعر یاد ہوں گے جو اپنے معنی کے لحاظ سے، اپنی بندش کی خوبصورتی کے باعث یا اپنے مفید پیغام کی وجہ سے آپ کو پسند ہیں، آپ انہیں اکثر دہراتی رہتی ہیں، خطوں اور دوستوں سے گفتگو میں استعمال کرتی ہیں، بیت بازی کے مقابلوں میں پیش کرتی ہیں۔ اپنے پسندیدہ پانچ (۵) اشعار "بانو" کو بھیجئے، ہم ان میں سے منتخب شعر شائع کریں گے۔ جو شعر بانو میں ایک بار چھپ چکے ہوں انہیں دوبارہ نہ بھیجئے۔ ایک بانو بہن ایک مہینے میں پانچ سے زیادہ شعر نہ بھیجیں، یہ پانچوں اشعار ایک ہی کاغذ یا ایک پوسٹ کارڈ پر بھیجئے اور ان کے ساتھ (اگر معلوم ہو تو) شاعر کا تخلص اور نام، اور بھیجنے والی بہن کا پورا نام اور پتہ لکھا ہوا ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ اس کارڈ یا کاغذ پر اور کچھ نہ لکھا جائے ورنہ اس پر توجہ نہ دی جا سکے گی۔ اپنے پسندیدہ اشعار محض یادداشت سے نہ لکھئے، اس طرح غلطیوں کا امکان ہے۔ جہاں آپ نے شعر پڑھا ہو، وہیں سے دیکھ کر صحیح طور سے لکھئے۔ اپنے پسندیدہ اشعار اس پتہ پر بھیجئے: میرے پسندیدہ اشعار، مدیرہ بانو، آصف علی روڈ۔ نئی دہلی۔

دلشاد انجم دہلی:	یہی سبب ہے جو ناکامیوں پہ روتا ہوں	سمجھ لیا ہے کہ ہر کام اختیار میں ہے	(مخمور)
مس مہر جبیں ماجد کانپور:	سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر	پھر اُٹھ سکے نہ ہاتھ میرے اس دُعا کے بعد	(نامعلوم)
زبیدہ امین، ناگپور:	دردِ دل پاسِ وفا جذبۂ ایماں ہونا	ہے یہی آدمیت اور یہی انساں ہونا	(چکبست)
مظہر سلیم، کلکتہ:	سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی	نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم	(شاد عظیم آبادی)
قیصر خاور، بلڈانہ:	گریز کا نہیں قائل صبات سے لیکن	جو سچ کہوں تو مجھے موت ناگوار نہیں	(ساحر لدھیانوی)
طاہرہ شاہین، دہلی:	یوں مُسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی	یوں لب کُشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا	(اصغر گونڈوی)
ریحانہ پروین، امیٹھی:	جانے کو جائے فصلِ گل آنے کو آئے ہر برس	ہم غم زدوں کے واسطے جیسے چمن ویسے قفس	(نامعلوم)
شکیلہ قیصر، بوندی:	موجوں کا اضطراب گوارہ نہ تھا مجھے	کشتی کو اپنی آپ ڈبوتا رہا ہوں میں	(نریش کمار شاد)
آصفہ عارفی، کلکتہ:	ہم نہیں منت کشِ فصلِ بہاراں اے شکیل	ہے شگفتِ گل سے مطلب کوئی بھی موسم سہی	(شکیل بدایونی)
طاہرہ نظام الدین، سارن:	مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اُڑتے جاتے ہیں	مگر گھڑیاں جُدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں	(سر محمد اقبال)
نکہت یاسمین ناز، آسنسول:	جب کسی سے کوئی پیمانِ وفا کرتا ہے	کانپ جاتا ہوں کہ میرا ہی سا انجام نہ ہو	(مجاز)
ن، بانو انصاری، امراؤتی:	ہمارے بعد جو دنیا کہے گی وہ بھی سُن لینا	ابھی تو تم ہماری بے زبانی دیکھتے جاؤ	(علامہ ناطق ناگپوری)
ز، ب، کوچین:	میرے چہرے پر دکھاوے کا تبسم ہے مگر	میری آنکھوں میں اداسی کے دیئے جلتے ہیں	(شاد)
شہناز، آسنسول:	یوں تجھ کو اختیار ہے تاثیر دے نہ دے	دستِ دعا ہم آج اٹھائے ہوئے تو ہیں	(مجاز)
ش، تبسم، آسنسول:	ناکامیٔ حیات کا کرتے بھی کیا گلہ	دو دن گزارنا تھے گزارے چلے گئے	(شکیل بدایونی)
صغرا نزہت، پونہ:	خدا کی دین ہے جس کو نصیب ہو جائے	ہر ایک دل کو غمِ جاوداں نہیں ملتا	(اثر)
مجیب الماس، اکولہ:	مجھے بھولے ہوئے لمحاتِ اُلفت یاد آتے ہیں	لپٹ کر شام کو روتی ہیں موجیں جب بھی ساحل سے	(آرزو لکھنوی)
حبیب ضیا قادریہ، حیدرآباد:	زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں	ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں	(نامعلوم)
عقیلہ بانو، میسور:	کچھ دُور آؤ موت کے ہمراہ بھی چلیں	ممکن ہے راستے میں کہیں زندگی ملے	(نامعلوم)

زلیخا، کوچین :	کس درجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے	ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے
سلمیٰ پروین، فرخ آباد :	مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قید حیات	فرق اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے
عالیہ پروین، حیدرآباد دکن :	اللہ کو پکار اگر کوئی کام ہے	بندے ہزار نام کا یہ ایک نام ہے
فہمیدہ بیگم، میسور :	ایسی لذت خلشِ دل میں کہاں ہوتی ہے	رہ گیا سینے میں اُس کا کوئی پیکاں ہوگا
مس ایم عطیہ، گورکھپور :	جہاں ہوا تیز چل رہی تھی وہیں چراغ وفا جلایا	کسی کا شکوہ نہیں جہاں میں، شہید ہوں اپنی سادگی کا
اقبال مرزا، ٹونکی :	ان ہی پتھروں پہ ہو کر اگر آسکو تو آؤ	مرے گھر کے راستہ میں کوئی کہکشاں نہیں ہے
م تبسم، پٹنہ :	اک محبت تھی مٹ چکی یارب	تیری دُنیا میں اب دھرا کیا ہے
رانی، بھینسہ ضلع عادل آباد :	یارب یہ بھید کیا ہے کہ راحت کی فکر نے	انساں کو اور غم میں گرفتار کر دیا
ایم جے عالم، چائباسہ :	الٰہی کیسی کیسی صورتیں تو نے بنائی ہیں	کہ ہر صورت کلیجے سے لگا لینے کے قابل ہیں
تسخیر نور جہاں بانو، نیمچ :	اس کی نگاہ ناز نے چھیڑا کچھ اس طرح	اب تک اُچھل رہی ہے رگ جان آرزو
بانو، ایم اے، کے، حیدرآباد دکن :	یہ تنہائی کی تاریکی تو بڑھتی اور بھی ہمدم	غنیمت ہے کہ یادوں سے چراغاں کر لیا میں نے
عشرت افروز، کانپور :	قدم چوم لیتی ہے خود بڑھ کے منزل	مسافر اگر اپنی ہمت نہ ہارے
دسیم انجم، بنگلور :	اک لمحہ کی جلن اور ہمیشہ کا سکون	یارا! پروانے کی تکلیف ہی کیا ہوتی ہے
اجرہ فاروقی حیدرآباد دکن :	تم مرے پاس ہوتے ہو گویا	جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
نجمی، بنگلور سٹی :	نہ جانے کون سا لائے یہ رنگ خاموشی	ابھی نظر کو ضرورت کسی نگاہ کی ہے
حسن آرا صبا ادیب، کلکتہ :	اُداس اُداس ستارے بجھے بجھے سے چراغ	خبر نہیں ابھی منزل سے کتنی دُور ہیں ہم
ناہید محسن، پٹنہ :	دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام	کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے
ثریا بانو، بمبئی :	ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا، گو ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا	جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا
نجمہ مظہر رضوی، الٰہ آباد :	چلو کوچے میں آج ان کے زمانے بھر کو دیکھ آئیں	سُنا ہے دیکھنے سارا زمانہ ان کو آتا ہے
مس اشفاق النسا صدیقی ملیح آباد :	یا اشکوں کا رونا تھا یا اکثر روتا رہتا ہوں	یا ایک بھی گوہر پاس نہ تھا یا لاکھوں گوہر ٹوٹ گئے
مسز حامدہ خالد سنبھل :	آنے کا ایک دن تھا جانے کا دوسرا دن	سچ پوچھئے تو بس یہ دو دن ہیں زندگی میں
حبیبا شرف، غازی بندہ :	چمن میں مجھے گریہ بار بار آیا	کہ وہ نہیں تو کیوں موسم بہار آیا
بلقیس کھتری بمبئی :	بتا دو کیا تمہارے دل پہ گزرے	اگر کوئی تمہیں سا بے وفا ہو
حمیدہ رعنا، دہلی :	بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے	اُٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ
نجمہ قاسم کھتری بمبئی :	بات تو جب ہے کہ سارا گلستاں ہنسنے لگے	فصلِ گُل میں چند پھولوں کو ہنسی آئی تو کیا
محمودہ خانم، لائلپور :	جس کی جبین ناز میں سجدۂ بندگی نہیں	شکل میں آدمی سہی اصل میں آدمی نہیں
عائشہ رحمانی، مونگیر :	اتنی آرائشِ آشیانہ	ٹوٹ جائے نہ شاخِ نشیمن
عصمت آرا ٹونکی ٹونک :	زمانہ درد کی لذت سے آشنا ہی نہیں	کرے گا کیا کوئی سُن کر میرے فسانے کو
مس عزیز فاطمہ زیدی، مظفر پور :	معصوم اُمنگیں جھول رہی ہیں ارمانوں کے جھولوں میں	یہ کچی کلیاں کیا جانیں کب کھلنا کب مُرجھانا ہے
روشن آرا بیگم، اڑیسہ :	حُسن سے لیجئے تنظیمِ دو عالم کا سبق	صبح ہوتی ہے تو گیسو سنور جاتے ہیں
سارہ حسن داؤد، ناگپور :	معلوم جو ہوتا ہمیں انجامِ محبت	لیتے نہ کبھی بھول کے ہم نامِ محبت

	( )
	(نامعلوم)
	(مصطفیٰ زیدی)
	(نامعلوم)
	(شبیر حسین خاں جوشؔ ملیح آبادی)
	(اکبر الہ آبادی)
	(اصغر)
	(ساحر)
	(نامعلوم)
	(عدمؔ)
	(مومن)
	(نامعلوم)
	(ظفر)
	(نامعلوم)
	(جذبی)
	(رؤف امروہوی)
	(نامعلوم)
	(جگر)
	(مومن)
	(نامعلوم)
	(نامعلوم)
	(فنا نظامی کانپوری)
	(خاور درآنی)
	(حفیظ)
	(شکیل بدایونی)
	(ذوق)

صابرہ صدیقی، امراوتی کیمپ:	جہاں چوٹ کھانا وہیں مسکرانا	مگر اس ادا سے کہ روئے زمانہ (مجاز)
شہوار برجیس، گلبرگہ:	تابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں	اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے (مومن)
عبدالحفیظ، مونگیر:	عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا	درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا (غالب)
کوثر نظام کوثر، حیدرآباد دکن:	ملے نہ پھول تو تربت پہ میری مہنس دنیا	سُنا ہے پھول برستے ہیں مسکرانے سے (ظفر)
شاہدہ ریحانہ روحی، علیگڈھ:	لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے	کون سے شہر میں ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے؟ (مصحفی)
قدسیہ انجم، مرتضیٰ پور:	دیا خاموش ہے لیکن کسی کا دل تو جلتا ہے	چلے آؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے (شعری بھوپالی)
سلطانہ مہر انجمن بانو، حیدرآباد دکن:	وہ کب کے آئے اور گئے بھی نظر میں اب تک سمائے ہیں	یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آرہے ہیں، وہ جا رہے ہیں (جگر)
قہر نگار، گیا:	ایک زمانہ تھا کہ گلشن میں بسر ہوتی تھی	آج دو پھول کو محتاج ہے تربت میری (مقصود گیاوی)
مس غوثیہ فاروقی، حیدرآباد دکن:	خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض	نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض (اقبال)
امان اللہ ہاشمی دہلی:	نازکی اُس کے لب کی کیا کہیے	پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے (میر)
شمیمہ خاتون، آرہ، شاہ آباد:	سمندر کر دیا نام اُس کا ناحق سب نے کہہ کہہ کر	ہوتے تھے کچھ جمع آنسو میری آنکھوں سے بہہ بہہ کر (شعلہ)
زینب عیسیٰ سیٹھ، مدراس:	نکل کر دیر و کعبہ سے اگر ملتا نہ مے خانہ	تو ٹھکرائے ہوئے انساں خدا جانے کہاں جاتے (قتیل شفائی)
ترکیہ انجم، الہ آباد:	بہ قدرِ ظرف محبت کی بھی ہوتی تقسیم	چمن کو پھول ملے، سینۂ فگار مجھے (مجنوں گورکھپوری)
اقبال رضیہ عباس، مدراس:	پہنچی ہے وہ ایذا ہمیں اپنوں کی بدولت	غیروں کی جفاؤں کا گلہ ہو نہیں سکتا (نامعلوم)
جمیب النساء، احمد آباد:	محبت ہے وطن کی جزوِ ایماں	لگا دوں آگ کیسے گلستاں کو (معین اعظمی)
غذرا بیگم، دہلی:	یہی بہت ہے کہ تم دیکھتے ہو ساحل سے	سفینہ ڈوب رہا ہے تو کوئی بات نہیں (فیض)
کلثوم ممتاز، ناگپور:	عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی	یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے (اقبال)
افشاں روحی، کلکتہ:	مجھے یقیں ہے کہ آرائشِ جمال کے بعد	تمہارے ہاتھ سے آئینہ گر گیا ہوگا (نامعلوم)
سید فخر احمد اللہ، کٹک:	شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ	ہے آگ سی جو سینے کے اندر لگی ہوئی (شیفتہ)
صبیحہ عابد، حیدرآباد دکن:	آج انہیں ہم اپنا افسانہ سنا کر رو دیئے	وہ بھی سُن کر مسکرائے مسکرا کر رو دیئے (نامعلوم)
فرقان اللہ ہاشمی، دہلی:	یہ مستِ بلبل بہک رہی ہے قریبِ عارض چہک رہی ہے	گلوں کی چھاتی دھڑک رہی ہے وہ دستِ رنگیں بڑھا رہے ہیں (جگر)
قمر جلال حیدرآباد دکن:	موت آتی ہے عمر بھر کے بعد	پھر بھی مرنے کو دم نکلتا ہے (نامعلوم)
جہاں آرا ہاشمی، کلکتہ:	قفس میں مجھ سے رُودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم	گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو (غالب)
گل فشاں بانو، امروہوی:	لکھتا ہوا چلا ہوں خطِ شوق راہ میں	چلتے ہیں میرے پاؤں برابر قلم کے ساتھ (داغ)
ریحانہ رحمان، مونگیر:	اب تو سوچا ہے کہ پتھر کے صنم پوجیں گے	تاکہ گھبرائیں تو ٹھکرا بھی سکیں مر بھی سکیں (نامعلوم)
شکیل احمد خاں، کلکتہ:	لرزتا ہے میرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر	میں ہوں وہ قطرۂ شبنم جو ہو خارِ بیاباں پر (غالب)
وصیہ عرفانہ، حیدرآباد دکن:	اے موجِ بلا! اُن کو بھی ذرا، دو چار تھپیڑے ہلکے سے	کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں! (معین الدین جذبی)
شیریں کوثر، مکاپور:	دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے	جو رنج کی گھڑی بھی خوشی میں گزار دے (داغ)
خیر النساء اکبر علی، پیپریا:	ترے کرم کے بھروسے پہ حشر میں یارب	گناہ لایا ہوں اور بے حساب لایا ہوں (شعری)
ام شبیہ ممتاز، گورکھپور:	گھبرائیے کیوں زندگی بے کیف اگر ہے	آخر شبِ تاریک کا انجام سحر ہے (نامعلوم)
محمودہ بہار، کلکتوی:	کہہ رہا ہے شورِ دریا سے سمندر کا سکوت	جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے (ابوالعلا ناطق لکھنوی)

آپ کی بزم

نوٹ

اس عنوان کے تحت دل چسپ، معلوماتی، مفید اور مہذب سوالوں کے جواب دیئے جاتے ہیں۔ ایک کاغذ یا پوسٹ کارڈ پر زیادہ سے زیادہ تین سوال لکھئے، ہر سوال کے نیچے جواب کے لئے جگہ چھوڑئے اور اپنا پورا نام پتہ لکھئے۔ جس کاغذ یا کارڈ پر سوالات ہوں اس پر دفتر سے متعلق اور کوئی بات نہ لکھئے۔ اپنے سوالات اس پتہ پر بھیجئے: آپ کی بزم، ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ۱۔

مدیرہ۔

اقبال رضیہ عباس، مدراس

س۔ بھابی جان! ناولیں پڑھنا اچھا ہے یا برا؟

ج ہر دوسرے کام کی طرح اچھا بھی ہے اور برا بھی تاریخ، نفسیات، اور دوسری کارآمد کتابوں کے ساتھ ساتھ کچھ ناول بھی پڑھے جائیں تو اچھا ہے لیکن اپنے مطالعہ کو ناولوں تک ہی محدود کر لینا اور بہت زیادہ ناول پڑھنا برا ہے۔ پھر، ناولوں میں بھی اچھے اور برے دونوں طرح کے ناول ہوتے ہیں۔ آپ اچھے ہی ناول پڑھئے۔

ایم انور، برہان پور

س یہ مثل کہاں تک صحیح ہے کہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں اور جو برستے ہیں وہ گرجتے نہیں ——؟

ج جو گرج لیتے ہیں، ان کا غصہ گرجنے میں ہی اتر جاتا ہے۔

شفیق النسار شیلانگ

س انسان زندگی سے تنگ آکر موت کی تمنا کیوں کرتا ہے۔

ج موت کی تمنا کے لئے زندگی سے تنگ آنا ضروری نہیں۔ ماحول کی یکسانیت ایک بہت بڑا سبب ہے۔

نجمہ اُدنی، کٹک

س بھابی انسان کو آرام کب ملتا ہے؟

ج دوسروں کے آرام کے لئے کام کر کے۔

عبدالعزیز، شکر نگر، آندھرا

س انسانی شرافت کی آخری منزل کہاں ہے؟

ج اپنے سب سے بڑے دشمن کو معاف کر دینا

س اگر انسان کو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دے تو؟

ج رات کتنی ہی تاریک ہو صبح ضرور آتی ہے۔

نورالصباح شمع، پوری اڑیسہ

س کیا محبت کا آخری نتیجہ شادی ہے؟

ج جی ہاں، لیکن مشرق میں شادی کا نتیجہ محبت ہوتا ہے۔

سابرہ صدیقی، امراوتی کیمپ

س یہ دوربین آپا کون ہیں۔ مہربانی فرما کر نام بتائیے نا اور کن کی کون ہیں؟

ج بس یہ سمجھ لیجئے کہ بڑی دور کی کوڑی لانے میں ماہر ہیں، اور دوربین آپا ہی ان کا نام ہے

ایم سلطان برق، کلکتوی پونہ

س بھابی، کیا دنیا میں انسان کی ہر آرزو پوری ہو سکتی ہے؟

ج نہیں —— زندگی میں ہر لمحہ دو ٹکرانے والی خواہشوں میں سے ایک کو منتخب کرنا پڑتا ہے

عبدالغفور، مشیر آباد

س سکھ اور دکھ کو اگر تولا جائے تو ایک انسان کے سکھ دکھ میں دکھ کا پلہ بھاری ہوگا! کیوں؟

ج دکھ ایک نعمت ہے جس سے سکھ کی قدر آتی ہے

فیروزہ خانم، بھوپال

س بھابی۔ انسان گناہ کی طرف کب مائل ہوتا ہے؟

ج جب اس پر پابندیاں حد سے زیادہ بڑھ جائیں

س زینت بھابی! کیا یہ سچ ہے کہ لڑکیاں تعلیم حاصل کرنے سے خراب ہو جاتی ہیں؟

ج جی نہیں بالکل غلط ہے۔

مشہدی اکبری، گیا

س بھابی۔ زندگی کا اصل مقصد کیا ہے۔

ج درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو۔

ٹنی، سیوان

س عورتوں میں کس دیس کی عورت سب سے بڑے عہدہ پر ہے۔

ج دور کیوں جائیے ہمارے ہی ملک کی سنہرے کیشی پنڈت ایک سال تک اقوام متحدہ کی صدارت کر چکی ہیں۔

ام عطیہ، جلگاؤں

س جلدی سے بتایئے بھابی! اگر بچے میں بغاوت کا عنصر پیدا ہو جائے تو ــــ؟

ج بغاوت کو نہیں بغاوت کی وجہ کو دور کرنے کی کوشش کیجئے۔

صبیحہ عابد، حیدرآباد

س آپا "لیڈیز فرسٹ" کا مطلب عورت کی عزت ہے یا عورت کی کمزوری کا اظہار۔

ج عزت۔

ناظمہ سحر، قادرآبادی

س حسن، دولت، شرافت، ان میں کون شے زیادہ قیمتی ہے

ج یہ ترتیب یوں ہونی چاہیئے۔ شرافت، حسن، دولت

س کیا سچ مچ عورت دولت سے پیار کرتی ہے؟ جیسا کہ عام مردوں کا خیال ہے۔

ج عورت تو پیار سے پیار کرتی ہے۔

سیف الدین سیف۔ امراوتی

س "ناامید" اُمید کی منزل پر پہنچ کر کتنا خوش ہو سکتا ہے؟

ج خوشی کی حد وہی ہے جہاں آدمی وقتی طور پر باقی باتیں بھول جائے۔

مس گلنار اختر، کٹک

س مرد سب سے زیادہ کسے چاہتے ہیں؟ عورت کو یا دولت کو؟

ج دولت والے عورت کو عورت والے دولت کو

محمد یٰسین، حیدرآباد دکن

س دلہن بھابی یہ بتایئے کہ عورت کی قیمت کیا ہے

ج محبت اور پیار سے عورت ہی کو نہیں، دنیا کو جیتا جا سکتا ہے۔

وسیم انجم، بنگلور

س بھابی صاحبہ! اکثر انہیں باتوں کو دل چاہتا ہے جو نہ ہو سکیں۔ ایسا کیوں؟

ج اس لئے کہ جو چیز انسان کو حاصل نہ ہو سکتی ہو وہ تصور میں حاصل کر سکتا ہے۔

س مجبوری کا نام صبر کیوں؟

ج صبر کا رد دوسرا مطلب ہے، انتظار۔

وصیہ عرفانہ، حیدرآباد

س کیا ادریس بھائی کا حلیہ اب ویسا ہی ہے جیسا کہ انہوں نے شادی شدہ مرد کا بتایا ہے؟

ج ادریس بھائی کی توقع کے خلاف ان کے بال ابھی تک سلامت ہیں۔

انیس فاطمہ صدیقی، فتح پور

س کیا یہ سچ ہے محبت اندھی ہوتی ہے۔

ج جی ہاں، اس میں کوئی شک نہیں۔

مس اختر نظیر، فتح پور

س حسین صورت میں زیادہ کشش ہوتی ہے یا حسین سیرت میں؟

ج حسین صورت میں فوری کشش ہوتی ہے، اور حسین سیرت میں مستقل۔

رضوان اللہ خاں، علی پور

س بھابی آدمی کی تقدیر کام کرتی یا تدبیر؟

ج جہاں تک انسان کا تعلق ہے اس کی تدبیر ہی کام کر سکتی ہے تقدیر تو اس کے بس میں نہیں۔

بلقیس کھتری، بمبئی

س بھابی جان! کیا حساس ہونا انسان کی برائیوں میں شمار ہوتا ہے؟

ج حساس ہونا تو خوبی ہے اگر حد سے زیادہ نہ ہو۔

س آنسوؤں کو بہنے سے روکنے کی ترکیب؟

ج بہنے دیا جائے، تاکہ دل کی بھڑاس نکل سکے۔

شہناز بیگم، کلکتہ

س بھابی یہ بتایئے کہ نئے سال کی خوشی میں آپ ہم بہنوں کو کیا تحفہ دے رہی ہیں؟

ج بانو کا یہ سال نامہ۔

س مرد شادی کے نام سے کیوں گھبراتے ہیں؟

ج ذمہ داری کی وجہ سے۔

نگہت پروین، بنگلور

س خیال کیا ہے؟

ج خیال بے کار آدمیوں کا سب سے بڑا سرمایہ ہے

سکینہ عارفہ، اوجین

س بھابی جان کیا "آپ کی بزم" میں فلم کے متعلق کوئی سوال بھیج سکتے ہیں یا نہیں۔

ج جی نہیں، فلمی سوالوں کے لئے شمع یا سشما نئی دہلی کو خط لکھئے۔

مس پروین، بنگلور

س اس دنیا میں کسی پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

ج اپنے آپ پر۔

مس تمکینہ، نظام آباد دکن

س عورت کی زندگی کا کونسا دور نازک ہوتا ہے؟

ج آغاز جوانی کا۔

ایچ۔ کے قمر النسار، مدراس

س بھابی انسان کی سب سے بڑی دولت کیا ہے؟

ج اس کے دل کی امیری۔

فاطمہ سالم، حیدرآباد

س باجی اگر پردہ توڑنا بے حیائی کا کام نہیں ہے تو کیا اس ترقی یافتہ دور میں اس کو بھی ایک ترقی سمجھا جائے۔

ج پردہ توڑنا بے حیائی نہیں یہ تو وہ حق ہے جو عورت نے مردوں سے لڑ جھگڑ کر حاصل کیا ہے۔

ایس۔ ایس۔ اے۔ نظیر، دھنباد

س بھابی جان! عورت کی سب سے بڑی خواہش اور سب سے بڑا فرض؟

ج عورت کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا اپنا گھر ہو اور اس کا سب سے بڑا فرض

اس گھر کی، اور اس گھر کی عزت کی حفاظت۔

ڈاکٹر اسمار خاتون، لکھنؤ

س بھابی! سنتی ہوں کہ لڑکیاں زیادہ تر بے وفا ہوتی ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے؟

ج آپ نے غلط سنا ہے۔

رضا راللہ اپل، مساکہ (افریقہ)

س بھابی اگر میں قلمی دوستی کے لئے بالو میں پتہ شائع کراؤں تو آپ شائع کر دیں گی یا نہیں؟

ج جی نہیں۔ ہمارے ملک میں ابھی تک قلمی دوستی کے نتائج کچھ اچھے ثابت نہیں ہوتے۔

روبی لکھنوی، سدھ پور

س بھابی۔ ماضی، حال، مستقبل ان تینوں میں سے کسے مدنظر رکھ کر زندگی کو پرکھنا چاہیے؟

ج ماضی کو۔

رخسانہ بیگم، جمشید پور

س بھابی لڑکیوں کو کہاں تک تعلیم دینا چاہیے۔

ج جہاں تک وہ تعلیم حاصل کرنا چاہیں۔

نازنیں افشاں، میسور

س بھابی! عورت کے آنسو کی کیا قیمت ہے؟

ج مرد کی شکست۔

محمودہ خانم، لائل پور

س انسان کو زندگی میں سب سے زیادہ کس کی ضرورت ہوتی ہے؟

ج محبت کی۔

س انسان کو حقیقی مسرت کس وقت حاصل ہوتی ہے؟

ج جب وہ خدمت خلق کرے۔

روبی لکھنوی، سدھ پور

س بھابی۔ غریب سے ہر کوئی نفرت کرتا ہے تو دنیا میں غریب ہونا کیا گناہ ہے؟

ج غریب اگر شریف اور تعلیم یافتہ ہو تو وہ غریب ہی نہیں۔

س باپ کی زیادہ محبت بیٹی سے ہوتی ہے یا بیٹے سے

ج عموماً بیٹی سے۔

ایم۔ اے۔ کے۔ یادبا، کیٹھیار

س عورت اور مرد ان میں کس کا درجہ بڑا ہے اور کیوں

ج دونوں کا درجہ برابر ہی ہے۔

عقیلہ مغاں، حیدر آباد

س اچھی بھابی آپ بتا سکتی ہیں کہ دنیا میں سچا ساتھی کون ہے۔ شوہر یا ماں۔

ج ماں سے بڑھ کر کوئی ساتھی نہیں۔

کماری گلنار بانو۔ اندور

س اگر کوئی زندگی سے تنگ آکر موت کی آرزو کرنے لگے اور موت نہ آئے تو؟

ج زندگی کے کھوئے ہوئے خزانوں کو پھر کھوجنا چاہیے۔

نور جہاں، ہنور، میسو

س بھابی ہر ماہ میں 'بانو' کا بے چینی سے انتظار کرتی رہتی ہوں، جب 'بانو' آتا ہے تو اسے پورا پڑھنے تک چھوڑنے جی نہیں چاہتا مگر وہ بانو کو پسند نہیں کرتے، آخر کیوں؟

ج عورتوں کے رسالوں میں مردوں کی دلچسپی کم ہونا ایک عام بات ہے۔

نجمہ قاسم کھتری، بمبئی

س بھابی جان! آپ کو سنجیدہ بچے پسند ہیں یا شرارتی؟

ج عام طور پر جو بچے شرارتی ہوتے ہیں، آگے چل کر وہی ترقی کرتے ہیں۔

س کیا آپ کو فلمیں دیکھنے کا بے حد شوق ہے؟

ج نہیں۔

س اندھیرے میں امید کی کرن نظر آئی مگر وہ جلد ہی غائب ہو گئی۔ کیا اب وہ دوبارہ نظر آسکتی ہے؟

ج کیوں نہیں!

مسائرہ خاتون، جھاجھا

س باجی جان! دنیا میں صرف خوشیاں ہی ہوتیں تو؟

ج خوشیوں کی قدر نہ ہوتی۔

کنیز حسین رضوی، الہ آباد

س بھابی تعلیم زیادہ ضروری ہے یا تربیت؟ بعض پڑھی لکھی لڑکیاں بالکل تہذیب سے گری ہوتی ہیں

ج تہذیب گھر کے ماحول سے آتی ہے ممکن ہے ان لڑکیوں کے گھروں کا ماحول اچھا نہ ہو۔

سعیدہ نظیر، دھنباد

س بھابی جان۔ انسان کو آخر کار مرنا ہے، پھر بھی وہ زیادہ سے زیادہ جینے کی کوشش کرتا ہے۔ آخر کیوں؟

ج جینے کی کوشش ہر انسان میں فطری ہے۔

ام شمیمہ ممتاز، گورکھپور

س اندھیرے میں روشنی انسان کی راہ نما ہے۔ لیکن اندھیرے اُجالے کے ہوتے ہوئے بھی بعض لوگ ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ اس اُجالے کا کیا مقصد؟

ج جب دل میں اندھیرا ہو تو باہر کا اجالا بھی بیکار ہوتا ہے۔

شمیم بانو، دیواس

س بھابی جان کیا ایک لفافے میں دو بہنیں کشیدہ کاری یا کہنی سنی وغیرہ بھیج سکتی ہیں۔

ج جی ہاں۔

عائشہ رحمانی، مونگیری

س بھابی جان! آپ بانو کی ترتیب کے علاوہ گھریلو کام انجام دیتی ہیں یا مطالعہ وغیرہ کرتی ہیں

ج گھریلو کام اور مطالعہ دونوں ہی کرتی ہوں۔

شمیم جہاں خانم، علی پور

س بھابی میں اپریل ۱۹۶۰ کے آخری ہفتہ میں دلی آرہی ہوں آپ سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے

مجھے آپ سے ملنے کا شوق ہے۔

ج گھر پر ہی ملاقات ہو سکتی ہے۔

س سلطانی نذیر، دھن باد

س دلہن بھابی، عورت، مرد کی تباہی و بربادی کا باعث کب بنتی۔ ہے؟

ج جب اُسے ضد ہو جائے۔

مصطفےٰ قیصر، حیدر آباد دکن

س اگر دنیا میں سب ہی آدمی اچھے یا سب ہی آدمی برے بن جائیں تو کیا ہوگا؟

ج دنیا کی دلچسپی اور رنگینی ختم ہو جائے گی۔

طاہرہ لطیف، حیدر آباد دکن

س زینت بھابی! "بانو" کا کام کرنے میں شمیمہ بھابی اور امینہ بھابی آپ کا ہاتھ کب بٹائیں گی؟

ج کچھ تو آرام کرنے دیجئے اُن کو!

حمیدہ رعنا، دہلی

س میرا خیال ہے کہ شادی کئے بغیر عورت ہو یا مرد کامیاب زندگی نہیں گذار سکتا اور میری ایک سہیلی ہیں جو اس نظریہ سے کلی اختلاف رکھتی ہیں۔ اور بڑی بڑی دلیلیں پیش کرتی ہیں برائے کرم آپ بانو میں اپنی رائے سے آگاہ فرمائیے۔

ج میری رائے میں، کامیاب زندگی گذارنے کے لئے شادی ضروری نہیں۔

شوکت، حیدر آباد دکن

س بھابی۔ پھول کے ساتھ کانٹے کیوں ہوتے ہیں؟

ج پھول کی قدر و قیمت بڑھانے کے لئے۔

س بھابی۔ یہ امیر اور غریب کا فرق کیوں؟

ج امیر اور غریب میں دولت کا نہیں دل کا فرق ہوتا ہے۔

حسن آرا خانم، کلکتہ

س بھابی! میری ایک سہیلی کہتی ہے کہ خدا کرے کسی کی شادی مصور سے نہ ہو کیوں؟

ج ان کے خاوند کو تصویروں سے ہی فرصت نہ ملتی ہوگی۔

س سورج کی کرن اور امید کی کرن میں کیا فرق ہے

ج سورج کی کرن رات کو غائب ہو جاتی ہے امید کی کرن باقی رہتی ہے۔

خورشید النسار، ٹونکی

س نند بھاوجوں میں عموماً کیوں جھگڑا ہوتا ہے۔

ج اچھے گھروں میں نہیں ہوتا۔

ایچ۔ کے قمر النسار، مدراس

س بھابی بانو کے دیگر دفاتر بمبئی۔ کلکتہ اور مدراس کا پتہ تحریر کریں مہربانی ہوگی؟

ج یہ صرف کاروباری دفاتر ہیں، ان کا پڑھنے والوں سے کوئی واسطہ نہیں اس لئے پتے شائع کرنا بے کار ہے۔

عبدالعزیز، شکر نگر

س دشمن کس وقت اپنی دشمنی پر افسوس کرتا ہے؟

ج جب وہ اپنی دشمنی نکال چکتا ہے تب اسے احساس ہوتا ہے کہ حاصل کیا آیا؟

س بھابی جان! دوستی کو کس طرح نبھایا جا سکتا ہے؟

ج لحاظ و رواداری سے۔

روشن آرا، بہار شریف

س زینت بھابی! اگر آپ سال نامہ میں اپنی پورے صفحہ کی تصویر چھپوائیں تو کتنا اچھا ہو۔ کیا آپ ہماری یہ فرمائش پوری کریں گی۔

ج یہ دو سو صفحے کا سال نامہ ہی میری تصویر ہے اس کے ہر صفحے پر آپ کو میرے خیالات کی جھلک دکھائی دے گی۔

اختر بیگم، دہرہ دون

س بانو کا سالنامہ کب نکل رہا ہے۔

ج یہ بانو کا سالنامہ ہی آپ کے ہاتھوں میں ہے کہئے پسند آیا؟

خلیل بنگش، پرتواڑہ

س عورت مرد کی کمائی کھانے کے ساتھ ساتھ مرد کے دماغ کو کھانا کیوں پسند کرتی ہے؟

ج یہ غلط ہے کہ عورت مرد کی کمائی کھاتی ہے۔ وہ اپنا خون پسینہ ایک کر کے مرد کے گھر کا انتظام کرتی ہے، اس کے بچوں کو پالتی ہے اور اس طرح مرد کو باہر جا کر کمانے کے لئے فرصت مہیا کرتی ہے اس طرح مرد جو کچھ کما کر لاتا ہے وہ اکیلے مرد کی ہی نہیں، دونوں کی کمائی ہوتی ہے۔

زاہدہ بیگم، امراؤتی

س بھابی جب سے آپ بانو کی ایڈیٹر بنی ہیں یہ رسالہ ترقی کی منزلیں طے کرتا جا رہا ہے۔ میری بھی دعا ہے کہ خدا اسے دن دگنی رات چوگنی ترقی دے

ج دعا کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے ——— بانو کے لئے خریدار بنائیے۔

س کیوں بھابی کیا یہ سچ ہے، زندگی صرف اسی کو راس آتی ہے جسے غم سے نجات ملے۔

ج زندگی اس کو راس آتی ہے جو غم سے نہ بھاگے

انیس ساحل مانکپوری، الہ آباد

س بھابی زندگی کا بہترین زمانہ کونسا ہے؟

ج بچپن ——— جب کوئی فکر اور غم نہیں ہوتا۔

س کوئی اچھا سا شعر سنائیے

ج اسی سالنامے میں بہت سی بانو بہنوں کے پسندیدہ شعر شائع کئے جا رہے ہیں۔

خورشید افضال لکھمینہ، مونگیر

س بھابی جان مرد کی سب سے بڑی خواہش۔

ج اپنی مردانگی کا لوہا منوا لینا۔

افسانہ بانو، امینہ اسلام پور

س بھابی۔ عورت سب سے زیادہ خوشی کب محسوس کرتی ہے؟

ج اپنے بچوں کو پھولتے پھلتے دیکھ کر۔

کام کی باتیں

★ سر دھونے کے لئے سیکا کائی، ماش کی دال اور میتھی سل پر باریک چٹنی کی طرح پیس کر سر دھونے سے بال جھڑنے بند ہو جائیں گے بال چمکدار ہو جائیں گے اور بالوں کا سفید ہونا بھی بند ہو جائیگا۔

عائشہ شمیم، دانمباڑی

★ جسم کا جو حصہ آگ سے جل گیا ہو وہاں انڈے کی سفیدی لگائیں۔ نہ تو سوزش رہے گی نہ آبلہ پڑے گا۔

★ جس مقام پر چوہے ہوں وہاں پیپر منٹ باریک کر کے چھڑک دیں۔ چوہے نہ آئیں گے۔

محمودہ عزیز بی، اے، پٹنہ

★ اگر آپ کے مونہہ پر مہاسے یا کسی قسم کے دھبے پڑ جائیں تو اُسے مٹانے کے لئے چہرے پر کچا دودھ لے کر ملئے۔ اگر ہو سکے تو دونوں وقت ملئے، جلد ہی فائدہ ہوگا اور رات کو سونے سے پہلے اگر چہرے پر تھوڑی بالائی مل لی جائے تو چہرہ ملائم رہے گا اور داغ دھبے بھی صاف ہو جائیں گے۔ جن بہنوں کی جلد پہلے ہی چکنی ہو وہ اس پر عمل نہ کریں

قدیر فاطمہ، بنارس

★ انڈا اُبالتے وقت اگر پانی میں تھوڑا سا نمک ڈال دیں تو چھلکا آسانی سے اُتر سکے گا۔

★ اگر آپ کے ناخن میلے ہیں تو ایک پیالہ پانی میں ایک چمچہ لیموں کا رس ملا دیں اور اس سے ناخن صاف کریں۔ ناخن بالکل صاف اور چمکدار ہو جائیں گے۔

مس سلطانی نظیر، دھنباد

★ اگر آپ دن بھر کام کاج کرتے کرتے تھک کر چور چور ہو گئی ہوں اور آپ کی طبیعت پریشان اور مضمحل معلوم ہوتی ہو تو برائے مہربانی سادی چائے (بغیر دودھ کے) اور اس میں دو چار بوند لیموں کا رس ڈال کر پئیں اور شام کو بستر پر جانے سے پہلے ہلکے گرم پانی میں نمک ملا کر اپنے پاؤں کو تھوڑی دیر تک گرم پانی میں رکھیں۔ اس سے آپ کو بہت آرام ملے گا اور رات کو پر سکون نیند آئے گی

حور بانو، رانچی

★ المونیم کے برتنوں کو صاف اور چمکیلے بنانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ دھان کا کھُردرا سوکھا بھوسہ لے کر اس سے برتنوں کو اچھی طرح مانجھیں جب وہ صاف و چمکیلے نظر آنے لگیں تو صابن سے برتنوں کو دھو ڈالیں بہت چمکدار و صاف ستھرے بن جائیں گے۔

زاہد حسین، جن پٹن

★ اگر گوشت کے گلنے میں دیر ہو اور آپ کو جلدی ہو تو ایک چمچی شکر یا کھانے کا سوڈا ڈال دیجئے گوشت بہت جلد گل جائے گا۔

غوثیہ بانو، میسور

★ گلاب کے پودوں میں اگر چائے کی پتیاں جو استعمال کی جا چکی ہوں روزانہ ڈال دیا کریں تو پھول بڑے اور بہت نکلیں گے۔

★ سنگِ مرمر کی میز صاف کرنا ہو تو گرم پانی میں چند قطرے ایمونیا ملا کر دھو ڈالئے۔ دودھ کی طرح صاف ہو جائے گی۔

فیض سلطانہ نسیمہ، کلکتہ

★ مرچیں پیسنے سے اکثر ہاتھوں میں جلن ہوتی ہے اس کے لئے مرچیں پیس کے بعد میں ایک چھوٹی سی گڑ کی ڈلی لیں اس میں تھوڑا سا پانی ملا کر گاڑھا سا اپنے ہاتھوں پر مل لیں اس سے بہت جلد جلن کم ہو جائے گی۔

★ گوبھی کی ناگوار بو دور کرنا ہو تو گوبھی پکاتے وقت اس میں قدرے لیموں کا عرق چمچ بھر پانی میں ملا کر ڈال دیں۔

رئیسہ اسمٰعیل، پونہ کیمپ

★ پیاز کاٹتے وقت اکثر آنکھوں میں پانی آتا ہے اور جلن ہوتی ہے۔ اگر پیاز کو اُلٹا کر کے کاٹیں تو نہ آنکھیں جلیں گی اور نہ پانی آئے گا۔

عابدہ بیگم، شکر نگر، نظام آباد

★ الماری میں رکھی کتابوں یا رسالوں کو کیڑوں سے بچانے کے لئے نیم کی پتیاں اوراق میں ڈال دیجئے۔ طریقہ آزمایا ہوا ہے۔

★ اگر ہاتھ یا جسم کا اور کوئی حصہ بھاپ سے جل جائے تو آلو پیس کر لگا دیجئے چند سیکنڈ بعد کافی آرام محسوس ہونے لگے گا۔

نزہت رضی، حاجی پور

★ سنگترے کے چھلکوں کو سکھا کر رکھ لیں اور انہیں باریک پیس کر تھوڑے سے پانی میں گوندھ کر چہرے پر ملیں، اس سے رنگ صاف ہو جاتا ہے اور جھائیاں وغیرہ دور ہو جاتی ہیں۔

بیگم شفیق احمد، سیوہارہ

باورچی خانہ

انڈے کے گلگلے

آدھ پاؤ روا، آدھ پاؤ میدہ، تین عدد انڈے، ایک پاؤ دودھ حسب پسند شکر اور عرق کیوڑہ۔ سب چیزوں کو ڈال کر حل کرلیں۔ دو تین گھنٹہ بعد تل لیں۔ نہایت لذیذ ہوں گے۔

صفیہ سعید، دہلی

چھوہارے کا اچار

چھوہارے بڑے بڑے ایک سیر لیموں بیس۔ پھیکی آدھ سیر ۱۵ سوکھی مرچ، زیرہ ایک چھٹانک، کالی مرچ دو تولہ پانچ بڑی الائچی، بیس لونگیں، نمک ڈیڑھ چھٹانک ہینگ آدھی چھٹانک۔

پہلے چھوہاروں کو بھگو کر ان کی گٹھلی نکال کر صاف کرلیجئے۔ اس کے بعد رات بھر لیمو کے عرق میں بھیگے رہنے دیجئے صبح لیمو کے عرق کو گرم کر کے ٹھنڈا کرلیجئے۔ اور سب مسالہ کو باریک پیس کر تیار کرلیجئے اور مسالہ میں پھیکی اور نمک ملا کر چھوہاروں میں بھر لیجئے اور کسی مرتبان میں چھوہارے بھر کر اوپر سے عرق لیمو ڈال دیجئے۔ بس خوش ذائقہ اچار تیار ہو جائے گا۔

حبیبہ خاتون باری ٹاکلوی، آکولہ

گوبھی کا اچار

گوبھی کا پھول ایک عدد، سرکہ ایک بوتل، نمک مرچ حسب ذائقہ، لہسن کے جوے چلے ہوئے چھٹانک بھر، ادرک کتری ہوئی چھٹانک بھر۔

گوبھی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے ایک مرتبان میں ڈال دیں، اوپر سے سب مسالہ چھوڑ دیں اور سرکہ ڈال دیں اور دھوپ میں رکھ دیں سات روز کے بعد تیار ہو جائے گا، مرچیں سُرخ ثابت ڈالی جاتی ہیں لیجئے اچار تیار ہو گیا۔

مسز شمیمہ پروین لکھنؤ

لیموں کے چھلکوں کی میٹھی چٹنی

لیموں کا عرق ایک سیر۔ شکر سوا سیر۔ نمک حسب ضرورت۔ پہلے لیموں کا عرق اور چھلکے صاف کر کے اس کے باریک لچھے کاٹ لیں۔ پھر اس کو پانی میں ابالیں۔ جب لچھے اچھی طرح گل جائیں، تو ایک چھلنی میں ڈال دیں۔ جب پانی نکل کر لچھے خشک ہو جب۔ تو اس کو ٹھنڈے پانی میں ڈال کر دو تین مرتبہ دھوئیں اب لیموں کے عرق میں شکر اور نمک ڈال کر پکائیں۔ جب ذرا قوام بن جائے تو ان لچھوں کو شیرہ میں ڈالیں۔ ادرک کے ٹکڑے اور کشمش بھی ساتھ ہی ڈالیں۔ جب شیرہ آدھا ہو جائے۔ تب اتار لیں۔ پسند ہو تو تھوڑا سا سرکہ بھی ڈال سکتے ہیں۔ ٹھنڈا ہونے کے بعد شیشی میں بھر لیں۔

مس طاہرہ احمد، لاہور

کیلے کے قتلے

۴ عدد بڑے اور پکے کیلے لے کر اس کے گول گول قتلے کاٹ لیں، پھر ایک چمچہ گھی خالص چولہے پر گرم کر کے قتلے اس میں ڈال دیں اور جلائیں۔ اب اپنی پسند کے مطابق اس میں شکر ڈال دیں۔ جب شیرہ گاڑھا ہو جائے تو اتار لیں۔ اگر خوشبو مرغوب ہو تو پسی ہوئی الائچی یا کیوڑہ شامل کرلیں۔ یہ قتلے روٹی کے ساتھ بھی کھائے جاتے ہیں۔

ممتاز زبیدہ، پونہ نمبر ۲

بھیجے کے کباب

بھیجہ ابال لیں۔ ادرک لہسن، ہری مرچ، ہرا دھنیا، نمک۔ پیاز ملا دیں اس کے بعد کباب بنا کر انڈے پھینٹ کر اس میں لت پت کر کے تل لیں۔ نہایت لذیذ ہوں گے۔

مہر زریں نعمانی، کان پور

کاجو کی برفی

کاجو پاؤ بھر، بالائی پاؤ بھر، شکر آدھ سیر۔

پہلے کاجو کو ایک جوش دے کر پیس لیجئے پھر بالائی میں ملا کر شکر کے ساتھ پکائیے جب شکر گھی چھوڑنے لگے تو جما کر قتلے کاٹ لیجئے۔

فیض سلطانہ نسیمہ، کلکتہ

زیبائش

کوثر نظام کوثر، حیدرآباد دکن

سلطانی نظیر

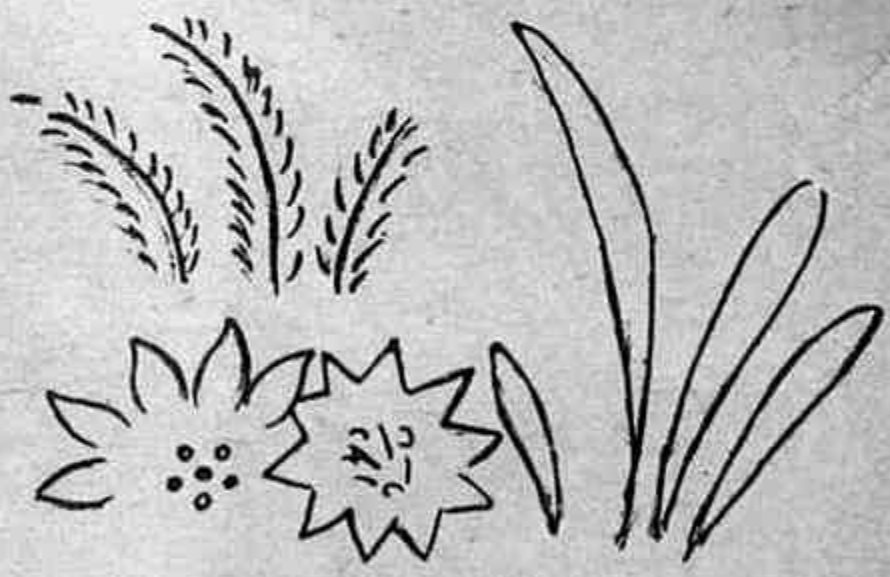

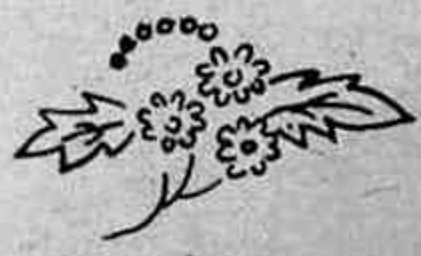

ام شیبہ ممتاز، گورکھپور

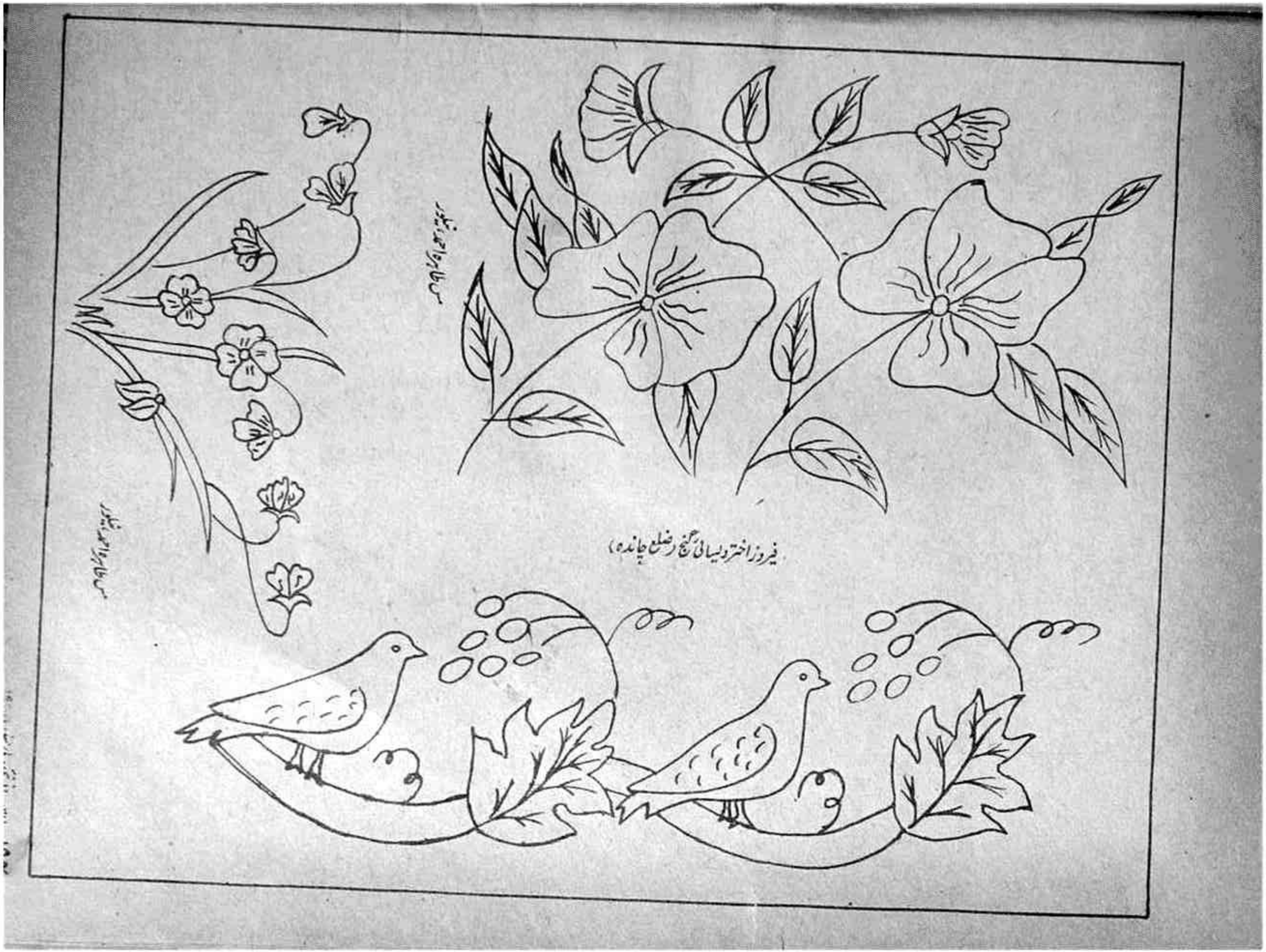

فیروز اختر دیسائی گنج (ضلع چاندہ)

لباس

صِفر اور کانٹیوں والا حسین بلاؤز

بچپن میں آپ نے صفر اور کانٹی کا کھیل ضرور کھیلا ہوگا۔ اب اسی کے ڈیزائن کا سوئیٹر بُن کر پہنئے۔ انتہائی خوبصورت رہے گا۔ بیس پھندوں اور نو سلائیوں میں ایک صفر اور ایک کانٹی مکمل ہو جاتی ہے۔ بیچ میں ایک ایک پھندا اور تین تین سلائیاں چھوڑ کر یہ ڈیزائن جتنی مرتبہ ڈالنا چاہیں ڈال لیجئے۔ ایک رنگ سے سیدھا بُننے کے بعد آپ یہ ڈیزائن کاڑھ بھی سکتی ہیں

(دیکھئے صفحہ ۱۷۴)

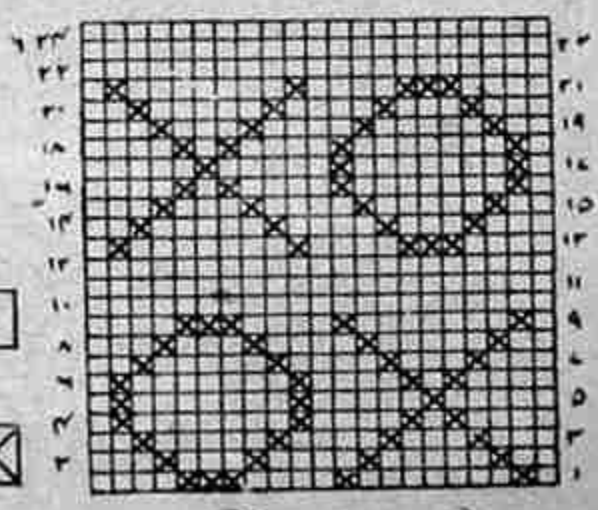

بنیادی رنگ

دوسرا رنگ

سائز اور وضع

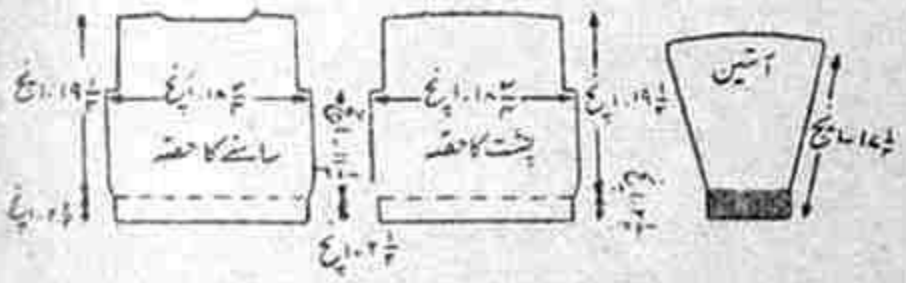

لباس

تاش کے ڈیزائن کی جیکٹ

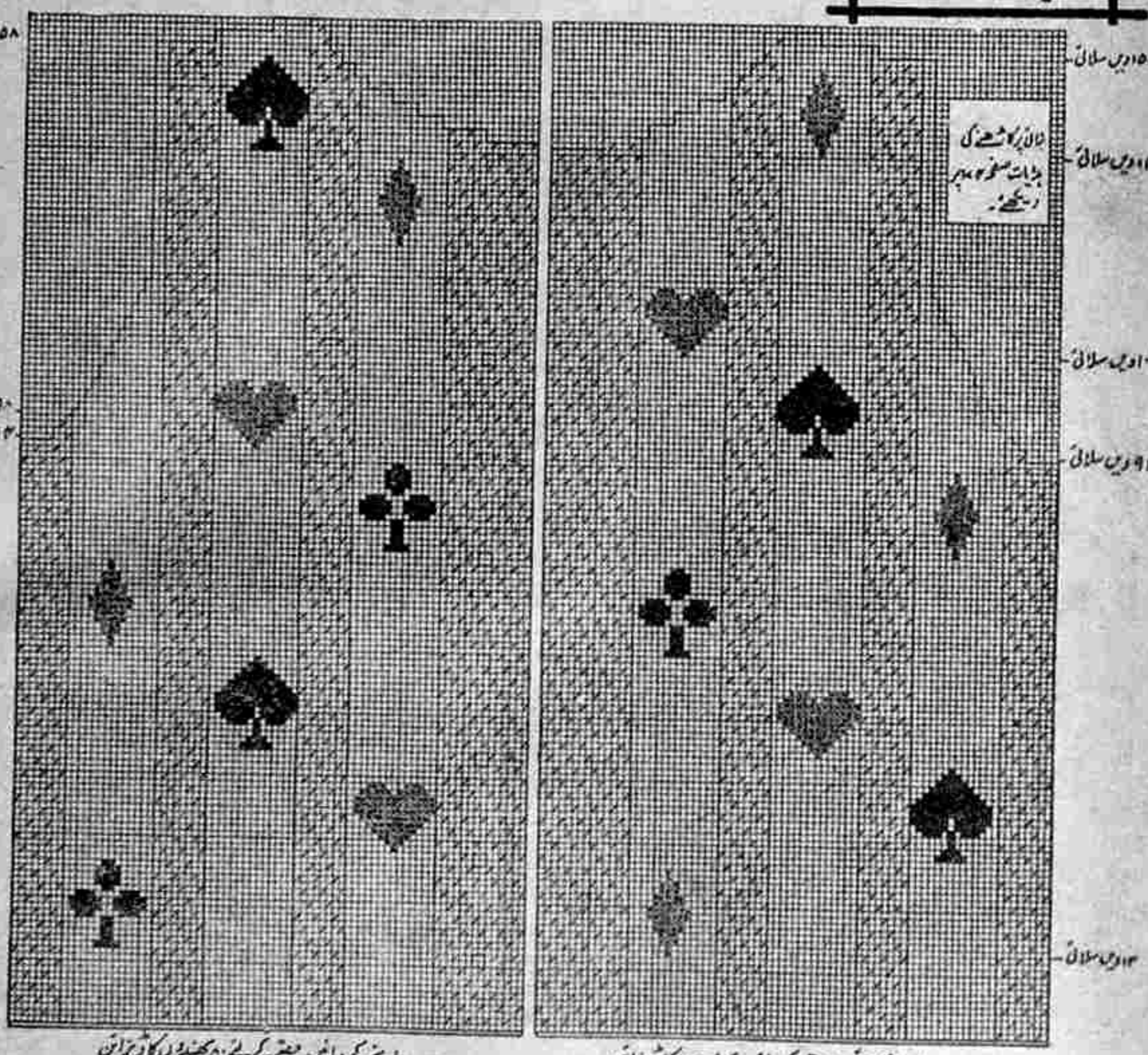

سامنے کے دائیں حصے کے لئے ۸۰ پھندوں کا ڈیزائن

سامنے کے بائیں حصے کے لئے ۸۰ پھندوں کا ڈیزائن

سیاہ

سُرخ

سفید

دیکھئے، تاش کے ڈیزائن کی سامنے سے کھلنے والی اس جیکٹ میں آپ کتنی حسین لگیں گی۔ (تاش کھیلتے وقت اسے نہ پہنئے گا۔ ورنہ لوگ کہیں گے آپ اس کی مدد سے اپنے ساتھی کو اشارہ کر کے جیتی ہیں!) اس کی پشت بالکل سادی رہے گی۔ اگر چاہیں تو سفید یا سرمئی رنگ میں بُن کر، اوپر سے سُرخ اور سیاہ رنگ میں تاش کے ڈیزائن کاڑھ لیں۔ (دیکھئے صفحہ ۱۷۴)

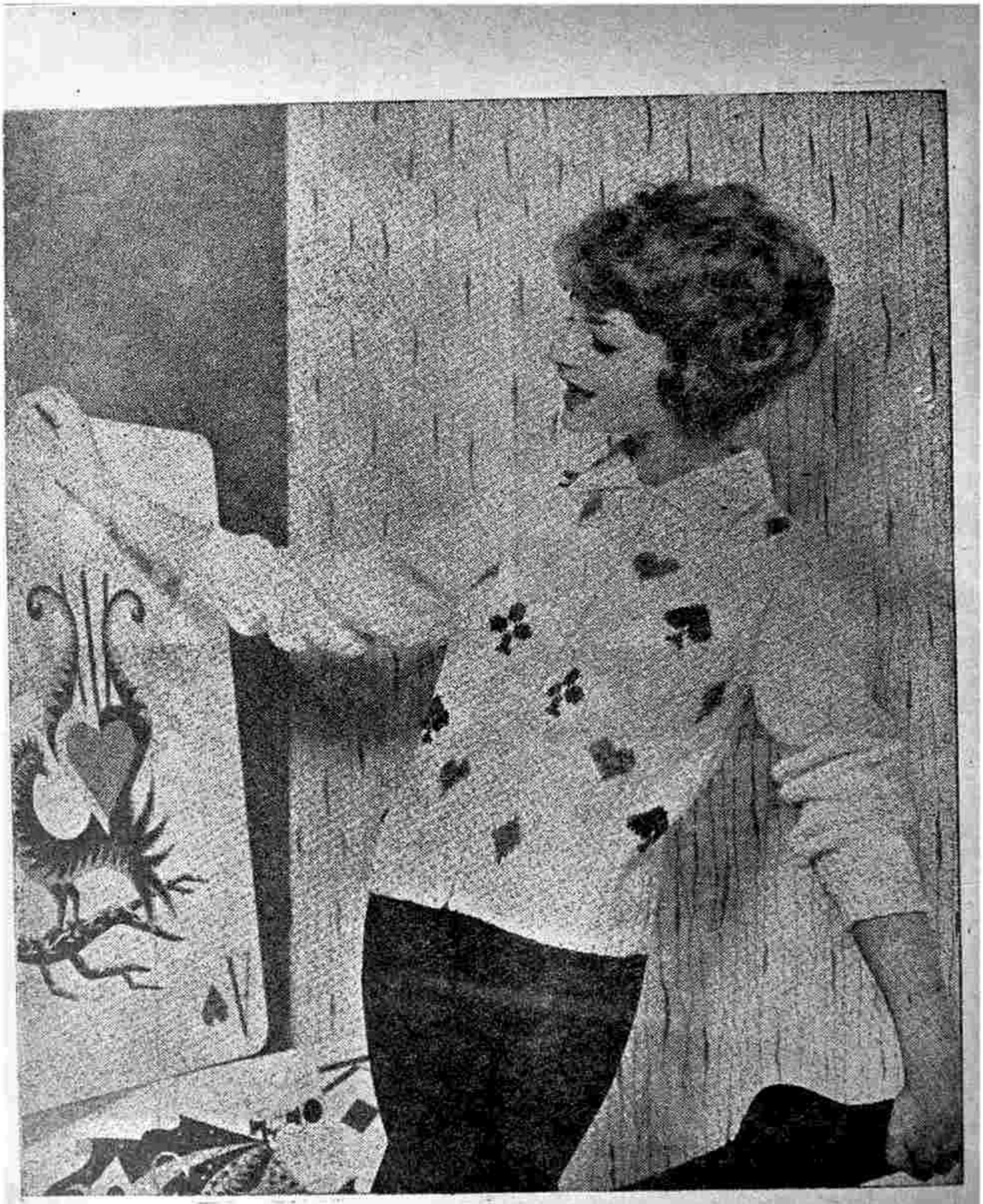

لباس

دو مردانے سوئٹر

اپنے عزیزوں کے لئے بُنئے

اونچے بند گلے والے
اس سادہ سوئٹر میں، علیحدہ سے سفید پٹی بُن کر
وی (V) کی شکل میں
سی دی گئی ہے جس سے تمام
سوئٹر نکھر آیا ہے۔

ایک بیاری رنگ کے ساتھ تین ڈیزائن کے رنگوں میں بُنا ہوا یہ سوئٹر
بہت خوشنما لگتا ہے۔ ڈیزائن کا نقشہ یہ ہے:

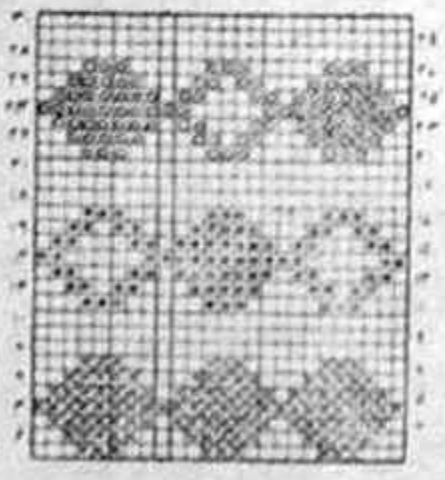

بھورا
نیلا
عنابی

لباس

بچّوں کے دو خوش نما سوئٹر

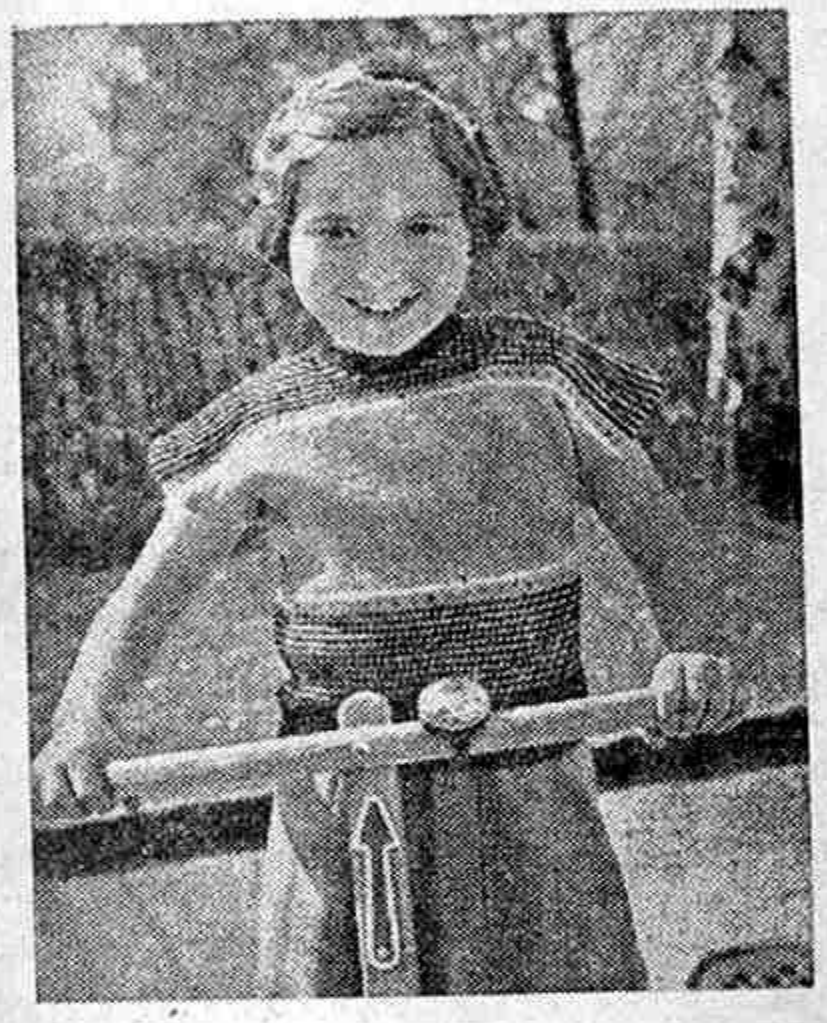

اس سوئٹر کی آستینیں الگ نہیں بُنی گئیں، بلکہ آگے اور پیچھے کے حصّوں کے ساتھ ہی بُنی گئیں ہیں۔ سفید اون بالوں والا ہے

اس جیکٹ پر ہوائی جہاز کی تصویر کاڑھی گئی ہے کڑھائی کی ترکیب کے لئے دیکھئے صفحہ ۱۰۴

لباس

سردیوں کے لئے کچھ گرم کوٹ

آرائش

کروشیا کی بنائی میں گول میز پوش

سفید کے ساتھ ایک گہرے رنگ میں بنائیے

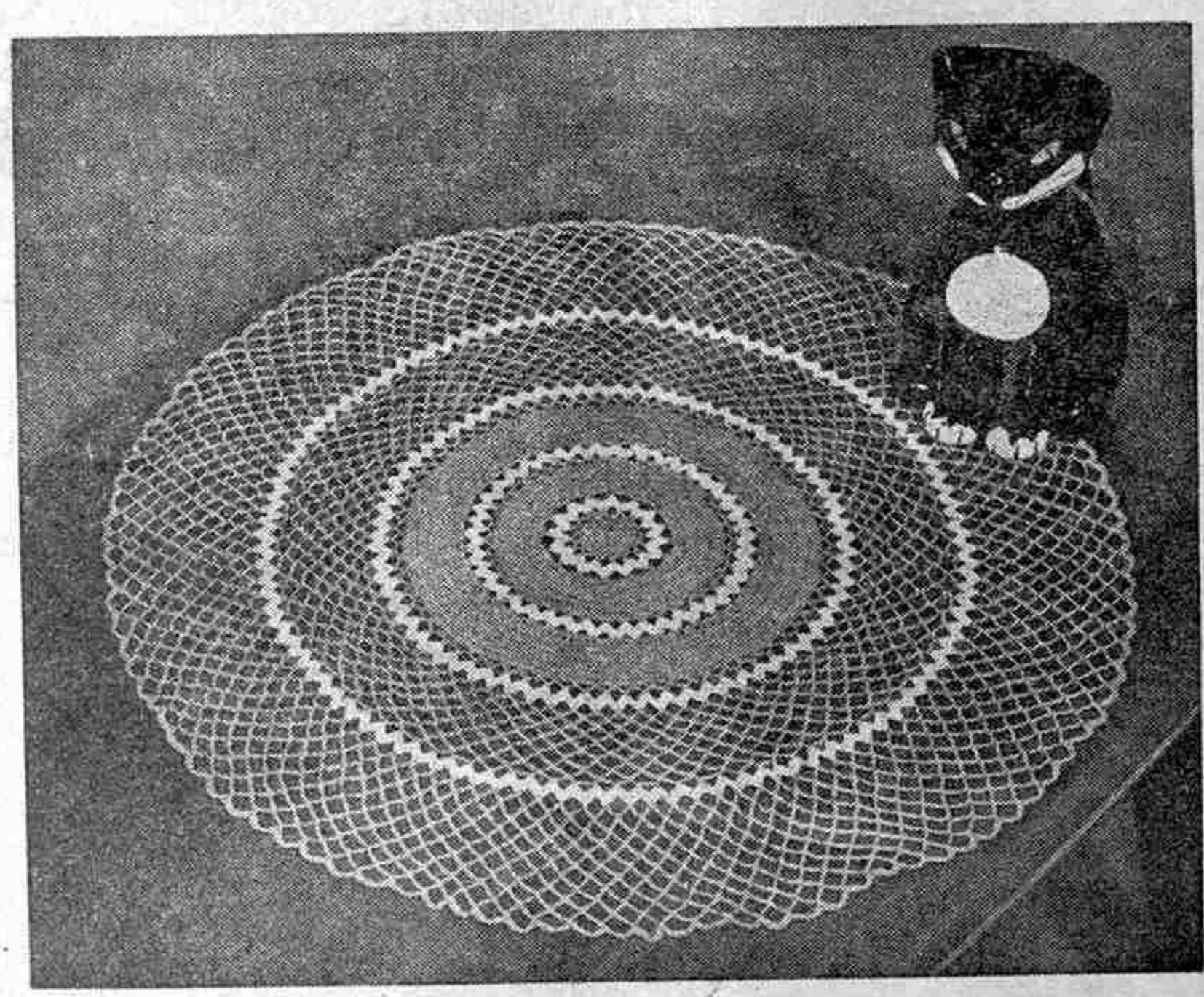

ٹکڑوں یا کترنوں سے بھڑک دار کُشن (گدیلے) بنایئے

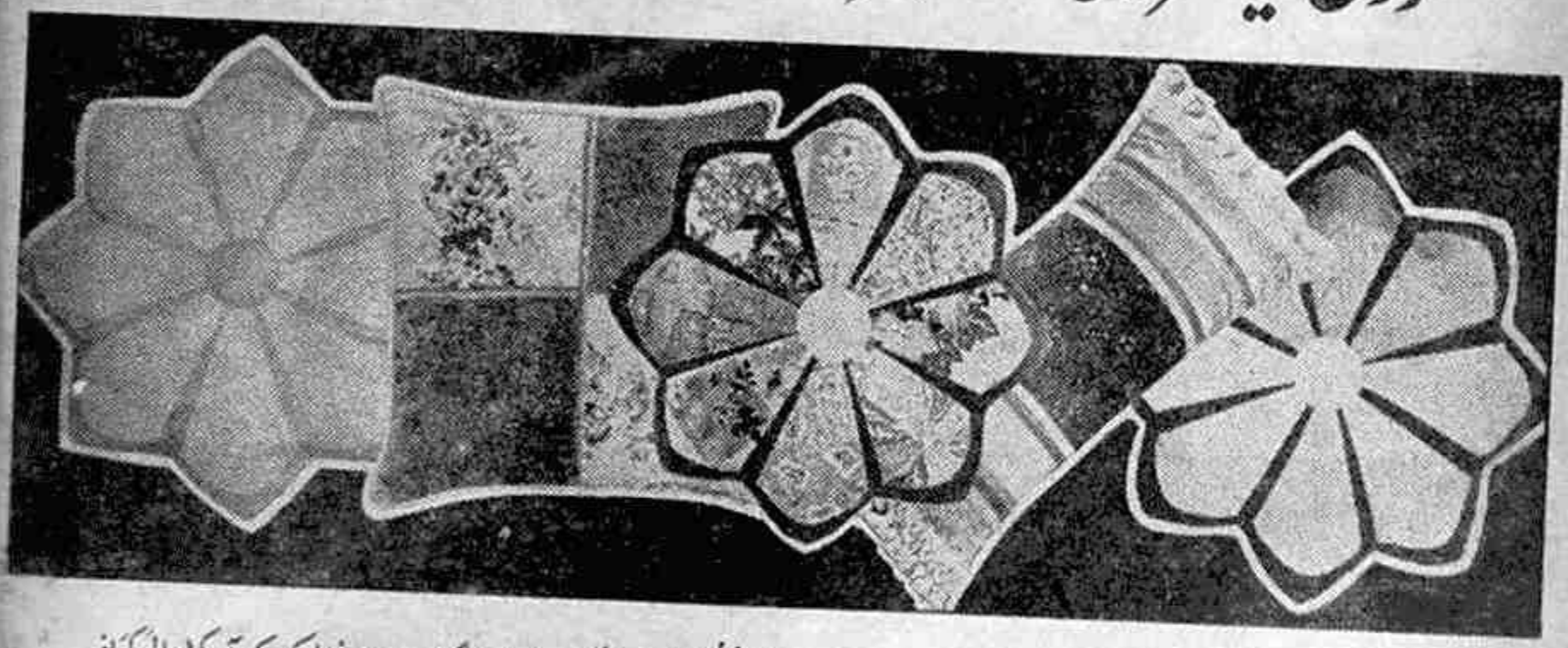

مخمل، چھینٹ، ساٹن، دوسوتی کی کترنوں یا بچے ہوئے ٹکڑوں سے بہت ہی خوشنما، بھڑکیلے کُشن بنائے جا سکتے ہیں۔ پھول دار ٹکڑے ان میں شامل کر کے، آپ کڑھائی کئے بغیر پھول دار گدیلے بنا سکتی ہیں۔ جب آپ کپڑا خریدنے جائیں تو دوکانوں پر سے تھان کے بچے ہوئے ٹکڑے بھی کم قیمت پر خرید سکتی ہیں۔ اپنی پڑوسنوں اور سہیلیوں سے پوچھئے، پلنگ پوش میز پوش یا پردے بناتے وقت ممکن ہے ان کے پاس کترنیں اور ٹکڑے بچے ہوئے ہوں۔ اپنے کچھ ٹکڑے انہیں دے کر آپ ان کے دوسرے رنگوں کے ٹکڑے لے سکتی ہیں۔ اس طرح آپ کے پاس وضع وضع کے بہت سے ٹکڑے جمع ہو جائیں گے۔ کترنوں کے ٹکڑے استعمال کر کے تکیے یا گدیلے بنانا بہت اچھا شوق ہے، اور اس میں وقت بھی بہت کم لگتا ہے۔ ایک دفعہ شروع کر کے آپ یہ شوق بڑھانا ہی چاہیں گی۔

کام شروع کرنے سے پہلے کترنوں پر استری پھیر لیجئے۔ ان کی سلوٹیں نکل جانے کے بعد آپ کو تعجب ہوگا کہ یہ کتنی بڑی ہیں! کپڑا پہلے سے کاٹنے کی بجائے پہلے کاغذ کتر لیجئے، اور اس کے بعد کپڑے کو کاٹئے۔

آٹھ پہلو پھول نما کُشن کا کاغذ پر نمونہ بنانے کے لئے کاغذ کو تین دفعہ موڑ کر ایک طرف سے کنارہ گول کر لیجئے، جیسا کہ نقشے میں دکھایا گیا ہے۔

آٹھ پہلو پھول نما کُشن تین طرزوں سے بنائے جا سکتے ہیں۔
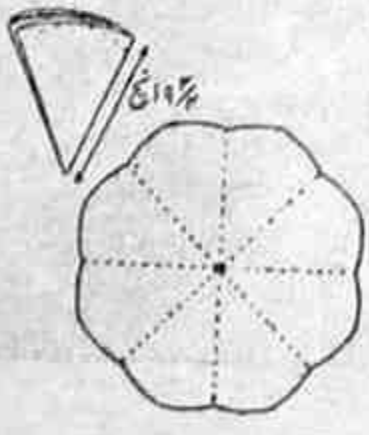
۱۔ کنارے گہرے رنگ کے، "پتیاں" ایک ہی ہلکے رنگ کی۔ ۲۔ کنارے گہرے رنگ کے، پتیاں مختلف سادہ رنگوں کی۔ ۳۔ کنارے گہرے رنگ کے، پتیاں مختلف رنگوں کی چھینٹ یا پھول دار کپڑے کی۔